إرشاد السالكين إلىٰ رياض الصالحين

المعروف بہ

حدیث

کے

اصلاحی مضامین

جلد سیزدہم

افادات

حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم

شیخ الحدیث وصدر مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل

ناشر

مکتبۂ محمودیہ، محمودنگر، ڈابھیل

تفصیلات

کتاب کا نام:........................ حدیث کے اصلاحی مضامین (جلد سیزدہم)

افادات:.................. حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم

بہ اہتمام:.................................خدّام حضرت اقدس دامت برکاتہم

صفحات:...۴۰۸

ناشر:......................... مکتبۂ محمودیہ، محمودنگر، ڈابھیل، گجرات

اِن مضامین کو انٹرنیٹ سے حاصل کرنے اور ہر سنیچر کو براہِ راست حضرتِ اقدس کی مجلس سننے کے لیے حسبِ ذیل ویب سائٹ کا استعمال کریں:

www.muftiahmedkhanpuri.com

ملنے کے پتے

- شعبۂ فیض محمود، سورت، Mo: 99988,31838
- ادارۃ الصدیق ڈابھیل، نزد جامعہ ڈابھیل، Mo:99133,19190
- مکتبہ محمدیہ (مفتی سلیمان شاہوی) ترکیسر Mo:88666,21229
- مکتبۂ انور (مفتی عبدالقیوم راجکوٹی) ڈابھیل Mo:99246,93470
- کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند Mo:97562,02118
- مکتبۃ الاتحاد دیوبند Mo:98972,96985
- مولانا رحمت اللہ صاحب مدظلہ (دارالعلوم رحیمیہ بانڈی پورہ کشمیر)
- مولانا بک ڈپو، رانی تالاب، سورت، Mo: 92287,60716

اجمالی فہرست مضامین...... جلد سیزدہم

تفصیلی فہرست مضامین ...... جلد سیزدہم

باب تحریم الکذب

جھوٹ کی حرمت کا بیان

باب بيان غلظ تحريم شهادة الزور
جھوٹی گواہی کی سخت حرمت کا بیان

باب تحريم لعن إنسان بعينه أودابة
کسی متعین شخص یا جانور پر لعنت بھیجنا حرام ہے

باب تحریم سب المسلم بغیر حقٍ
کسی مسلمان کو ناحق گالی دینا حرام ہے

باب تحریم سبّ الأموات بغیرحق ومصلحةٍشرعية

باب النهی عن الایذاء
کسی کو تکلیف پہنچانے کی ممانعت

النھی عن التجسس والتسمع لکلام من یکرہ استماعہ

لوگوں کے احوال کی ٹوہ میں رہنے کی ممانعت

باب تحريم الغدر
عہد شکنی حرام ہے

باب النهى عن المن بالعطية ونحوها
کسی کو کوئی بخشش یا ہدیہ وغیرہ دے کر اس پر احسان جتلانے کی ممانعت

باب النهی عن الافتخار والبغی
فخر وغرور اور سرکشی کی ممانعت

باب تحریم الهجران بین المسلمین فوق ثلاثة أيام
تین دن سے زیادہ قطع تعلق حرام ہے

النهي عن تناجي اثنين دون الثالث بغير إذنه إلاَّ لحاجةٍ

النهي عن تعذيب العبد والدابة والمرأة والولد بغير سبب شرعي

غلام، جانور، عورت اور اولاد کو بغیر سبب شرعی کے سزا دینے کی ممانعت

بنام خدا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس جلد کے ساتھ ہمارا قرب خاتمۂ کتاب سے کافی بڑھ گیا ہے، بالکل ویسے ہی جیسے ہر دن اگتا سورج ہماری زندگی کا ایک دن کم کرکے ہمیں اپنی قبر سے قریب کرتا ہے:

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی		گردوں نے گھڑی عمر کی ایک اور گھٹادی

حضرت اقدس فقیہ الامتؒ کبھی کبھی بڑے درد سے یہ شعر پڑھتے تھے:

قدم سوئے مرقد، نظر سوئے دنیا		کہاں جارہا ہے؟ کدھر دیکھتا ہے؟

حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کا شعر ہے:

اللهم لولا أنت ما اهتدينا		ولا تصدقنا ولا صلينا
فأنزلن سكينة علينا		وثبت الأقدام إن لاقينا

اگر اللہ رب العزت اپنے آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیج کر ہمیں علم کی روشنی نہ دیتے تو ہم ہدایت پر نہ آسکتے، نہ ہم صدقہ کرتے نہ نماز پڑھتے۔ اے اللہ! ہم پر سکینہ نازل فرما، اور اگر دشمن سے مقابلہ ہوجائے تو ہمارے قدم جما دینا۔

جس شخص کو مذہب اسلام مل جائے اس کو کسی اَور چیز کا افسوس کرنا زیب نہیں دیتا، اس کو تو یکسوئی اور اہتمام سے مذہبی تعلیم کو مکمل طریقے سے حاصل کرنا چاہیے، اور مکمل شرعی و اسلامی زندگی گزار کر اپنے دین و مذہب سے سچی محبت کا ثبوت فراہم کرنا چاہیے۔

آج صورت حال کچھ ایسی کردی گئی ہے کہ مسلمان اگر اپنے مذہب پر سنجیدگی اور مضبوطی سے عمل پیرا ہوتا ہے، تو اسے ચુસ્ત કટ્ટરવાદી طعنہ دیا جاتا ہے، اسے جا و بے جا ذلیل کیا جاتا ہے، اس کے وقار کو مجروح کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے گنوایا نہیں

جاتا؛لیکن کسی اَور مذہب کا ماننے والا اگر مذہب پر عمل کی جانب ذرا سی توجہ کرتا ہے تو اس کی حوصلہ افزائی کی ہر ممکن کوشش انجام دی جاتی ہے۔اس کا اثر یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ بہت سے مسلمان باوجود جی چاہنے کے،سب کچھ معلوم ہونے کے اور مذہبی تعلیمات پر عمل کے بھرپور شوق کے،محض طعن وتشنیع کے ڈر اور ذلت ورسوائی کے اندیشے سے برسرعام اسلامی احکام وتعلیمات کو زندہ کرنے سے گریز کرتے ہیں،ایسے حضرات سے دست بستہ درخواست ہے کہ:''فخر سے کہو،ہم مسلم ہیں''۔اب وقت آگیا ہے کہ بہ بانگِ دہل ایمان واسلام کا اور اس کی تعلیمات کا اعلان کیا جائے۔ہمارے محسن آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شاید اسی صورت حال کی پیش گوئی ان الفاظ میں فرمائی تھی کہ: ایک وقت آئے گا جب نیکی سے روکا جائے گا اور برائی کا حکم دیا جائے گا۔

آج جب پوری دنیا مادیت کی جانب اندھا دھند دوڑ لگا رہی ہے،معیارِ زندگی کو بلند سے بلند تر بنوایا جارہا ہے،جس کے نتیجے میں لوگ ہر جائز وناجائز طریقۂ آمدنی اختیار کرنے لگ گئے ہیں،ایسے میں ایک مسلمان کی اولین ذمہ داری یہ ہے کہ،وہ اپنے مذہب اور اس کی تعلیمات کے تحفظ کا اطمینان کرلے،دنیا کہیں سے کہیں پہنچ جائے؛ لیکن میرے مذہب پر اور میری مسلمانیت پر آنچ نہ آنے پائے،کوئی مجھے ذلیل سمجھے، آرتھوڈکس کا لیبل لگائے،یا کوئی اَور طعنہ دے،میرا تو حال یہ ہو:

لوگ سمجھے مجھے محروم وقار وتمکین	پر وہ نہ سمجھیں کہ میری بزم کے قابل نہ رہا

تاکہ کل کو قیامت میں یہ کہنے کا منھ رہے کہ:

گو مَیں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار	لیکن تمھاری یاد سے غافل نہ رہا

اور

پتے بکھر رہے تھے بڑی تیز تھی ہوا	پھر بھی تمھاری یاد کا جلتا رہا دِیا

آج کے مسلمان کو حضرت عمر فاروقؓ کا یہ زریں ارشاد لوحِ قلب پر کندہ کرلینا چاہیے، جو آپؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ سے اس وقت ارشاد فرمایا تھا جب انھوں نے سولہ پیوند والا لباس اتار کر قیمتی جوڑا زیب تن کر کے فتح بیت المقدس کے لیے آگے بڑھنے کی درخواست کی تھی: إِنَّا كُنَّا أَذَلَّ قَوْمٍ فَأَعَزَّنَا اللّٰهُ بِالْإِسْلَامِ فَمَهْمَا نَطْلُبُ الْعِزَّةَ بِغَيْرِ مَا أَعَزَّنَا اللّٰهُ بِهِ أَذَلَّنَا اللّٰهُ(۱): ہمیں آج اللہ تعالیٰ نے جو عزت بخشی ہے وہ سب اسلام کا صدقہ ہے، قیمتی جوڑوں، ظاہری شان وشوکت اور مال ودولت سے نہیں۔ اور یہ بات خوب اچھی طرح ذہن نشین کرلو، کہ جس دن ہم اسلام سے ہٹ کر عزت کی تلاش میں نکلیں گے، اللہ تعالیٰ ہمیں ذلیل وخوار کر کے رکھ دے گا۔

آپ ہی بتایئے! اسلام کے علاوہ کسی اَور مذہب والے کو غیبت کی ممانعت کا علم ہے؟ غیبت کی شناعت وقباحت کہیں اَور اتنی عمدگی سے سمجھائی گئی ہے؟ جھوٹ، بہتان، گالی، لعنت وملامت، دوسروں کو تکلیف پہنچانے کا مضمون، بغض، کینہ، دشمنی اور قطع تعلقات کی بات اتنی گہرائی اور گیرائی سے کہی گئی ہے؟ غرضیکہ جتنے مضامین اس جلد میں موجود ہیں، حق تو یہ ہے کہ انسانیت کو نقطۂ عروج پر کوئی اَور چیز ان تعلیمات کے علاوہ پہنچا ہی نہیں سکتی۔

حقوق انسانیت (માનવ અધિકાર) کے تحفظ کے خودساختہ علم بردار چاہے

---

(۱) عَنْ طَارِقِ بْنِ شِهَابٍ، قَالَ: خَرَجَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ إِلَى الشَّامِ وَمَعَنَا أَبُو عُبَيْدَةَ بْنُ الْجَرَّاحِ فَأَتَوْا عَلَى مَخَاضَةٍ وَعُمَرُ عَلَى نَاقَةٍ لَهُ فَنَزَلَ عَنْهَا وَخَلَعَ خُفَّيْهِ فَوَضَعَهُمَا عَلَى عَاتِقِهِ، وَأَخَذَ بِزِمَامِ نَاقَتِهِ فَخَاضَ بِهَا الْمَخَاضَةَ، فَقَالَ أَبُو عُبَيْدَةَ: يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْتَ تَفْعَلُ هَذَا، تَخْلَعُ خُفَّيْكَ وَتَضَعُهُمَا عَلَى عَاتِقِكَ، وَتَأْخُذُ بِزِمَامِ نَاقَتِكَ، وَتَخُوضُ بِهَا الْمَخَاضَةَ؟ مَا يَسُرُّنِي أَنَّ أَهْلَ الْبَلَدِ اسْتَشْرَفُوكَ، فَقَالَ عُمَرُ: أَوَّهْ لَمْ يَقُلْ ذَا غَيْرُكَ أَبَا عُبَيْدَةَ جَعَلْتُهُ نَكَالًا لِأُمَّةِ مُحَمَّدٍ ﷺ إِنَّا كُنَّا أَذَلَّ قَوْمٍ فَأَعَزَّنَا اللّٰهُ بِالْإِسْلَامِ فَمَهْمَا نَطْلُبُ الْعِزَّةَ بِغَيْرِ مَا أَعَزَّنَا اللّٰهُ بِهِ أَذَلَّنَا اللّٰهُ.

(المستدرك للحاكم ۱/ ۱۳۰)

کچھ بھی کرلیں؛ لیکن معاشرے کو جنت کانمونہ بنانے والی اور انسانوں کو حقیقی احترام بخشنے والی تعلیمات کے لیےتو ان کو اسلام ہی کی کاسہ لیسی کرنی پڑے گی۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر انسانوں کو ان امور سے منع نہ کیا گیا ہوتا، تو امن وامان کا ماحول قائم کرنا اور سکون کا سانس لین دو بھر ہوجاتا۔فجزی اللہ عنا سیدنا ومولانا محمدا ما ھو أھلہ ﷺ.

نیز اللہ تعالیٰ ہمارے حضرت دام مجدہم کو اپنے شایان شان جزائے خیر دارین میں عطا فرمائے، اور ہمہ جہتی ترقیات وبرکات سے ہم کنار فرمائے، کہ آپ نے حضرت نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی یہ پاکیزہ اور روحانی تعلیمات ہمیں آسان سے آسان تر کرکے سمجھائیں۔اللہ تعالیٰ آپ کے سایۂ عاطفت کو بہ صحت وسلامت وعافیت تادیر ہمارے سروں پر قائم رکھے، اور ہمیں اور کُل امت کو آپ کی حقیقی قدر دانی نصیب فرمائے۔آمین

جلد ہٰذا کے مواد کی فراہمی میں مولانا امتیاز احمد صاحب مالیگانوی زید احترامہٗ کا قابلِ قدر تعاون حاصل رہا، ہم اہل ادارہ ان کے ممنون ومشکور ہیں، اور دعا گو ہیں کہ: اللہ پاک ان کو اس خدمت کا بہترین بدلہ دارین میں نصیب فرمائے، اور ان کی تمام دینی وملی خدمات میں مزید ترقی عطا فرماکر شرف قبولیت سے نوازے۔آمین

ابوزاہر

كِتَابُ الأُمُوْرِ الْمَنهيِ عَنْها

بَابُ تَحْرِيْمِ الْغِيْبَةِ وَالْأَمْرِ بِحِفْظِ اللِّسَان

غیبت کی حرمت اور زبان کی حفاظت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

أَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ، وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا. أما بعد:-

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

﴿وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَحِيْمٌ﴾ (سورۃ الحجرات)

وقال تَعَالَى: وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا. (سورۃ الإسراء)

وقال تَعَالَى: مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ (سورۃ ق)

تمام گناہوں سے بچنا نہایت ضروری ہے

شریعت نے جن چیزوں سے منع فرمایا ہے ان کو گناہ کہتے ہیں اور اپنے آپ کو ان تمام گناہوں سے بچانے کا اہتمام کرنا نہایت ضروری ہے۔ اگر کوئی آدمی نوافل کا

زیادہ اہتمام نہیں کرتا لیکن اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہوں سے بچانے کا اہتمام کرتا ہے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ بہت اہم اور ضروری کام انجام دے رہا ہے، اس لیے کہ کوئی آدمی اگر نفل کام کرلے تو اس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتے ہیں اور اس کو اجر وثواب ملتا ہے، اور اگر کوئی بھی نفل کام نہیں کرتا تو اس پر اس کو کوئی گناہ نہیں ہوتا اور اس کی پکڑ نہیں، اس کے مقابلہ میں کوئی آدمی اگر گناہ کا کام کرلیتا ہے تو اللہ تعالیٰ سخت ناراض ہوتے ہیں اور اس پر عذاب دیا جاتا ہے؛ اس لیے گناہوں سے اپنی حفاظت کرنا بہت ضروری ہے اور بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ہم لوگ نوافل اور نیک کاموں کا جتنا زیادہ اہتمام کرتے ہیں، اتنا اپنے آپ کو گناہوں سے بچانے کا اہتمام نہیں کرتے؛ حالاں کہ یہ اس کے مقابلہ میں زیادہ ضروری ہے۔ چناں چہ علّامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہاں سے مستقل سلسلہ شروع کررہے ہیں جس میں گناہوں کو الگ الگ عنوان قائم کر کے بتلانا چاہتے ہیں، اور اس میں سب سے پہلا عنوان قائم کیا ہے: ''غیبت کا حرام ہونا، اور زبان کی حفاظت کا حکم''۔

کوئی کسی کی غیبت نہ کرے

''غیبت'' ایک ایسا گناہ ہے جو ہمارے معاشرہ اور سوسائٹی میں کثرت سے پایا جاتا ہے، حالاں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ پاک میں اور نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ارشادات میں اس سے بچنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے۔ چناں چہ علامہ نوویؒ نے اس سلسلہ میں آیاتِ قرآنیہ کا ایک نمونہ پیش کیا ہے:

﴿وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضاً أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتاً فَكَرِهْتُمُوهُ، وَاتَّقُوا اللهَ، إِنَّ اللهَ تَوَّابٌ رَحِيمٌ﴾ تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ

کرے، کیا تم میں سے کوئی آدمی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مردار بھائی کا گوشت کھائے؟ اس کو تو تم ناپسند کرتے ہو (کوئی بھی اس بات کو گوارا نہیں کرتا کہ اپنے مردار بھائی کا گوشت کھائے؛ تو پھر غیبت کیوں کرتے ہو؟ یہ بھی تو ایک طرح سے مردار بھائی کا گوشت کھانا ہی ہے) اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اللہ تعالیٰ بندوں کی توبہ کو بہت زیادہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔

غیبت کسے کہتے ہیں؟

سب سے پہلے تو یہ معلوم ہو جانا چاہیے کہ غیبت کس کو کہتے ہیں؟ ترمذی شریف، ابوداود شریف وغیرہ کتابوں میں روایت موجود ہے، نبیٔ کریم ﷺ سے پوچھا گیا: غیبت کس کو کہتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ذِکْرُكَ أَخَاكَ بِمَا یَکْرَہُ'' تمہارا اپنے بھائی کا ایسے انداز سے تذکرہ کرنا جس کو وہ ناپسند کرتا ہو۔ یعنی تم اپنے کسی بھائی کے حالات کا تذکرہ کرو، جو اس کی ذات سے، یا اعمال سے، یا اقوال سے تعلق رکھنے والے ہوں، جن چیزوں کو بھی اس کے ساتھ کوئی تعلق ہے ان کا تذکرہ ایسے انداز سے کرنا جو اس کو ناپسند ہو؛ یہ غیبت میں داخل ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی کی سواری کا بھی تذکرہ کیا، جیسے اس کی موٹر سائیکل یا کسی سواری کی برائی بیان کی کہ بڑی بیکار ہے؛ تو یہ بھی غیبت میں شمار کیا جائے گا اس لیے کہ اس کو یہ بھی پسند نہیں آتا۔ نبیٔ کریم ﷺ سے پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول! میں اپنے بھائی کی جن چیزوں کا تذکرہ کر رہا ہوں وہ اگر اس میں موجود ہوں تب بھی غیبت ہے؟ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تب ہی تو غیبت ہے، اگر وہ چیز اس میں موجود نہیں ہے تو پھر وہ غیبت نہیں بلکہ بہتان ہے۔

یہ انداز بڑا خطرناک ہے

علّامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے غیبت کے بیان میں لکھا ہے کہ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب وہ کسی کی غیبت کرتے ہیں اوران کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ تم غیبت کرر ہے ہو، تو وہ جواب میں بڑی جرأت کے ساتھ کہتے ہیں: مولوی صاحب! میں جو کہہ رہا ہوں وہ بالکل صحیح ہے (اس میں یہ باتیں موجود ہیں) اور میں تو اس کے سامنے بھی کہہ سکتا ہوں، مجھے اس کے سامنے کہنے میں کوئی ڈر اور باک نہیں ہے۔ علّامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا ایسے انداز سے یہ جملہ کہنا بڑا خطرناک ہے کہ مَیں اس کے سامنے بھی کہہ سکتا ہوں اور مَیں جو باتیں بتلا رہا ہوں وہ اس میں موجود ہیں، اس طرح کہہ کر گویا وہ سامنے والے کو یہ تأثر دینا چاہتا ہے کہ میری حرکت بالکل درست ہے، اور میں اس کی جو برائی بیان کرر ہا ہوں وہ بالکل صحیح ہے۔ تو اس طرح کہہ کر کیا وہ اس چیز کو جائز قرار دینا چاہتا ہے جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ پاک میں اور نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احادیث میں حرام بتلایا ہے؟ اسی لئے بعض علماء نے اس جملہ کو کفریات میں شمار کیا ہے، لہٰذا اس سے بچنے کی سخت ضرورت ہے، یہ انداز بڑا خطرناک ہے۔ آدمی کو جب اس کی غلطی پر ٹوکا جائے تو اس کو اپنی غلطی کو تسلیم کر لینا چاہیے، اپنی غلطی کو درست قرار دینے کے لئے دلیل وحجّت کرنا بڑا خطرناک ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اپنے بھائی کا تذکرہ ایسے انداز سے کرنا جو اس کو ناگوار ہو؛ اسی کو غیبت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور وہ برائی اس میں موجود ہے تب ہی تو غیبت ہے۔ اور اگر وہ برائی اس میں موجود نہیں ہے تو اس صورت میں تو بہتان ہوگا، اور اس میں دوہرا (ڈبل) گناہ ہوگا۔ یہ غیبت کی حقیقت ہے اور اس سے بڑی سختی سے منع کیا گیا ہے۔

غیبت کی شناعت وقباحت

اور قرآنِ پاک کی جو آیت اوپر پیش کی ہے جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے غیبت کی شناعت وقباحت اور برائی کو ایک عجیب مثال دے کر بتلایا ہے: ’’کیا تم میں سے کوئی بھی آدمی یہ گوارا کرے گا کہ اپنے مردار بھائی کا گوشت کھائے؟ اس کو تو تم گوارا نہیں کرتے‘‘ گویا غیبت کرنے کو مردار بھائی کے گوشت سے تعبیر کیا ہے۔

ایک تو یہ ہے کہ کسی کے سامنے ہی آپ اس کے عیوب بیان کریں؛ تو یہ بھی گناہ ہے؛ یہ ’’لَمز‘‘ میں داخل ہے جس پر قرآنِ پاک میں وعید آئی ہے: ﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ﴾ کسی کے سامنے اس کے عیوب کو کھولنا ایسا ہی ہے جیسے کسی زندہ آدمی کا گوشت نوچنا۔ اور کسی کی غیر حاضری میں اس کی برائیوں کو بیان کرنا ایسا ہے جیسے اس کی لاش کا گوشت نوچنا۔ اس لیے کہ کسی کے سامنے اس کی برائی بیان کرنے میں تو اس کی طرف سے مدافعت اور (defence) کا قوی امکان ہوتا ہے، اسی لئے عام طور پر کسی کے سامنے اسی کی برائی بیان کرنے کی نوبت کم ہی آتی ہے، اور اگر ایسی نوبت آ بھی جاتی ہے تو اس کا سلسلہ زیادہ دیر تک نہیں چلتا ہے، ایک دو باتیں کہہ کر خاموش ہو جانا پڑے گا، ورنہ معاملہ آگے بڑھ سکتا ہے، سیدھی بات ہے۔ اس کے برخلاف غیبت کا معاملہ چوں کہ اس کی غیر حاضری میں ہوتا ہے، اس لئے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کی طرف سے مدافعت (defence) کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا، اسی لیے معمولی آدمی بھی بڑی سے بڑی شخصیت کی برائیاں بیان کرنا شروع کر دیتا ہے، اس میں بھی جرأت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ سامنے والے کی طرف سے چوں کہ مدافعت نہیں ہوتی ہے اس لئے اس کا سلسلہ بھی طویل ہو جاتا ہے، اسی وجہ سے غیبت کی

مجلس جب چلتی ہے تو گھنٹوں نکل جاتے ہیں، اس لئے خاص طور پر غیبت سے روکا گیا ہے کہ بڑا خطرناک گناہ ہے اور اس کو مردار بھائی کا گوشت کھانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

مجلسِ غیبت میں شرکت بھی غیبت ہے

حضرت میمون بن مہران رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ان کو کوئی آدمی ایک حبشی کی لاش پیش کرکے کہہ رہا ہے کہ اس میں سے کھاؤ۔ انہوں نے کہا: میں اس کو کیوں کھاؤں؟ اس آدمی نے کہا: آپ نے فلاں مسلمان کے حبشی غلام کی غیبت کی ہے، اور غیبت کرنا مردار بھائی کا گوشت کھانے کے برابر ہے، اس لیے آپ کو یہ کھانا چاہیے۔ انہوں نے کہا: میں نے تو اس کی کوئی غیبت نہیں کی، نہ میں نے اس کی کوئی برائی بیان کی؟ میں نے تو اس کا کوئی تذکرہ بھی نہیں کیا؟ تو بتلایا گیا کہ فلاں جگہ اس کی غیبت ہو رہی تھی اور تم اس کو خاموشی کے ساتھ سنتے رہے، اس کی طرف سے کوئی جواب بھی نہیں دیا، اور نہ وہاں سے اپنے آپ کو دور کیا؛ تو یہ اس میں شرکت کے برابر ہی ہے۔ چناں چہ اس کے بعد وہ کبھی بھی ایسی کسی مجلس کو گوارا نہیں کرتے تھے۔ معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کا فریضہ ہے کہ اس کے سامنے جب کسی کی برائی بیان کی جائے تو اس کی طرف سے دفاع کرے۔ اگر وہ اس کے دفاع کی قدرت رکھتا ہے اس کے باوجود دفاع نہیں کرے گا تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی گرفت ہوگی۔

لوگوں کے عیوب کے پیچھے پڑنا بڑا خطرناک

اور لوگوں کے عیوب کے پیچھے پڑنا بھی بڑا خطرناک گناہ ہے۔ حدیثِ پاک میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لوگوں کے عیوب کے درپے نہ رہو، اس لئے کہ کوئی

آدمی مسلمان کے عیوب کے در پے ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کے عیوب کے در پے ہوجاتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ کسی کے عیوب کے در پے ہوجاتے ہیں تو وہ گھر کے اندر بھی کوئی برائی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو رسوا کر کے رہتے ہیں (۱)۔

بہرحال! غیبت بڑی خطرناک چیز ہے، اس سے اپنے آپ کو بچانا ضروری ہے، حدیثِ پاک میں اس کی بڑی قباحت وشناعت آئی ہے، نبیٔ کریم ﷺ نے یہاں تک فرمایا: ''اَلْغِيْبَةُ أَشَدُّ مِنَ الزِّنَا'' غیبت تو زنا سے بھی زیادہ بری ہے۔ صحابہ نے عرض کیا: زنا اور بدکاری سے بھی زیادہ خطرناک اور بری کیسے ہوگی؟ تو نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بدکاری اور زنا سے آدمی جب توبہ کرلیتا ہے تو اس کا گناہ معاف ہوجاتا ہے لیکن جس کی غیبت کی ہے جب تک وہ معاف نہ کرے وہاں تک اس کا گناہ معاف نہیں ہوگا۔ گویا غیبت کی توبہ جس کی غیبت کی گئی ہے اس کے معاف کرنے پر موقوف ہے، کیوں کہ اس میں بندے کا حق ہے۔

غیبت کی معافی کا ایک مسئلہ

اب یہاں ایک مسئلہ آتا ہے کہ کسی نے کسی کی غیبت کی ہو تو اگر اس تک یہ بات پہنچ گئی کہ میرے متعلق فلاں صاحب نے یہ بیان کیا ہے تب تو تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب تک وہ معاف نہیں کرے گا وہاں تک معاف نہیں ہوگا۔ اور

---

(۱) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ صَعِدَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ الْمِنْبَرَ فَنَادَى بِصَوْتٍ رَفِيْعٍ فَقَالَ: يَا مَعْشَرَ مَنْ قَدْ أَسْلَمَ بِلِسَانِهِ وَلَمْ يُفْضِ الإِيْمَانُ إِلَى قَلْبِهِ، لَا تُؤْذُوا الْمُسْلِمِيْنَ وَلَا تُعَيِّرُوْهُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا عَوْرَاتِهِمْ، فَإِنَّهُ مَنْ تَتَبَّعَ عَوْرَةَ أَخِيْهِ الْمُسْلِمِ تَتَبَّعَ اللهُ عَوْرَتَهُ وَمَنْ تَتَبَّعَ اللهُ عَوْرَتَهُ يَفْضَحْهُ وَلَوْ فِيْ جَوْفِ رَحْلِهِ. (سنن الترمذی. باب مَا جَاءَ فِي تَعْظِيْمِ الْمُؤْمِنِ)

اگراس کے علم میں یہ بات نہیں آئی تو صحابہ اور اکابر میں سے بعض حضرات علماء اس طرف گئے ہیں کہ اس صورت میں اس کے معاف کرنے پر موقوف نہیں ہے، اس کے بغیر بھی توبہ قبول ہوجائے گی اور اس کا گناہ معاف ہوجائے گا، لیکن اس کے لئے ایک شرط ہے، اس کو چاہیے کہ جن لوگوں کے سامنے اس نے غیبت کی تھی ان لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو جھٹلائے اور یوں کہے کہ میں نے تمہارے سامنے فلاں آدمی کی جو برائی کی تھی، وہ میں نے بہت غلط حرکت کی تھی اور برا کام کیا تھا۔ گویا اپنے اس فعل کی قباحت اور اپنی اس حرکت کی برائی کو ان کے سامنے ظاہر کرے، تب ہی جس کی غیبت کی تھی اس کے معاف کرنے پر موقوف نہیں ہے اور اس کی توبہ قبول ہوگی۔

کان آنکھ اور دل کے متعلق سوال ہوگا

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۚ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾ جس چیز کا تمہیں علم نہیں ہے اس کے پیچھے مت پڑو اور اس کی ٹوہ میں نہ لگے رہو، بیشک کان، آنکھ اور دل ان میں سے ہر ایک کا آدمی سے سوال کیا جائے گا۔ یعنی کان سے جو چیزیں سنی تھیں ان کا سننا جائز بھی تھا یا نہیں۔ گانے سنتے رہے، غیبت، بہتان اور تہمتیں سنتے رہے، گالیاں سنتے رہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن چیزوں کو سننے سے منع کیا گیا ہے اگر ان کو سنا ہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے متعلق جواب دینا پڑے گا۔

آنکھ کے متعلق بھی سوال ہوگا کہ جو چیزیں آنکھ کے ذریعہ دیکھی تھیں کیا ان کا دیکھنا جائز بھی تھا یا نہیں؟ جن چیزوں کے دیکھنے سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے منع فرمایا ہے اگر وہ دیکھی ہیں اور اس سے توبہ نہیں کی ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت ہوگی۔

دل کے متعلق بھی سوال ہوگا کہ جن چیزوں کے خیالات دل میں پکائے تھے، اور جن چیزوں کا دل میں یقین رکھا تھا؛ کیا ان چیزوں کا یقین رکھنا اور ان خیالات کا پکانا شرعی اعتبار سے جائز اور درست تھا یا نہیں؟

سماج میں پائی جانے والی ایک برائی

آج کل بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ آدمی کسی کے متعلق بغیر دیکھے اور بغیر تحقیق کے صرف سنی سنائی پر ہی فیصلہ کر لیتا ہے، اور چوں کہ ہمارے سماج میں یہ برائی بہت کثرت سے چل رہی ہے اس لئے اس کو بیان کر رہا ہوں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب ''القول الجمیل'' میں چور کے معلوم کرنے کا ایک عمل لکھا ہے اور ہمارے اکابر کے یہاں سے بھی عام طور پر عملیات اور تعویذات کے سلسلہ میں جو چیزیں دی جاتی ہیں وہ سب حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی اسی کتاب ''القول الجمیل'' سے لی گئی ہیں، تمام اکابر اسی کتاب کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں چور کی شناخت کا ایک عمل لکھا ہے، اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس عمل کو لکھنے کے بعد خاص طور پر اسی آیت کو ذکر کر کے تاکید فرمائی ہے کہ اس عمل کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ جس کے متعلق معلوم ہو اسی کو چور سمجھا جائے، بلکہ اس عمل کے بعد اندرونی طور پر تحقیق کرو گے تو پتہ چل جائے گا کہ حقیقت میں چور کون ہے، جو چور ہوگا اس کا واقعۃً پتہ چل ہی جائے گا، اور جب شرعی دلائل سے ثابت ہو جائے تب ہی اس پر چوری کا الزام لگایا جا سکتا ہے، باقی صرف عملیات کی بنیاد پر کسی کے متعلق فیصلہ کر لینا درست نہیں کہ بس یہی چور ہے۔ اور دیکھو! جب ہم کسی کو اپنی آنکھوں سے چوری کرتے ہوئے دیکھیں تب ہی تو کہہ سکتے کہ یہ چور ہے، اب ہم نے اپنی آنکھوں

سے تو دیکھا نہیں، اور اس نے ہمارے سامنے اپنے چور ہونے کا اقرار بھی نہیں کیا، پھر کسی کے صرف کہہ دینے پر اس کے متعلق دل میں یہ سمجھ لینا کہ یہی چور ہے؛ یہ تو ایک ایسی چیز ہوئی کہ جس کی شریعت نے اجازت نہیں دی ہے، اس لیے اس پر اللہ تعالیٰ کے یہاں گرفت ہوگی۔

یہ حرام ہے

آج کل ہمارے معاشرہ اور سماج میں بہت سے جھگڑے ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے: کسی کو ذرا سی بیماری ہوگئی، بخار ہوا اور جانے کا نام نہیں لیتا، یا درد ِسر ہوا اور اچھا نہیں ہو رہا ہے، اور کوئی پریشانی میں ہے؛ تو بس کسی عملیات والے کے پاس پہنچ جاتے ہیں، اور اگر اس نے کہہ دیا کہ آپ پر سحر ہے اور تمہارے گھر میں سے ہی کسی نے کیا ہے؛ تو عام طور پر خاندان میں بھائی بھائی کے، بھائی بہن کے، یا کسی چچا زاد، ماموں زاد بھائیوں کے آپس کے چھوٹے موٹے جھگڑے اور کچھ نہ کچھ ناچاقیاں ہوتی ہی ہیں؛ تو فوراً گمان انہیں کی طرف جاتا ہے، اور انہیں پر الزام عائد کر دیا جاتا ہے، اور پھر اسی بنیاد پر بڑے جھگڑے اور لڑائیاں شروع ہو جاتی ہیں، حالاں کہ شریعت کسی بھی حالت میں اس کی اجازت نہیں دیتی۔ نہ تو کسی عامل کا اس طرح کہنا درست ہے، اور نہ کسی کے صرف کہنے کی بنیاد پر اس بات کو مان لینا جائز ہے، یہ سب حرام ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جادو کرنے والے کا نام نہیں بتلایا

دیکھو! بخاری شریف کی روایت ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جادو کیا گیا تھا، لبید بن اعصم ایک منافق تھا جس کی یہودیوں کے ساتھ سازباز تھی، اسی نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

پر سحر کروایا تھا، اور اس سحر اور جادو کا اثر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پر یہ ہوا کہ آپ ازواجِ مطہرات میں سے کسی کے پاس صحبت کے لئے نہیں گئے ہوتے تھے تب بھی آپ کو یہ خیال ہوتا تھا کہ میں نے صحبت کی ہے۔ سحر کا یہ اثر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایک مدّت تک رہا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت بخاری شریف میں موجود ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے یہاں تشریف لائے اور دعا میں مشغول ہو گئے، پھر دعا کی، پھر دعا کی، بار بار دعا کرتے رہے۔ اس کے بعد فرمایا: میں نے اللہ تعالیٰ سے اپنی بیماری کے متعلق پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے خواب میں دو فرشتے حضرت جبرئیل اور حضرت میکائیل کو میرے پاس بھیجا، ایک میرے سرہانے کھڑا ہوا اور دوسرا پاؤں کی جانب کھڑا ہوا، ایک نے دوسرے سے پوچھا: ان کو کیا ہوا ہے؟ دوسرے نے جواب دیا: ان کو جادو کیا گیا ہے۔ پوچھا: کس نے جادو کیا ہے؟ اس نے کہا: لبید بن اعصم نے کیا ہے۔ پوچھا: کون سی چیز میں جادو کیا ہے؟ اس نے کہا: کھجور کے شگوفہ میں رکھا ہے۔ پوچھا: کہاں رکھا ہے؟ اس نے کہا: فلاں کنویں میں پتھر کے نیچے رکھا ہے۔ یہ تمام چیزیں آپ کو بتلادی گئیں۔ چناں چہ جب آپ اٹھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ساتھ حضرت علی، حضرت عمار بن یاسر اور چند مخصوص صحابہ کو لیا، اور اس کنویں پر تشریف لے گئے، وہاں سے وہ سب نکلوایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا موم کا ایک پتلا بنایا گیا تھا، اس میں گیارہ سوئیاں چبھوئی گئی تھیں، اسی موقعہ پر معوذتین (قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس) نازل ہوئیں، جب اس کی ایک آیت پڑھتے تھے تو اس میں سے ایک سوئی نکلتی تھی اور آپ اپنے جسم میں اس کی تکلیف محسوس کرتے تھے، جیسے سوئی کھینچی جاتی ہے۔ بہر حال! اس جادو کا اثر زائل ہو گیا۔ روایتوں میں ہے کہ بعد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ لوگوں کیوں کو بتلاتے نہیں کہ یہ کس نے کیا ہے؟ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے صحت دیدی، اب میں کسی مسلمان یا کافر کے خلاف فتنہ بھڑکانا نہیں چاہتا۔ اس لئے کہ آپ کو معلوم تھا کہ اگر میں اس کا نام ظاہر کردوں گا تو صحابۂ کرامؓ اس کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اگر کسی کو پتہ چل جائے کہ فلاں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایسا کیا ہے تو کیا وہ بچ سکتا ہے؟۔

بلا دلیل الزامات!

دیکھو! نبی کا خواب وحی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو وحی کے ذریعہ بتلا دیا تھا کہ فلاں آدمی نے آپ پر جادو کیا ہے، اس کے باوجود جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہہ رہی ہیں پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اتنا اہتمام فرمارہے ہیں کہ کسی جملے کے نتیجے میں معاشرہ اور سماج میں کوئی فتنہ پیدا نہ ہو۔ اور آج کل جب اس طرح کے واقعات پیش آتے ہیں تو بلا دلیل کے کسی پر بھی الزامات عائد کردیئے جاتے ہیں اور خاندانوں میں آپس میں جھگڑے کروا دیئے جاتے ہیں؛ شریعت ایسی باتوں کی بالکل اجازت نہیں دیتی۔ اگر کوئی آدمی کسی عامل کے پاس جائے تو میری اتنی درخواست ہے کہ پہلے ہی اس سے کہہ دے کہ بھائی دیکھو! تم سے اگر اس کا علاج ہوسکتا ہو تو کرنا، باقی تم کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ کس نے کیا ہے۔ اور اگر وہ کہے تو اس سے کہو کہ ہمیں بتلانا مقصود نہیں ہے۔ دراصل مصیبت یہ ہوتی ہے کہ جب کوئی عامل اپنے عمل کے معاملہ میں کوتاہ ثابت ہوتا ہے تو پھر وہ ایسی ویسی باتیں کردیتا ہے۔ یا مثلاً علاج کروانے والا اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے کہ اتنے دنوں سے علاج کررہے ہو اور ہمارے اتنے سارے پیسے خرچ ہوگئے، لیکن کیا بات ہے کہ ابھی تک کوئی فائدہ نہیں ہورہا ہے؟ تو پھر عامل کہتا ہے

کہ اصل میں کوئی چیز دفن کی گئی ہے، جب تک وہ نکلے گی نہیں وہاں تک ٹھیک نہیں ہو گے۔ تو میں یوں کہتا ہوں کہ ایک سال سے علاج کر رہا تھا اور کچھ دفن کیا ہوا ہے وہ آج ایک سال کے بعد اس کو معلوم ہوا؟ دراصل یہ سب ایسی ہی بے کار باتیں ہوتی ہیں۔ کہنے کا حاصل یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایسی ہی بدگمانیوں پر خاص طور پر تاکید فرمائی ہے کہ کان، آنکھ اور دل کے متعلق اللہ تعالیٰ کے یہاں سوال ہوگا۔

بڑا چوکس نگران

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ جب بھی کوئی آدمی کوئی بات کرتا ہے تو اس کے پاس ایک بڑا چوکس نگران مقرر رہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آدمی پر دو فرشتے مقرر کئے گئے ہیں، آدمی جب بھی کوئی بات زبان سے نکالتا ہے، چاہے وہ بات اس کے حق میں نفع بخش ہو، یا نقصان دہ ہو؛ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو فرشتے مقرر ہیں، وہ اس کی اس بات کو ریکارڈ کر لیتے ہیں، اور باقاعدہ درج کر لیتے ہیں؛ پھر قیامت میں نامۂ اعمال کھولے جائیں گے تو وہ ساری باتیں اس میں موجود ہوں گی۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے نامۂ اعمال پھیلا دئے ہیں اور فرشتہ مقرر کر دیا ہے جو تمہاری ہر چیز کو نوٹ کر رہا ہے، اب چاہے تم بھلی بات کہو، یا بری، زیادہ کہو، یا کم؛ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے لکھا جا رہا ہے، جب آدمی کی موت ہو جائے گی تو نامۂ اعمال لپیٹ کر اس کی گردن میں ڈال دیا جائے گا جو اس کے ساتھ قبر میں بھی رہے گا اور جب میدانِ حشر میں اُٹھایا جائے گا تو وہی نامۂ اعمال اس کے ساتھ ہوگا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ لو! اپنا نامۂ اعمال پڑھ لو۔ اس لیے ہر آدمی

کو یہ سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے ساتھ نگران فرشتہ مقرر ہے اگر کسی کو معلوم ہو جائے کہ حکومت کی طرف سے آدمی مقرر ہے اور میری ہر بات ریکارڈ کی جا رہی ہے؛ تو وہ آدمی حکومت کے خلاف کوئی بھی کام کرنے سے اپنے آپ کو کیسا بچاتا ہے؟ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتہ مقرر ہے اور وہاں جواب دینا ہے تو پھر اپنے آپ کو بڑا محتاط رکھنے کی ضرورت ہے۔

سلامتی کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا

اعْلَمْ أَنَّهُ يَنْبَغِي لِكُلِّ مُكَلَّفٍ أَنْ يَحْفَظَ لِسَانَهُ عَنْ جَمِيعِ الْكَلَامِ إِلَّا كَلَامًا ظَهَرَتْ فِيهِ الْمَصْلَحَةُ، وَمَتَى اسْتَوَى الْكَلَامُ وَتَرْكُهُ فِي الْمَصْلَحَةِ، فَالسُّنَّةُ الْإِمْسَاكُ عَنْهُ، لِأَنَّهُ قَدْ يَنْجَرُّ الْكَلَامُ الْمُبَاحُ إِلَى حَرَامٍ أَوْ مَكْرُوهٍ، وَذٰلِكَ كَثِيرٌ فِي الْعَادَةِ، وَالسَّلَامَةُ لَا يَعْدِلُهَا شَيْءٌ

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہر آدمی کے لئے ضروری ہے کہ اپنی زبان کو ہر طرح کی باتوں سے بچائے، سوائے اس بات کہ جس کا فائدہ بخش ہونا ظاہر ہو۔ اور کسی کلام کے متعلق اگر یہ خیال ہو کہ اس کے بولنے میں بھی فائدہ ہے اور چھوڑنے میں بھی فائدہ ہے، یعنی دونوں پہلو برابر ہیں؛ تو اس صورت میں سنّت یہی ہے کہ آدمی اس سے بھی بچے، اس لئے کہ کوئی آدمی اگر جائز بات شروع کرے گا تو وہ حرام اور ناجائز تک پہنچا دے گی، اور حرام اور ناجائز کلام کو چھوڑنے کے لئے جائز کلام بھی چھوڑنا پڑے گا، اور عام طور ایسا ہی ہوتا ہے، اس لیے سلامتی کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: آدمی اپنی زبان سے جو بھی کلام کرتا ہے وہ چار

طرح کا ہوتا ہے: (۱) یا تو وہ پورا ہی مفید ہوتا ہے (۲) یا پورا ہی مضر ہوتا ہے (۳) یا کچھ مفید ہوتا ہے اور کچھ مضر ہوتا ہے (۴) نہ مفید ہوتا ہے، نہ مضر۔

پھر فیصلہ فرماتے ہیں کہ: (۱) جو مضر ہو اس سے تو اپنے آپ کو بچانا ہی ہے۔ (۲) جس میں فائدہ بھی ہے اور نقصان بھی ہے؛ تو عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ فائدہ حاصل کرنے کے مقابلہ میں نقصان سے اپنے آپ کو بچانا زیادہ اہمیت رکھتا ہے، اس لئے اس سے بھی اپنے آپ کو بچانا ضروری ہے۔ (۳) اور جس میں نہ فائدہ ہے، نہ نقصان ہے؛ اس میں اپنا وقت کیوں لگایا جائے؟ گویا اس سے بھی بچنا ضروری ہے۔ (۴) اب ایک ہی طرح کا کلام رہ گیا کہ جس میں فائدہ ہی فائدہ ہے، وہی کلام اپنی زبان سے نکالنا چاہیے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ آدمی اپنی زبان سے جو چار قسم کے کلام نکالتا ہے ان میں سے تین سے تو اپنے آپ کو بچانا ہے۔ گویا ۷۵ / فیصد کلام تو ختم ہی ہو گیا، اور ۲۵ / فیصد رہ گیا ایک چوتھائی حصہ رہ گیا، باقی تین چوتھائی تو ختم ہو گئے، ان سے اپنے آپ کو بچانا ضروری ہے۔

بھلی بات کہے یا خاموش رہے

۱۵۱۱: -عن أَبي هـريرة- رضي الله عنـه-عن النَّبيِّ ﷺ قَالَ: مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْراً أَوْ لِيَصْمُتْ (متفق عَلَيْهِ)

وهذا صريحٌ في أنَّهُ يَنْبَغِي أنْ لَا يَتَكَلَّمَ إلاَّ إذَا كَانَ الْكَلَامُ خَيْراً، وَهُوَ الَّذِي ظَهَرَتْ مَصْلَحَتُهُ، ومَتَى شَكَّ في ظُهُورِ المَصْلَحَةِ، فَلاَ يَتَكَلَّم.

ترجمہ: - حضرت ابو ہریرہؓ نبیٔ کریم ﷺ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں: جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو؛ وہ بھلی بات کہے، یا خاموش رہے۔

افادات: - دیکھو! اس روایت میں نبیٔ کریم ﷺ نے دو ہی چیزیں بتلائی

ہیں، پہلی یہ کہ اگر بھلی بات کہہ سکتے ہو تو کہو۔ اور دوسری یہ کہ چاہے وہ کلام جائز ہو لیکن اس میں فائدہ نہیں ہے تو پھر خاموش رہو۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صاف صاف بتلاتی ہے کہ کوئی بات بھلی ہو اور نیکی کی ہو؛ تب ہی آدمی اپنی زبان سے بولے، ورنہ خاموشی اختیار کرے۔ بے فائدہ جائز بات بھی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اور بھلی بات سے وہی کلام مراد ہے جس کا دنیا یا آخرت کے اعتبار سے اس کا مفید ہونا دلیل سے ثابت ہو، اور جس بات کے متعلق آپ کو شک ہو کہ پتہ نہیں کہ اس میں کوئی فائدہ ہے یا نہیں؛ تو اس صورت میں خاموش رہنا ضروری ہے۔

ہیرے جواہرات اور ڈھیلے پتھر

اس بات کو میں ایک مثال سے یوں سمجھاتا ہوں کہ ایک آدمی کے سامنے میدان میں ہیرے جواہرات اور موتی پڑے ہوئے ہوں، اور دوسری طرف ڈھیلے اور پتھر پڑے ہوئے ہوں؛ اور کوئی آدمی ان جواہرات کو چھوڑ کر ڈھیلے پتھر اپنے دامن میں جمع کر لے؛ تو اس کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟ اگر چہ یہ ڈھیلے اور پتھر اس کے لئے مضر اور نقصان دہ نہیں ہیں، لیکن اس سے فائدہ بھی کیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اتنا ہی وقت اگر وہ جواہرات کو چن کر اپنے دامن میں جمع کرنے میں لگاتا تو کتنا اچھا تھا۔ جائز کلام کا حال ایسا ہی ہے جیسا کہ پتھر اور ڈھیلے، اور اللہ کے ذکر میں مشغول ہونے کا حال ایسا ہی ہے جیسے کہ جواہرات و موتی؛ اب آدمی جتنا وقت جائز کلام اور باتوں میں لگاتا ہے، اگر اتنا ہی وقت وہ اللہ کے ذکر میں لگائے تو زیادہ اچھا ہے۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ ذکر اللہ میں اپنے آپ کو مشغول رکھنے کا اہتمام کرے، اور اگر کوئی کلام کرے تو بھلی بات کہے؛ ورنہ خاموش رہے۔

کون سا مسلمان افضل ہے؟

۱۵۱۲:-وعن أَبِي موسیٰ رضی اللہ عنہ قَالَ: قُلْتُ: يَا رسولَ اللهِ! أَيُّ الْمُسْلِمِينَ أَفْضَلُ؟ قَالَ: ((مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ.)) (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کون سا مسلمان افضل اور بہترین ہے؟ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وہ جس کی زبان اور ہاتھ کی ایذا رسانیوں سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔

افادات:- اس نوع کے سوال پر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف جوابات ارشاد فرمائے ہیں جس کی وجہ پہلے آچکی ہے (جلد:۶/ص:۴۸) یہاں بھی اسی نوع کا سوال کیا گیا کہ مسلمانوں میں کون سا مسلمان سب سے بہتر ہے؟ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا: وہ جس کی زبان اور ہاتھ کی ایذا رسانیوں سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں، یعنی اس کی زبان سے بھی کسی کو تکلیف نہ پہنچے اور اس کے ہاتھ سے بھی کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ دیکھئے! نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہترین مسلمان ہونے کے لئے یہ وصف ارشاد فرما رہے ہیں۔

ایک اور روایت میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: ''وَاللهِ لَا يُؤْمِنُ، وَاللهِ لَا يُؤْمِنُ، وَاللهِ لَا يُؤْمِنُ'' اللہ کی قسم! وہ آدمی مؤمن نہیں، اللہ کی قسم! وہ آدمی مؤمن نہیں اللہ کی قسم! وہ آدمی مؤمن نہیں۔ جب تین مرتبہ قسم کھا کر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی، تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سہم گئے اور پوچھا: اے اللہ کے رسول! کون؟ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مَنْ لَّا يَأْمَنُ جَارُهُ بَوَائِقَهُ'' جس کا پڑوسی اس کی ایذا رسانیوں سے مامون و محفوظ نہ ہو (بخاری شریف) نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلام کی بلاغت دیکھئے!

آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ جو اپنے پڑوسیوں کو تکلیف نہ پہنچاتا ہو، بلکہ یہ فرمایا کہ جس کا پڑوسی اس کی ایذا رسانیوں سے مامون و مطمئن نہ ہو۔

مطلب یہ ہے کہ بعضوں کی طبیعت ذرا خطرناک قسم کی ہوتی ہے، اور ان سے اپنے پڑوسی کو ابھی تک کوئی تکلیف تو نہیں پہنچی، لیکن ان کے مزاج اور طبیعت کو دیکھ کر پڑوسی یوں محسوس کرتے ہیں کہ اگرچہ آج تک اس نے کوئی تکلیف تو نہیں پہنچائی لیکن معلوم نہیں یہ کب کیا کر ڈالے۔ ایسے آدمی کے متعلق حضورِ اکرم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ جب یہ کیفیت بھی پائی جائے تو وہ مؤمن نہیں۔ دیکھو! ایسے آدمی کے ایمان کی حضورِ اکرم ﷺ نفی فرما رہے ہیں کہ وہ مؤمن ہی نہیں۔ اور اس روایت میں نبیٔ کریم ﷺ نے مسلمانوں میں بہترین مسلمان اس آدمی کو قرار دیا جس کی زبان اور ہاتھ کی ایذاء رسانیوں سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں، بلکہ ایک روایت یوں بھی ہے: ''أَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ'' حقیقی مسلمان کہلانے کا حقدار وہی ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی تکلیفوں اور ایذا رسانیوں سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں، ویسے تو آپ کسی مفتی سے سوال کریں گے کہ ایک آدمی اپنی زبان اور ہاتھ سے لوگوں کو تکلیف پہنچاتا ہے، اور کلمہ بھی پڑھتا ہے؛ تو کیا وہ مسلمان ہے؟ تو کوئی بھی مفتی اس کے کافر ہونے کا فتویٰ نہیں دے گا، لیکن حضور اکرم ﷺ یہ فرماتے ہیں کہ ایسا آدمی حقیقی معنیٰ میں مسلمان کہلانے کا حقدار نہیں ہے۔

اپنے ایمان واسلام کی سند کے واسطے یہ کافی نہیں

آج ہمارے معاشرہ میں عام طور پر اس کا کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا۔ ایک آدمی نماز پابندی سے پڑھتا ہے، وظائف کا پابند ہے، تلاوت وغیرہ بھی کرتا ہے، لیکن

اس کی زبان اور اس کے ہاتھ کی ایذاء رسانیوں سے لوگ محفوظ نہیں، ہر ایک آدمی اس سے خطرہ محسوس کرتا ہے، اور وہ آدمی اپنے ایمان اور اسلام پر مطمئن ہے، لیکن حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قسم کھا کر ارشاد فرماتے ہیں کہ جس کا پڑوسی اس کی ایذارسانیوں سے مطمئن اور مامون نہ ہو، وہ مؤمن نہیں ہے۔

بہر حال! یہ جو کیفیت ہمارے معاشرہ میں پائی جاتی ہے کہ لوگ اپنے ایمان و اسلام کی سند کے واسطے دینی اعمال کی پابندی کو کافی سمجھ لیتے ہیں؛ اتنا ہی کافی نہیں ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو قدرتی طور پر ایسا بنایا ہے کہ وہ اکیلا زندگی نہیں گزار سکتا، بلکہ کچھ لوگوں کے ساتھ مل کر ہی رہنا پڑتا ہے، جیسے: ماں باپ، اہل وعیال، بھائی بہن، رشتے دار، پڑوسی، یا جن سے لین دین کے معاملات پڑتے ہیں۔ تو جن جن لوگوں سے اس کا واسطہ پڑتا ہو، ان میں کسی کو بھی اس کی ذات سے، اس کی زبان یا ہاتھ سے تکلیف نہ پہنچے؛ تب ہی وہ اس لائق ہے کہ اس کو حقیقی مسلمان کہا جا سکے۔

زبان سے تکلیف پہنچانا ہاتھ کے مقابلہ میں زیادہ آسان

اور اس روایت میں ہاتھ اور زبان دونوں کا تذکرہ کیا ہے، لیکن پہلے زبان کا نام اس لئے لیا کہ زبان سے تکلیف پہنچانا ہاتھ کے مقابلہ میں زیادہ آسان ہے، اس لیے کہ ہاتھ کے لئے تو کچھ قوت کی بھی ضرورت ہوتی ہے، اور جیسا کہ پچھلی مجلس میں بتلایا تھا، ہاتھ کے لئے تو سامنے موجود ہونا بھی ضروری ہے، جبکہ زبان تو غائبانہ بھی تکلیف پہنچاتی ہے، جیسے: کسی کی غیبت وغیرہ میں مشغول ہوتی ہے۔ اور غیبت کا سلسلہ جب شروع ہوتا ہے تو ایسا طول پکڑتا ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ ایک معمولی آدمی بھی کسی بڑے آدمی پر جس طرح چاہے کیچڑ اُچھال سکتا ہے۔ اور زبان حاضرین اور

غائبین کسی کو بھی نہیں بخشتی؛ اس لئے اس کا تذکرہ پہلے کیا۔

جنّت کی گارنٹی

۱۵۱۳:-وعن سهل بن سعد، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((مَنْ يَضْمَنْ لِي مَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ أَضْمَنْ لَهُ الْجَنَّةَ)) (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو مجھے ضمانت اور گارنٹی دیدے اپنے اس عضو کی جو دونوں جبڑوں کے درمیان ہے (یعنی زبان کہ اس سے کوئی گناہ نہیں کرے گا) اور اپنے اس عضو کی جو دونوں ٹانگوں کے درمیان ہے (یعنی شرمگاہ کہ اس سے بھی کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کرے گا) تو میں اس کو جنّت کی گارنٹی دیتا ہوں۔

افادات:- دیکھو! یہ دونوں اعضاء یعنی زبان اور شرمگاہ بڑے اہم ہیں، عام طور پر آدمی کا دین ان ہی دو اعضاء کے ذریعہ تباہ و برباد ہوتا ہے، اسی لئے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاص طور پر تاکید فرما رہے ہیں کہ جو آدمی اپنے ان دو اعضاء کے متعلق مجھے گارنٹی دیتا ہو کہ ان دونوں کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کبھی استعمال نہیں کرے گا تو میں اس کو جنّت کی گارنٹی دیتا ہوں۔ اس سے زبان کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے کہ اس کی حفاظت کتنی ضروری ہے۔ اور اس کی حفاظت کے نتیجہ میں آدمی کا آدھا دین محفوظ ہوجاتا ہے۔

ایک جملہ جہنم میں دور پھینک دیتا ہے

۱۵۱۴:-وعن أبي هريرة رضي الله عنه أنّه سمع النبيّ ﷺ يقول: ((إنَّ العَبْدَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مَا يَتَبَيَّنُ فِيهَا يَزِلُّ بِهَا إِلَى النَّارِ أَبْعَدَ مِمَّا بَيْنَ الْمَشْرِقِ

والمَغْرِبِ)) ومعنى: ((يَتَبَيَّنُ)) يُفَكِّرُ أنّها خَيْرٌ أم لا. (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:-حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: کوئی بندہ جب کوئی کلمہ اپنی زبان سے نکالتا ہے اور اس کی اہمیت کا اس کو کوئی اندازہ بھی نہیں ہوتا، لیکن اس کی وجہ سے وہ جہنم میں اتنا دور پھسل جاتا ہے کہ جتنا مشرق اور مغرب کے درمیان کا فاصلہ ہے۔

افادات:-بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بغیر سوچے کوئی بات زبان سے نکال دیتا ہے، خاص طور پر ایسے لوگ جن کو لوگوں کو ہنسانے کی عادت ہوتی ہے، اور آج کل تو لوگوں کو ہنسانا بھی ایک قسم کا فن بن گیا ہے، عام طور پر اس میں آدمی ایسی ایسی باتیں زبان سے نکالتا ہے کہ اس کی وجہ سے آدمی کفر تک پہنچ جاتا ہے۔ اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ وہ کلمات اور باتیں جن کے زبان سے نکالنے کے نتیجہ میں آدمی کافر ہوجاتا ہے؛ ان سے بھی واقفیت رکھنا ہر ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔

پہلے تولو؛ پھر بولو

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: اس زمانہ میں تو یہ جاننا بہت ہی زیادہ اہم ہوگیا ہے، اس لئے کہ بہت سے لوگ اپنی جہالت اور ناواقفیت کی وجہ سے ایسے کلمات اپنی زبان سے نکال دیتے ہیں جن کے نتیجہ میں ایمان سے نکل جاتے ہیں، اور ان کو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ ایسا بولنے کی وجہ سے میں ایمان سے نکل گیا ہوں۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد خاص طور پر ہمیں اس بات کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ جو بات بھی ہم اپنی زبان سے نکالیں؛ بہت سوچ سمجھ کر نکالیں۔ اسی لیے ہمارے اکابر فرماتے ہیں کہ پہلے تولو؛ پھر بولو۔ پہلے سوچ لیجئے کہ میں جو بات اپنی زبان سے نکالنے جارہا ہوں اس کے نتیجہ

میں کہیں مَیں اللہ تعالیٰ کے یہاں پکڑا تو نہیں جاؤں گا، مجھے اس کا جواب دینا ہے۔

ویسے زبان کی اہمیت کا اندازہ آپ اس سے بھی لگا سکتے ہیں کہ کفر اور اسلام کے لئے بھی زبان کے کلمات ہی کو بنیاد قرار دیا گیا ہے، ایک کافر کلمہ طیبہ پڑھنے ہی کی وجہ سے مسلمان ہوتا ہے، اپنے اسلام اور ایمان کا اظہار وہ اسی کلمہ کے ذریعہ کرتا ہے، جب تک کلمہ نہیں کہا تھا وہاں تک کافر تھا، جیسے ہی کلمہ ادا کیا، وہ مسلمان قرار دیا گیا، یعنی کلمہ کو بولنے سے پہلے وہ جہنمی تھا؛ کلمہ بول کر جنّتی بن گیا۔ اس لیے زبان سے جو بات بھی کہی جائے اس میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

بہت سوچ سمجھ کر بولیں

۱۵۱۵:- وعنه، عن النبیّ ﷺ قَالَ: ((إِنَّ العَبْدَ لَيَتَكَلَّمُ بِالكَلِمَةِ مِنْ رِضْوَانِ اللهِ تَعَالَى مَا يُلْقِي لَهَا بَالاً يَرْفَعُهُ اللهُ بِهَا دَرَجَاتٍ، وإِنَّ العَبْدَ لَيَتَكَلَّمُ بِالكَلِمَةِ مِنْ سَخَطِ اللهِ تَعَالَى لا يُلْقِي لَهَا بَالاً يَهْوِي بِهَا فِي جَهَنَّمَ)). رواه البخاری

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بندہ کبھی اللہ کی خوشنودی کا کوئی ایسا کلمہ اپنی زبان سے نکالتا ہے کہ بولتے وقت اس کو اس کی پرواہ بھی نہیں ہوتی (یعنی اس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ میں جو کلمہ اپنی زبان سے نکال رہا ہوں اس سے اللہ تعالیٰ مجھ سے اتنے راضی ہو جائیں گے، لیکن) اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے جنّت میں اس کے درجات بہت زیادہ بلند کر دیتا ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی کی کوئی بات اپنی زبان سے نکالتا ہے کہ بولتے وقت اس کی اس کو کوئی پرواہ بھی نہیں ہوتی، لیکن اس کی وجہ سے وہ جہنم کی گہرائی میں چلا جاتا ہے۔

افادات:- حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد ہمیں اس بات کی طرف متوجہ کرتا

ہے کہ جو بات بھی ہم اپنی زبان سے نکالیں وہ بہت سوچ سمجھ کر نکالیں کہ کہیں اللہ تعالیٰ ناراض نہ ہوجائے اور اس کی وجہ سے کہیں ہماری گرفت نہ ہوجائے۔

ایک جملہ پر تا قیامت رضامندی یا ناراضگی کا فیصلہ

۱۵۱۶:-وعن أبي عبد الرحمٰن بِلالِ بن الحارِثِ المُزَنِيِّ رضي الله عنه: أنَّ رسول الله ﷺ قَالَ: ((إنَّ الرَّجُلَ لَيَتَكَلَّمُ بِالكَلِمَةِ مِنْ رِضْوَانِ اللهِ تَعَالَى مَا كَانَ يَظُنُّ أنْ تَبْلُغَ مَا بَلَغَتْ يَكْتُبُ اللهُ لَهُ بِهَا رِضْوَانَهُ إلَى يَوْمِ يَلْقَاهُ، وإنَّ الرَّجُلَ لَيَتَكَلَّمُ بِالكَلِمَةِ مِنْ سَخَطِ اللهِ مَا كَانَ يَظُنُّ أنْ تَبْلُغَ مَا بَلَغَتْ يَكْتُبُ اللهُ لَهُ بِهَا سَخَطَهُ إلَى يَوْمِ يَلْقَاهُ)) (رواه مالك في المُوَطَّأ، والترمذي، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ:- حضرت بلال بن حارث مزنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کبھی کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی کوئی بات اپنی زبان سے نکالتا ہے (جس وقت وہ بول رہا ہوتا ہے) اس کو یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ یہ کلمہ مجھے اتنے اونچے مقام تک پہنچائے گا کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ قیامت تک کے لئے اس بندہ کے لئے اپنی خوشی لکھ دیتے ہیں۔ اور کبھی کوئی آدمی اپنی زبان سے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا کلمہ نکالتا ہے، اس وقت اس کو یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ کلمہ اس کو اس درجہ تک پہنچائے گا کہ اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے قیامت تک کے لئے اپنی ناراضگی لکھ دیتے ہیں۔ (اس لیے بولنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے)

باتوں پر کنٹرول کرنے کی ایک تدبیر

افادات:- حضرت مولانا سیّد اصغر حسین صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت میاں صاحب کے نام سے مشہور ہیں (جن کی قبر راندیر کے قبرستان میں ہے) ہمارے

اکابر میں سے گزرے ہیں، بڑے اونچے پائے کے بزرگ تھے اور صاحبِ کشف وکرامات تھے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ان کو بہت زیادہ مناسبت اور محبت تھی، مفتی صاحب ان کے شاگرد بھی تھے اور ان کے گھر آتے جاتے رہتے تھے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو میرے داخل ہوتے ہی حضرت نے مجھ سے فرمایا: مولوی شفیع صاحب! آج تو ہم عربی میں بات کریں گے۔ مَیں سوچ میں پڑ گیا کہ آج حضرت کو یہ کیا خیال آیا کہ عربی میں بات کرنے کو فرما رہے ہیں۔ مَیں نے عرض کیا: حضرت! کیا بات ہے؟ فرمایا: بس آج عربی میں بات کریں گے۔ جب میں نے بہت اصرار کیا تو حضرت نے فرمایا: دیکھو! بات دراصل یہ ہے کہ مجھے تم سے تعلق ہے اور جب تم آتے ہو تو بے تکلفی کی وجہ سے ہم سے باتوں میں احتیاط نہیں ہوتی، اس لیے زبان کی احتیاط کو حاصل کرنے کے لئے آج میں نے سوچا کہ تم سے عربی میں بات کروں، اس لئے کہ (پریکٹس اور عادت نہ ہونے کی وجہ سے) روانی کے ساتھ عربی نہ میں بول سکتا ہوں، نہ آپ بول سکتے ہیں، جب ہم عربی میں بات کرنا چاہیں گے تو بہت سوچ سوچ کر بڑی مشکل سے چند کلمات ادا کرسکیں گے، اس طرح اپنی باتوں پر کنٹرول کرنے کا مقصد حاصل ہو جائے گا۔

نصیحت آموز بات

پھر حضرت نے فرمایا: ہماری مثال تو اس آدمی جیسی ہے جو ایک لمبے سفر پر روانہ ہوا، اور گھر سے جب چلا تو اپنے ساتھ بہت ساری اشرفیاں لی تھیں، لیکن اپنی نادانی اور ناسمجھی کی وجہ سے بے دریغ خرچ کرتا رہا یہاں تک کہ چند اشرفیاں باقی رہ گئیں اور ابھی بہت لمبا سفر تو باقی ہے، جب اس کو خیال آئے گا کہ ابھی تو منزل بہت

دور ہے، تو وہ بقیہ اشرفیوں کو کتنا سوچ سمجھ کر استعمال کرے گا کہ پتہ نہیں آگے کیا معاملہ اور ضرورت پیش آئے۔ اسی طریقہ سے ہماری زندگی کا ایک بڑا حصہ گزر چکا ہے، اب تھوڑا سا باقی رہ گیا ہے، لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم نے اپنی گزشتہ زندگی کے لمحات جس بے دردی سے استعمال کئے ہیں ان پر توبہ واستغفار کریں، اور جو اوقات باقی رہ گئے ہیں اور تھوڑا بہت سرمایہ جو ہمارے ہاتھ میں بچ گیا ہے، اس کو بہت سوچ سمجھ کر اور بہت احتیاط سے خرچ کریں۔

اس کا خطرہ سب سے زیادہ ہے

۱۵۱۷:-وعن سفیان بن عبد اللہ -رضی اللہ عنہ- قَالَ: قُلْتُ: یَارسولَ اللہ! حدِّثنی بأَمْرٍ أَعْتَصِمُ بِهِ قَالَ: ((قُلْ: رَبِّيَ اللہُ ثُمَّ اسْتَقِمْ)) قُلْتُ: یَارسولَ اللہِ! مَا أَخْوَفُ مَا تَخَافُ عَلَيَّ؟ فَأَخَذَ بِلِسَانِ نَفْسِهِ، ثُمَّ قَالَ: ((هَذَا)). (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:- حضرت سفیان بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی ایسی بات بتلا دیجئے جس کو میں مضبوطی سے تھام لوں۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم کہہ دو کہ میرا رب اللہ ہے؛ پھر اس پر جم جاؤ (یعنی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کرنے کے بعد اس پر جمے رہو کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو اپنی زندگی میں اتارو) اس کے بعد میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ سب سے زیادہ میرے متعلق کس چیز کا ڈر رکھتے ہیں؟ (یعنی مجھے کونسی چیز سے سب سے زیادہ خطرہ لاحق ہے، اگر آپ بتلا دیں تو میں اس سے احتیاط کروں اور اپنے آپ کو اس سے بچاؤں) تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زبانِ مبارک پکڑ کر فرمایا: اس کا (خطرہ سب سے زیادہ ہے)۔

افادات:- اس لیے کہ زبان ہی آدمی کو معلوم نہیں کہاں سے کہاں لے جاتی ہے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ زبان کی کھیتیاں ہی آدمی کو جہنم میں ڈالتی ہیں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس نوع کے سوالات کرتے رہتے تھے، اور وہ صرف سوال نہیں ہوتا تھا بلکہ آپ کی طرف سے جو بات بتلا دی جاتی تھی تو ان کی طرف سے زندگی بھر اس پر عمل بھی ہوا کرتا تھا۔

زیادہ گفتگو دل کی سختی کا ذریعہ

۱۵۱۸:- وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال قال رسول اللہ ﷺ: ((لَا تُكْثِرُوا الْكَلَامَ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللهِ، فَإِنَّ كَثْرَةَ الْكَلَامِ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللهِ تَعَالَى قَسْوَةٌ لِلْقَلْبِ! وإِنَّ أَبْعَدَ النَّاسِ مِنَ اللهِ الْقَلْبُ الْقَاسِي)) (رواہ الترمذی)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ذکر کے علاوہ زیادہ گفتگو نہ کرو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے علاوہ زیادہ گفتگو دل کی سختی کا ذریعہ ہے، اور سخت دل اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ دور ہوتا ہے۔

افادات:- پچھلی مجلس میں ایک مثال دے کر بتلایا تھا کہ ایک آدمی کے سامنے جواہرات و موتیوں کا ڈھیر پڑا ہوا ہو، اور کوئی آدمی اس کو بڑی آسانی سے جمع کر سکتا ہو، لیکن ان کو چھوڑ کر وہ پتھر وڈھیلے اپنے دامن میں بھر لے؛ تو اس کے متعلق کیا کہا جائے گا؟ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں وقت دیا ہے، اس وقت کے ذریعہ ہم اللہ تعالیٰ کو یاد کر کے اور اس کا ذکر کر کے نیکیوں کا بڑا ذخیرہ حاصل کر سکتے ہیں، لیکن اگر اس کو چھوڑ کر ہم لغویات اور دوسری چیزوں میں پڑ جائیں؛ تو ہمارے متعلق بھی وہی کہا جائے گا۔

ضرورت اور بلاضرورت کلام کا فرق

اللہ کے ذکر کے علاوہ کی زیادہ گفتگو دل کی سختی کا ذریعہ ہے۔جب آدمی بے کار بات اپنی زبان سے نکالتا ہے تو اس کی وجہ سے قلب پر ایک ظلمت چھا جاتی ہے حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں: ایک سبزی فروش اپنے کاروبار کی وجہ سے اور حلال روزی حاصل کرنے کے لئے دن میں ہزار مرتبہ بھی ’’سبزی لے لو‘‘ بولے گا، تب بھی اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے، چوں کہ وہ حلال کاروبار میں لگا ہوا ہے، اور اس کا یہ بول ضرورت کی وجہ سے ہے۔لیکن کوئی آدمی اگر بلاضرورت ایک جملہ بھی اپنی زبان سے نکالتا ہے تو اللہ کی قسم! اس کی وجہ سے دل پر اتنی زیادہ ظلمت چھا جاتی ہے کہ اس کو میں بتلا نہیں سکتا۔

واقعہ یہی ہے کہ ہم لوگ بے کار گفتگو میں اپنے بہت سارے اوقات ضائع کر دیتے ہیں، اور اس کی وجہ سے اپنے قلب کو بھی بہت زیادہ تاریک اور ظلمت زدہ بنا دیتے ہیں، اسی لیے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اس کی وجہ سے قلب میں سختی آتی ہے، اور سخت دل اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بہت زیادہ دور ہوتا ہے۔ یہ بہت اہم چیز ہے۔فضول بات جس کا نہ دینی فائدہ ہو، نہ دنیوی؛ اس سے اپنے آپ کو بچانا بہت ضروری ہے، اس کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے۔

جرم چھوٹا؛ جُرم بڑا

۱۵۱۹:-وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم: مَنْ وَقَاهُ اللهُ شَرَّ مَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَشَرَّ مَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ، دَخَلَ الْجَنَّةَ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس آدمی کو اللہ تعالیٰ نے اُس کے اُس عضو کے شر سے بچالیا جو دونوں جبڑوں کے درمیان ہے، اور اُس عضو کے شر سے بچالیا جو ٹانگوں کے درمیان ہے؛ تو وہ جنّت میں داخل ہوگیا۔

افادات:- یعنی زبان اور شرمگاہ کی برائی سے جس کی حفاظت کرلی گئی؛ وہ آسانی سے جنّت میں داخل ہوجائے گا اس لیے کہ عام طور پر جہنم میں لے جانے والے یہی دو اعضاء ہیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے زبان کے ذریعہ سے صادر ہونے والے گناہوں کی تعداد بیس گنوائی ہے۔ اس موقعہ پر ایک بڑا بلیغ جملہ تحریر فرمایا ہے: ''جِرْمُهُ صَغِيْرٌ وَجُرْمهٗ كَبِيْرٌ'' زبان کی سائز تو چھوٹی ہے لیکن اس کا گناہ بہت بڑا ہے۔

نجات کا راستہ

۱۵۲۰: وَعَنْ عُقْبَةَ بنِ عَامِرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللهِ! مَا النَّجَاةُ؟ قَالَ: أَمْسِكْ عَلَيْكَ لِسَانَكَ، وَلْيَسَعْكَ بَيْتُكَ، وَابْكِ عَلَى خَطِيْئَتِكَ.

ترجمہ:- حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! نجات کا راستہ کیا ہے؟ (یعنی آدمی ایسا کونسا طریقہ اختیار کرے تو وہ دنیا و آخرت میں نجات پاسکتا ہے؟) نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔ اور تمہارا گھر تم کو سموئے رکھے۔ اور اپنے گناہوں پر روتے رہو۔

افادات:- زبان اتنی چھوٹی سی ہے لیکن ہمارے قابو میں نہیں ہے، کوئی بھی آدمی گارنٹی سے نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اس کو اپنے قابو میں رکھا ہے، وہ ہمارے قابو سے باہر ہے، ضرورت اس کی ہے کہ اس کو قابو میں رکھا جائے۔

تمہارا گھر تم کو سموئے رکھے، یعنی آدمی کو اپنے گھر سے بلا ضرورت نکلنا نہیں

چاہیے، اس لئے کہ عام طور پر گھر سے باہر ایسی باتیں پیش آتی ہیں جو آدمی کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا کرتی ہیں۔ آدمی جب گھر سے باہر نکلتا ہے تو بدنظری اور بدزبانی میں مبتلا ہوتا ہے، گھر کے باہر گناہوں کے ایسے ایسے اسباب پائے جاتے ہیں جو قدم قدم پر آدمی کو اپنے اندر مبتلا کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس لیے آدمی جتنا زیادہ اپنے گھر میں رہے گا، اتنا ہی زیادہ وہ گناہوں سے حفاظت میں رہے گا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ گھر میں بیٹھ کر ٹی وی اور انٹرنیٹ وغیرہ پر ناجائز چیزیں دیکھتا رہے۔

اپنے گناہوں پر روتے رہو۔ گناہوں پر رونے کی بھی عادت ڈالنی چاہیے، ہمارے یہی آنسو گناہوں کی سیاہی کو دھونے کا کام کرتے ہیں۔ ہر چیز کا ایک صابن ہوتا ہے جو اس کو صاف کرتا ہے، تو گناہوں کے ذریعہ سے قلب پر جو میل کچیل اور سیاہی چھا جاتی ہے، اس کو دور کرنے کا کیمیکل یہی آنسو ہیں، آدمی ندامت کے آنسو بہاتا رہے تو اس کے نتیجہ میں گناہ معاف ہو جائیں گے۔

سارے اعضاء کی زبان سے منت وسماجت

۱۵۲۱:-وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيِّ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: إِذَا أَصْبَحَ ابْنُ آدَمَ فَإِنَّ الْأَعْضَاءَ كُلَّهَا تُكَفِّرُ اللِّسَانَ، تَقُوْلُ: إِتَّقِ اللهَ فِيْنَا، فَإِنَّمَا نَحْنُ بِكَ فَإِنِ اسْتَقَمْتَ، اسْتَقَمْنَا. وَإِنِ اعْوَجَجْتَ، اِعْوَجَجْنَا.

ترجمہ:- حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب آدمی صبح کرتا ہے تو اس کے جسم کے سارے اعضاء زبان کے سامنے گڑگڑاتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں: ہمارے معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا، اس لئے کہ ہمارا سارا معاملہ تیرے اوپر موقوف ہے، اگر تو سیدھی رہی تو ہم بھی سیدھے رہیں گے، اور اگر تو ٹیڑھی ہوگئی تو ہم بھی

ٹیڑھے ہو جائیں گے (ہمارا معاملہ اپنے قابو سے نکل جائے گا۔ گویا سارا دارومدار زبان پر ہے)۔

زبان؛ تمام دینی بنیادوں کی جڑ

۱۵۲۲:-وَعَنْ مَعَاذٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قُلْتُ: يَارَسُوْلَ اللهِ! أَخْبِرْنِيْ بِعَمَلٍ يُدْخِلُنِي الْجَنَّةَ وَيُبَاعِدُنِيْ مِنَ النَّارِ؟ قَالَ: لَقَدْ سَأَلْتَ عَنْ عَظِيْمٍ، وَإِنَّهُ لَيَسِيْرٌ عَلَى مَنْ يَسَّرَهُ اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِ. تَعْبُدُ اللهَ لَا تُشْرِكُ بِهٖ شَيْئاً وَتُقِيْمُ الصَّلَاةَ وَتُؤْتِي الزَّكَاةَ وَتَصُوْمُ رَمَضَانَ، وتَحُجُّ الْبَيْتَ)) ثُمَّ قَالَ: ((أَلاَ أَدُلُّكَ عَلَى أَبْوابِ الْخَيْرِ؟ الصَّوْمُ جُنَّةٌ، وَالصَّدَقَةُ تُطْفِئُ الْخَطِيْئَةَ كَمَا يُطْفِئُ الْمَاءُ النَّارَ، وَصَلَاةُ الرَّجُلِ مِنْ جَوْفِ اللَّيْلِ)) ثُمَّ تَلا: ﴿تَتَجَافَى جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ﴾ حَتّٰى بَلَغَ ﴿يَعْمَلُونَ﴾ ثُمَّ قَالَ: ((أَلاَ أُخْبِرُكَ بِرَأْسِ الْأَمْرِ، وَعَمُوْدِهٖ، وَذِرْوَةِ سَنَامِهٖ؟)) قُلْتُ: بَلَى يَارسولَ اللهِ. قَالَ: ((رَأْسُ الْأَمْرِ الْإِسْلَامُ، وَعَمُوْدُهُ الصَّلَاةُ، وَذِرْوَةِ سَنَامِهِ الْجِهَادُ)) ثُمَّ قَالَ: ((أَلاَ أُخْبِرُكَ بِمِلَاكِ ذٰلِكَ كُلِّهٖ؟)) قُلْتُ: بَلَى يَارَسولَ اللهِ. فَأَخَذَ بِلِسَانِهٖ وقال: ((كُفَّ عَلَيْكَ هٰذَا)) قُلْتُ: يَارسولَ الله! وإِنَّا لَمُؤَاخَذُوْنَ بِمَا نَتَكَلَّمُ بِهٖ؟ فَقَالَ: ((ثَكِلَتْكَ أُمُّكَ! وَهَلْ يَكُبُّ النَّاسَ فِي النَّارِ عَلَى وُجُوهِهِمْ إِلَّا حَصَائِدُ أَلْسِنَتِهِمْ؟)).

(رواه الترمذی، وقال: حديث حسن صحيح) وَقَدْ سبق شرحه في باب قبل هٰذَا)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے عرض کیا: اللہ کے رسول! مجھے کوئی ایسا عمل بتلائیے جو مجھے جنّت میں لے جائے، اور جہنم سے دور کردے؟ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم نے ایک بہت بڑی بات پوچھی ہے، لیکن اتنا

ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو جس کے لئے آسان کردے اس کے لئے بہت آسان ہے (اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ توفیق مانگتا رہے، جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق شاملِ حال نہ ہو وہاں تک آدمی چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی نہیں کرسکتا، اس لئے دعا کا اہتمام بہت ضروری ہے) اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اور نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو، اور بیت اللہ کا حج کرو۔ پھر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: نیکیوں کے دروازوں کا پتہ نہ بتاؤں؟ روزہ ڈھال ہے (جس کے نتیجہ میں آدمی کی گناہوں سے اور شیطان کی شرارتوں سے عام طور پر حفاظت ہوتی ہے) اور صدقہ گناہوں کو اس طرح بجھا دیتا ہے جس طرح پانی آگ کو بجھاتا ہے (گناہوں کے نتیجہ میں آدمی جہنم کی آگ کو بھڑکاتا ہے لیکن صدقہ اس کو بجھانے کا کام کرتا ہے) اور آدمی کا رات کے درمیان میں نماز پڑھنا۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ان کے پہلو خواب گاہوں سے جدا رہتے ہیں، اس وقت وہ اپنے رب کو ڈر اور لالچ کی حالت میں پکارتے ہیں۔ اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ پس کسی کو بھی علم نہیں ہے ان نعمتوں کا جو ہم نے ان لوگوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے واسطے چھپا رکھی ہیں، وہ ان کے اعمال کا بدلہ ہے۔

اس کے بعد حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان ساری چیزوں کی اصل اور بنیاد نہ بتلاؤں جس پر ان سب کا دارو مدار ہے، اور جو اس کا درمیانی ستون ہے (خیمہ کا درمیانی ستون ہوتا ہے تب ہی خیمہ قائم رہتا ہے، اگر وہی نہ ہو تو خیمہ کھڑا نہیں رہ سکتا) اور اس کی کوہان اور چوٹی ہے؟ (جس پر دین کی بلندی موقوف ہے) حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! ضرور بتلائیے۔ تو حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان سب کا دارو مدار اسلام پر ہے (یعنی آدمی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے حوالے کردے، اور عملی طور پر ان ساری چیزوں کو بجالائے) اور اس کا بنیادی ستون نماز ہے (اس لئے کہ جو

آدمی نماز قائم کرے گا تو پورے دین کا قائم کرنا اس کے لئے آسان ہو جائے گا۔ اسی لئے دوسری روایت ہے: أَلصَّلَاةُ عِمَادُ الدِّيْنِ مَنْ أَقَامَهَا فَقَدْ أَقَامَ الدِّيْنَ وَمَنْ هَدَمَهَا فَقَدْ هَدَمَ الدِّيْنَ، نماز دین کا بنیادی ستون ہے جس نے اس کو قائم کیا اس نے دین کو قائم کیا اور جس نے اس کو ڈھادیا اس نے دین کو ڈھادیا) اور اس کی چوٹی جہاد ہے۔ پھر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ان سب کا خلاصہ نہ بتلاؤں؟ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ضرور بتلایئے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زبانِ مبارک پکڑی اور فرمایا: اس کو روکے رکھیو (یہ سب کی جڑ ہے) حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم جو بولیں گے اس پر بھی پکڑ اور گرفت ہوگی؟ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمہاری ماں تم پر روئے (ایسا جملہ تاکید کے لئے بولا جاتا ہے) لوگوں کو جہنم میں ان کے چہروں کے بل ان کی زبانوں کی کھیتیاں ہی ڈالیں گی (یعنی زبان کے بول کے نتیجہ میں ہی وہ جہنم میں اوندھے منہ ڈالے جائیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ زبان بڑی خطرناک چیز ہے، اسی لئے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو سارے دین کی بنیاد اور جڑ قرار دیا ہے)۔

جانتے ہو غیبت کیا ہے؟

۱۵۲۳:-وعن أبي هريرة- رضي الله عنه-: أنَّ رسُولَ الله ﷺ قَالَ: ((أَتَدْرُونَ مَا الْغِيبَةُ؟)) قالوا: اللهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ، قَالَ: ((ذِكْرُكَ أَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ)) قِيلَ: أَفَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ فِي أَخِي مَا أَقُولُ؟ قَالَ: ((إِنْ كَانَ فِيهِ مَا تَقُولُ، فقد اغْتَبْتَهُ، وإِنْ لَمْ يَكُنْ فِيهِ مَا تَقُولُ فَقَدْ بَهَتَّهُ.)) (رواه مسلم.)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا: جانتے ہو غیبت کیا ہے؟ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے

ہیں۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمہارا اپنے بھائی کو اس انداز سے یاد کرنا جو اس کو ناپسند ہو۔ یہ سن کر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا: اگر میرے اس بھائی میں وہ بات موجود ہو جو میں کہہ رہا ہوں؟ (تو آپ کیا فرماتے ہیں؟) حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو بات کہہ رہے ہو اگر وہ اس میں موجود ہے؛ تب ہی تو غیبت ہے۔ اور اگر وہ بات اس میں موجود نہیں ہے؛ تب تو بہتان ہے۔

افادات:۔ بعض لوگ غیبت کرتے ہیں اور جب ان کو ٹوکا جاتا ہے تو کہتے ہیں: ارے! میں کوئی جھوٹ تھوڑا ہی بول رہا ہوں؛ یہ بات تو اس میں موجود ہے، گویا اس کا یہ جملہ کہ ''مَیں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں'' اس سے نعوذ باللہ وہ یوں کہنا چاہتا ہے کہ میرا غیبت کرنا جائز اور درست ہے، حالاں کہ جس چیز کو قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہو، اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس کی حرمت کے لئے بے شمار ارشادات فرمائے ہوں؛ کیا وہ اپنے عمل سے اس کو جائز ٹھہرانا چاہتا ہے؟ پہلے بھی میں نے بتلایا تھا کہ ایسے آدمی کے بارے میں علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بہت سے علماء نے اس پر کفر کا فتویٰ لگایا ہے۔ اس لئے اس سے بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

مسلمان کی جان، مال اور عزت وآبرو کی اہمیت

۱۵۲۴:۔وعن أَبِی بَکْرة -رضی الله عنه- : أَنَّ رَسُولَ الله صلی الله علیه وسلم قَالَ فی خُطْبَتِهِ يَوْمَ النَّحْرِ بِمِنًى فی حَجَّةِ الوَدَاعِ: ((إنَّ دِمآءَكُمْ، وَأَمْوَالَكُمْ، وأَعْرَاضَكُمْ، حَرَامٌ عَلَيْكُمْ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا، فی شَهْرِكُمْ هَذَا، فی بَلَدِكُمْ هَذَا، ألا هَلْ بَلَّغْتُ)) (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:۔ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع میں منیٰ کے میدان میں جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا اس میں یہ بھی فرمایا: تمہاری جان، تمہارا مال اور

تمہاری عزت وآبرو آپس میں ایسی ہی حرام ہے جیسا کہ آج کا دن، اس مہینہ میں، اس شہر کے اندر باحرمت ومحترم ہے۔ سنو! کیا میں نے سارا دین تم لوگوں تک نہیں پہنچایا؟

افادات: اسلام میں حج فرض ہونے کے بعد نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے **۱۰ھ** میں ایک ہی مرتبہ حج کیا ہے جس کو حجۃ الوداع کہا جاتا ہے، جس میں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بہت بڑی تعداد شریک ہوئی، اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود بھی بڑا اہتمام فرمایا تھا، پہلے باقاعدہ اعلان کرایا تھا کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حج میں تشریف لے جانے والے ہیں؛ لہٰذا اے لوگو! تم بھی تیاری کرو۔ چناں چہ اس سلسلہ میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تفصیلی روایت موجود ہے کہ جب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روانگی کا وقت آیا تو مدینہ منورہ میں بہت بڑا مجمع جمع ہوگیا، ایک قول کے مطابق نوے ہزار کی تعداد تھی، اور اس سے زیادہ کی مقدار بھی بتلائی جاتی ہے۔ اسی حج میں دسویں ذی الحجہ کو منیٰ میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک تقریر فرمائی تھی جس میں امت کو بطور ہدایت کچھ ایسی باتیں خاص طور پر ارشاد فرمائیں جو قیامت تک کے لئے اہمیت رکھتی تھی، کیوں کہ یہ ایک ایسا مجمع تھا جو اس سے پہلے نہ کبھی ہوا تھا اور نہ بعد میں ہونے والا تھا۔ چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باقاعدہ آدمی بھیج کر لوگوں کو پہلے خاموش کرایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تقریر اور خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں، سب لوگ خاموش ہوجاؤ اور غور سے سنو۔ جب سب لوگ خاموش ہوگئے تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے کچھ سوالات کیے، ان میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ یہ کون سا مہینہ ہے؟ وہ ذی الحجہ کا مہینہ تھا، حج اسی میں ہوتا ہے۔ ویسے بھی ملتِ ابراہیمی میں حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ سے برابر کچھ مہینے ایسے تھے جو حرمت والے مہینے قرار دیئے گئے تھے جن مہینوں میں جنگ کرنا، کسی کی عزت

وآبرو پر ہاتھ ڈالنا بہت بڑا جرم سمجھا جاتا تھا۔ تین مہینے تو ایک ساتھ آتے ہیں؛ ذی قعدہ ، ذی الحجہ اور محرم، اور چوتھا مہینہ رجب؛ یہ کل چار مہینے حرمت والے کہے جاتے ہیں ۔قرآن پاک میں بھی اللہ تعالیٰ نے اس بات کو ارشاد فرمادیا ہے ﴿إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ، مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ﴾ ان بارہ مہینوں میں چار مہینے حرمت والے ہیں، انہیں میں ایک مہینہ ذی الحجہ کا بھی تھا، اور سب کو معلوم تھا کہ ذی الحجہ کا مہینہ چل رہا ہے، اس کے باوجود نبیٔ کریم ﷺ آگے جو بات ارشاد فرمانے والے تھے اس کی اہمیت کو لوگوں کے دلوں میں بٹھانے کے لئے یہ سوالات فرمائے، جیسے کوئی آدمی کسی کو اس کے باپ کے متعلق کچھ نصیحت کرنا چاہے تو پوچھتا ہے کہ یہ کون ہیں؟ بیٹا کہتا ہے کہ یہ میرے ابا ہیں۔ پھر کہتا ہے کہ تمہارے ابا ہیں نا؛ تو پھر ان کا یہ حق ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ کسی بات کی اہمیت کو کسی کے دل میں بٹھانے کے لئے یہ بھی ایک انداز ہے۔

تو نبیٔ کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے سوال کیا کہ ابھی کون سا مہینہ ہے؟ روایتوں میں آتا ہے کہ بعض مرتبہ نبیٔ کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کے حکم سے احکام میں کچھ تبدیلی بھی فرمادیا کرتے تھے، اس لیے اگر چہ حضراتِ صحابہ جانتے تھے کہ یہ ذی الحجہ کا مہینہ ہے، لیکن یہ سمجھ کر کہ ذی الحجہ کا مہینہ ہونا تو سبھی کو معلوم ہے، اس کے باوجود بھی حضورِ اکرم ﷺ جب سوال فرمارہے ہیں، تو شاید آپ آج اس مہینے کا کوئی دوسرا نام تجویز فرمائیں گے، اسی خیال سے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے جواب دینے کی بجائے کہا: اے اللہ کے رسول! اللہ اور رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ تو حضور ﷺ نے صاف پوچھا: کیا یہ ذوالحجہ نہیں ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: جی ہاں اے اللہ کے رسول! یہ ذوالحجہ ہے۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سوال فرمایا: آج کون سا دن ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو معلوم تھا کہ آج یوم النحر یعنی دسویں ذی الحجہ اور قربانی کا دن ہے۔ (''نحر'' قربانی کو کہتے ہیں، چوں کہ دسویں کو قربانی کا پہلا دن ہوتا ہے، اس لیے عربی میں اس کو ''یوم النحر'' کہتے ہیں) اب صحابہ جانتے تھے کہ آج یوم النحر ہے، لیکن جب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سوال کیا تو وہی سوچ کر خاموش رہے کہ شاید حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دن کا کوئی دوسرا نام تجویز فرمائیں گے، اور یوں کہا: اللہ اور رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: کیا یہ یوم النحر نہیں ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: کیوں نہیں؟ آج یوم النحر ہی ہے۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سوال فرمایا: یہ کون سا شہر اور بستی ہے؟ (مکہ مکرمہ کا ایک نام ''اَلْبَلْدَةُ'' بھی ہے، جیسے مدینہ منورہ کا نام مدینہ ہے، مدینہ عربی زبان میں شہر کو کہتے ہیں، اور ''بلدہ'' بھی شہر ہی کو کہتے ہیں) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جانتے تھے کہ یہ مکہ مکرمہ ہے، لیکن یہی سمجھ کر کہ شاید اور کوئی نام تجویز فرمائیں گے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا یہ مکہ مکرمہ نہیں ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: کیوں نہیں؟۔

جب ذہنوں میں یہ چیزیں تازہ ہوگئیں کہ یہ وہ شہر ہے جس میں لوگوں کی عزت وآبرو اور جان ومال کو محفوظ سمجھا جاتا ہے، اور اس بستی کے اس علاقے کے اندر کسی کی جان ومال، عزت وآبرو پر دست درازی بہت بڑا جرم گردانا جاتا ہے، اور یہ وہ دن ہے کہ جس میں کسی کی جان ومال، اور عزت وآبرو پر ہاتھ اٹھانا بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا ہے، تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ﴿إِنَّ دِمَاءَ كُمْ، وَأَمْوَالَكُمْ، وَأَعْرَاضَكُمْ، حَرَامٌ عَلَيْكُمْ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا، فِي شَهْرِكُمْ هَذَا، فِي بَلَدِكُمْ هَذَا﴾ دیکھیے! اگر صرف مکہ مکرمہ ہوتا، اور آج دسویں ذی الحجہ نہ ہوتی، یا ذی الحجہ نہ ہوتا اور صرف یہ شہر مکہ

ہوتا، تب بھی تم لوگ اس کی اتنی عزت کرتے کہ تم کسی کی جان و مال اور کسی کی عزت و آبرو کے اوپر ہاتھ اٹھانے کو بڑا جرم سمجھتے۔ یا آج کا دن ہوتا اور یہی مہینہ ہوتا دنیا کے کسی اور علاقے میں ہوتا، مکہ کی یہ بستی نہ ہوتی تب بھی آج کے دن تم کسی کی عزت و آبرو، اور جان و مال پر ہاتھ اٹھانے کو بہت بڑا جرم سمجھتے، تو آج یہاں تو گویا تاکید در تاکید در تاکید؛ تینوں چیزیں جمع ہوگئی ہیں، لہٰذا یہ باتیں ذہن نشین کرلو: بے شک تمہاری جان، تمہارے مال اور تمہاری عزت وآبرو ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں، جیسے آج کے دن کی حرمت، اس مہینہ کے اندر، اس شہر میں ہے۔ گویا اتنی تاکید فرما دی کہ آئندہ قیامت تک کے لئے بتلا دیا کہ اب کسی مسلمان کی جان، کسی مسلمان کا مال، کسی مسلمان کی عزت وآبرو ایسی نہیں ہے کہ کوئی مخصوص دن ہو تب ہی محفوظ رہے گی، اور اس کے علاوہ دنوں میں ان پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔ یا کسی مخصوص مہینہ میں تو محفوظ سمجھی جائے گی اور دیگر مہینہ میں نہیں۔ کسی مخصوص جگہ اور شہر میں تو محفوظ سمجھی جائے گی اور اگر وہ جگہ اور شہر نہ ہوا تو اس پر ہاتھ ڈالا جا سکتا ہے؛ ایسا نہیں ہے، بلکہ قیامت تک کے لئے تمام مسلمانوں کی جان و مال، عزت وآبرو ایسی محفوظ ہوگئی جیسے اس شہر کے اندر اس مہینے میں۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ باتیں ارشاد فرما کر حضراتِ صحابہ کو خطاب کیا: سنو! کیا میں نے اللہ تعالیٰ کا پیغام تم تک پہنچا دیا؟ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: جی ہاں! آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا۔ روایتوں میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر فرمایا: اے اللہ! تو گواہ رہیو کہ یہ لوگ اس بات کی گواہی دے رہے ہیں اور اقرار کرتے ہیں کہ میں نے تیرا پیغام ان تک پہنچا دیا۔

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مسلمان کی جان، مال اور عزت و آبرو کی اللہ تعالیٰ کے یہاں کتنی زیادہ قدر و قیمت ہے۔ آج ہمیں کسی سے معمولی سی ناراضگی ہو جاتی ہے تو اس کی بنیاد پر اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے سامنے والے کی عزت کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہیں، اور معلوم نہیں کیسے کیسے الزامات اس کے اوپر لگا دیتے ہیں۔ حالاں کہ شریعت اس کی بھی کہاں اجازت دیتی ہے۔ لیکن آج کل ہمارا ایک عام مزاج بن گیا ہے، اچھے اور برے، دین دار اور بے دین سب کا حال یہی ہو گیا ہے کہ جہاں کسی کے مزاج اور طبیعت کے خلاف کسی طرف سے کوئی بات پیش آتی ہے تو فوراً اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ اس نے ایسا کیا ہی کیوں؟ اب میں بھی اس کو بتلا دوں گا۔ اور پھر پورے سماج اور سوسائٹی کے اندر اس کی بے عزتی کی جاتی ہے، اخباروں میں اس کے متعلق غلط باتیں چھپوائی جاتی ہے، اور اس کے متعلق ایسا غلط پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ اللہ کی پناہ!۔ یہ سب طرزِ عمل اس روایت کے سراسر خلاف ہے۔

یہاں یہ روایت اس لیے لائے ہیں کہ کسی کی غیبت کرنا گویا اس کی عزت و آبرو پر ہاتھ ڈالنا ہے، اور نبیٔ کریم ﷺ نے ایک مسلمان کی عزت و آبرو کو وہی مقام دیا جو اپنی عزت و آبرو کا ہے، جیسا آپ اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کا اہتمام کرتے ہیں ویسا ہی دوسرے مسلمان کی عزت و آبرو کی حفاظت کا بھی اہتمام ہونا چاہیے۔

نقل اتارنا بھی غیبت ہے

۱۵۲۵:-وعن عائشة رَضِيَ اللهُ عنها، قالت: قُلْتُ للنبيِّ ﷺ: حَسْبُكَ مِنْ صَفِيَّةَ كذَا وكَذَا. قَالَ بعضُ الرواةِ: تَعْنِي قَصيرَةً، فقالَ: ((لَقَدْ قُلْتِ كَلِمَةً لَوْ مُزِجَتْ بِمَاءِ البَحْرِ لَمَزَجَتْهُ!)) قالت: وَحَكَيْتُ لَهُ إنْسَاناً فَقَالَ: ((مَا أُحِبُّ

أَنِّي حَكَيْتُ ((إِنْسَاناً وإِنَّ لِي كَذَا وَ كَذَا)).

(رواہ أبو داود والترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح)

ومعنی: ((مَزَجَتْهُ)) خَالَطَتْهُ مُخَالَطَةً يَتَغَيَّرُ بِهَا طَعْمُهُ أَوْ رِيحُهُ لِشِدَّةِ نَتْنِهَا وَقُبْحِهَا. وهذا الحديثُ مِنْ أَبلَغِ الزَّوَاجِرِ عَنِ الغِيبَةِ، قَالَ اللهُ تَعَالَى: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الهَوَى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى

ترجمہ مع تشریح:۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے ایک مرتبہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی کمزوری کی طرف اشارہ کرنے کی غرض سے یوں کہا کہ آپ کے لئے صفیہ میں اتنا ہی کافی ہے کہ وہ یوں ہے (حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا دراصل یہودی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، ان کا باپ حُیّ بن اَخطب یہودیوں کا بڑا سردار تھا، جب خیبر فتح ہوا تو یہ بھی مالِ غنیمت کے طور پر آئیں، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو آزاد کر کے ان سے نکاح فرمالیا۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا ذرا پستہ قد تھیں اور عام طور پر سوکنوں میں ایسی ویسی بات پیش آہی جاتی ہے، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا بلکہ صرف ہاتھ سے اشارہ کیا کہ وہ پستہ قد (ٹھگنی) ہیں۔ ان کا یہ جملہ سن کر) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم نے ایک ایسی بات اپنی زبان سے نکالی ہے کہ اگر اس کو سمندر کے پانی کے ساتھ ملا دیا جائے تو اس کی بو اور اس کے مزہ کو بھی بگاڑ دے (سمندر تو پوری دنیا کے اندر پھیلا ہوا ہے لیکن اس ایک جملے کے اندر اتنی زیادہ خرابی اور بگاڑ ہے کہ پورے سمندروں کے پانی کے مزہ کو بگاڑ سکتا ہے) اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ایک آدمی کی نقل اتاری، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مجھے اتنا اتنا دیا جائے (یعنی بڑی دولت دی جائے) تب بھی میں کسی کی نقل اتارنا پسند اور گوارا نہیں کرتا (اس لیے کہ کسی کی نقل اتارنا بھی غیبت میں شامل ہے)۔

افادات: -علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جملہ ''مَزَجَتْهُ'' کی تشریح فرمائی ہے کہ تم نے ایک ایسی بات کہی کہ اگر وہ سمندر کے پانی کے ساتھ ملادی جائے تو اس کی بدبو اور بدمزگی غالب آجائے۔ظاہر ہے کہ ملائی جانے والی چیز کی مقدار اگر زیادہ ہو تب ہی اس کا مزہ دوسری پر غالب آسکتا ہے،لیکن اس ایک جملہ کا اثر اتنا خطرناک ہوتا ہے کہ چھوٹا جملہ ہوکر بھی سمندر پر غالب آجاتا ہے۔اور غیبت سے روکنے کے لئے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو باتیں ارشاد فرمائی ہیں ان میں یہ سب سے اعلیٰ درجہ کی بات ہے۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات اور آپ کی باتیں آپ کی اپنی نہیں ہوتی بلکہ وہ وحی ہوتی ہیں۔گویا آپ کی زبانِ مبارک سے جو جملہ نکلا وہ ایسا بلیغ ہے کہ غیبت کی برائی کو بیان کرنے کے لئے اس سے زیادہ بلیغ بات اور کوئی نہیں ہوسکتی۔

لوگوں کا گوشت کھانے والوں کی سزا کا منظر

۱۵۲۶:-وعن أنسٍ - رضی اللہ عنہ- قَالَ : قَالَ رسول اللہ ﷺ: لَمَّا عُرِجَ بِي مَرَرْتُ بِقَوْمٍ لَهُمْ أَظْفَارٌ مِنْ نُحَاسٍ يَخْمِشُونَ وُجُوهَهُمْ وَصُدُورَهُمْ فَقُلْتُ: مَنْ هؤُلاءِ يَاجِبرِيلُ؟ قَالَ: هؤُلاءِ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ لُحُومَ النَّاسِ، وَيَقَعُونَ فِي أَعْرَاضِهِمْ! (رواہ أبو داود)

ترجمہ:-حضرت اَنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب مجھے معراج میں لے جایا گیا تو میرا گزر کچھ ایسے لوگوں پر ہوا کہ جن کے ناخن تانبے کے تھے، اور ان سے وہ اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے۔ میں نے اس منظر کو دیکھ کر حضرت جبرئیل سے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں؟ تو انہوں نے کہا: یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے ہیں اور ان

کی عزت وآبرو کے پیچھے پڑے رہتے ہیں (یعنی غیبت کے ذریعہ لوگوں کی آبروریزی کرتے رہتے ہیں، ان کو اس کی یہ سزا دی جارہی ہے)۔

اس کی بالکل اجازت نہیں

۱۵۲۷:-وعن أبي هريرة -رضي الله عنه- : أَنَّ رسُولَ الله ﷺ قَالَ : ((كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ : دَمُهُ وَعِرْضُهُ وَمَالُهُ)). رواه مسلم.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: پورا مسلمان ہی دوسرے مسلمان پر حرام ہے، اس کی جان، عزت وآبرو، اور اس کا مال (کسی پر بھی ہاتھ ڈالنے کی اجازت نہیں ہے)

افادات:- کوئی یہ نہ سمجھے کہ شریعت نے جان پر ہاتھ ڈالنے کی اجازت نہیں دی ہے، تو مال پر یا عزت وآبرو پر ہاتھ ڈالنے کی اجازت ہے؛ ایسا بالکل نہیں ہے، شریعت نہ اِس پر ہاتھ ڈالنے کی اجازت دیتی ہے اور نہ اُس پر؛ مسلمان تو پورا کا پورا دوسرے مسلمان کے حق میں حرام ہے، اس کو چھیڑنے کی بالکل اجازت نہیں ہے۔

باب تحريم سماع الغيبة

وأمر من سمع غيبةً مُحَرَّمةً بِرَدِّها والإنكارِ عَلى قائلها؛ فإنْ عجز أوْ لَمْ يقبل منه فارق ذٰلك المجلس إن أمكنه

غیبت سننا حرام ہے، اور جو کسی کی غیبت ہوتی ہوئے سنے اس کو چاہیے کہ اس کا دفاع کرے؛ ورنہ وہ مجلس ہی چھوڑ دے

باب کا عنوان اور آیاتِ قرآنیہ

جس طرح غیبت کرنا حرام ہے، اسی طرح غیبت سننا بھی حرام ہے۔ کسی مجلس میں آپ کے سامنے کوئی آدمی کسی کی غیبت کر رہا ہے تو شریعت آپ کو اس بات کا حکم دیتی ہے کہ جس کی غیبت کی جا رہی ہے اس کا ڈفینس اور بچاؤ کرو۔ اور اگر آپ اپنے اندر اتنی طاقت نہیں رکھتے کہ اس کا ڈفینس کر سکیں، یا ڈفینس تو کر رہے ہیں لیکن سامنے والا اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے تو اگر ممکن ہو تو اس مجلس ہی سے ہٹ جائیے۔

باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ﴾ جب بری بات کو وہ لوگ سنتے ہیں تو اس سے منہ پھیر لیتے ہیں، وہیں بیٹھے نہیں رہتے۔

باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ﴾ سورۂ مؤمنون میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کی جو خوبیاں بیان کی ہیں، ان میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بری بات سے اپنا منھ پھیر لیتے ہیں، اس کی طرف دھیان نہیں دیتے، اس سے اعراض کرتے ہیں اور بے رخی برتتے ہیں۔

ایک اور آیت پہلے بھی گزر چکی ہے: ﴿إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْؤُولًا﴾ بیشک کان، آنکھ اور دل میں سے ہر ایک کے متعلق اللہ تعالیٰ کے یہاں سوال کیا جائے گا کہ آپ نے اپنے کان سے کوئی حرام اور ناجائز بات کیوں سنی۔ اس لیے کہ جس چیز کا بولنا ناجائز ہے اس کا سننا بھی ناجائز ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جیسے غیبت کرنا ناجائز ہے، اسی طریقہ سے غیبت سننا بھی ناجائز اور حرام ہے۔

ایسی مجالس میں بیٹھنا جائز نہیں ہے

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ وَإِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَى مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ﴾ جو لوگ ہماری آیتوں میں جھگڑا کرتے ہیں اور ان کا انکار کرتے ہیں؛ اے نبی! (اس آیت میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے پوری امت کو خطاب کیا جا رہا ہے) آپ وہاں سے ہٹ جایئے یہاں تک کہ وہ دوسری کسی بات میں مشغول ہو جائیں (جو جائز ہے) اور اگر شیطان آپ کو بھلا دے (یعنی آپ کو دھیان نہ رہے) اور بے خبری و غفلت میں آپ اس مجلس میں شریک ہو جائیں تو جب یاد آ جائے

تو پھر وہاں بیٹھے نہ رہیے (بلکہ فوراً وہاں سے ہٹ جایئے)۔

اسی آیت کی وجہ سے حضراتِ علماء فرماتے ہیں کہ ہر وہ مجلس جہاں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہورہی ہو، وہاں بیٹھنا جائز نہیں، اور اگر بھول سے بیٹھ گئے ہو تو یاد آنے کے بعد وہاں بیٹھے رہنا جائز نہیں ہے۔ مثلاً: گانا بجانا ہورہا ہو، یا غیبت ہورہی ہو، یا کسی پر تہمت بازی ہورہی ہو، یا کسی کا مذاق اڑایا جارہا ہو، یا کسی کی آبرو ریزی ہورہی ہو، ٹی وی اور ویڈیو دیکھا جارہا ہو؛ مطلب یہ ہے کہ جس مجلس میں ایسا کوئی بھی کام ہورہا ہو جس کی شریعت کے اندر ممانعت ہے، تو وہاں بیٹھنا جائز نہیں ہے۔

اس کے چہرہ کو آگ سے دُور رکھا جائے گا

۱۵۲۸:-وعن أَبي الدرداء رضي الله عنه عن النبيِّ ﷺ قَالَ: ((مَنْ رَدَّ عَنْ عِرْضِ أخيهِ، رَدَّ اللهُ عَنْ وَجْهِهِ النَّارَ يَوْمَ القِيَامَةِ)).

(رواه الترمذي، وقال: حديث حسن)

ترجمہ:- حضرت ابو الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو اپنے مسلمان بھائی کی عزت کی طرف سے دفاع کرے گا (مثلاً: کسی نے اس پر تہمت لگائی تو اس نے اس کی طرف سے دفاع اور ڈفینس کیا) تو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کے چہرہ سے آگ کو دور کردے گا۔

افادات:- گویا آپ نے دنیا میں اپنے بھائی کی طرف سے دفاع کیا تھا، اس کی آبرو کی حفاظت کی تھی؛ تو اللہ تعالیٰ آپ کے چہرے کو جہنم کی آگ سے بچائیں گے۔ یہ نیکی کا کتنا بڑا کام ہے! آج کل یہ ہوتا ہے کہ بعض لوگ کسی کے متعلق کوئی بات کہتے ہیں اور سننے والا یہ جانتا ہے کہ سامنے والا جو بات کہہ رہا ہے وہ بالکل غلط ہے، تب

بھی اس کی تردید نہیں کی جاتی، بلکہ چپ رہتے ہیں اور خاموشی سے اس کو ہضم کر لیتے ہیں۔

چپ چاپ سنتے رہے

حضرت میمون بن مہرانؒ ایک تابعی اور بڑے بزرگ گزرے ہیں، وہ فرماتے تھے کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک حبشی کی لاش میرے سامنے پیش کی گئی اور مجھ سے کہا گیا کہ اس میں سے کھاؤ۔ میں نے اس سے گھن کی اور کہا کہ مجھے کیوں کہہ رہے ہو؟ تو مجھ سے کہا گیا کہ تم یہ کھا چکے ہو۔ میں نے کہا: میں نے اس کو کب اور کہاں کھایا؟ بتلایا گیا کہ فلاں حبشی غلام کی غیبت کی جارہی تھی اور تم وہیں بیٹھے تھے۔ میں نے کہا: میں نے تو اس میں حصہ نہیں لیا تھا، تو مجھے بتلایا گیا کہ آپ چپ چاپ سنتے رہے، اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں دیا۔ معلوم ہوا کہ غیبت سننا اور اس کی طرف سے دفاع نہ کرنا بھی بڑا گناہ ہے، اس سے بھی اپنے آپ کو بچانا چاہیے۔

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ڈفینس کیا

۱۵۲۹:-وعن عِتبَانَ بنِ مَالِكٍ - رضی الله عنه - ، فی حدیثه الطویل المشهور الَّذِی تقدَّمَ فی بابِ الرَّجاء قَالَ: قام النبیّ ﷺ یُصَلِّی فَقَالَ: ((أَیْنَ مالِكُ بنُ الدُّخْشُمِ؟)) فَقَالَ رَجُلٌ: ذَٰلِكَ مُنَافِقٌ لا یُحِبُّ اللهَ ولا رَسُولهُ، فَقَالَ النبیّ ﷺ: ((لاَ تَقُلْ ذَٰلِكَ، أَلاَ تَرَاهُ قَدْ قَالَ: لا إلٰهَ إلاَّ اللهُ یُرِیدُ بِذَٰلِكَ وَجْهَ اللهِ! وإنَّ اللهَ قَدْ حَرَّمَ عَلَى النَّارِ مَنْ قَالَ: لا إلٰهَ إلاَّ اللهُ یَبْتَغِی بِذَٰلِكَ وَجْهَ اللهِ)).

(متفق عَلَیْهِ)

((وَعِتْبان)) بکسر العین عَلَى المشهور وحُكِیَ ضَمُّها وبعدها تاءٌ مثناة من فوق ثُمَّ باءٌ موحدة و((الدُّخْشُم)) بضم الدال وإسكان الخاء وضم الشین المعجمتین.

ترجمہ مع تشریح: حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک لمبی روایت پہلے بھی گزر چکی ہے (واقعہ یہ ہوا کہ حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک صحابی تھے جن کی آنکھوں کی بینائی میں کچھ کمزوری آ گئی تھی تو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ: آپ کسی روز موقعہ نکال کر میرے گھر تشریف لائیں، چوں کہ میری آنکھوں میں کمزوری آ گئی ہے، اس لیے جب اندھیرا ہوتا ہے، یا بارش ہوتی ہے؛ تو میں مسجد کی جماعت میں حاضر نہیں ہوسکتا، مَیں چاہتا ہوں کہ اپنے گھر میں نماز کے لئے کوئی جگہ مخصوص کرلوں، لہٰذا آپ تشریف لاکر وہاں دو رکعت نماز ادا فرما دیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ٹھیک ہے، کسی دن آجائیں گے۔ چناں چہ دوسرے یا تیسرے ہی روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے گھر تشریف لے گئے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری کا جب محلہ میں پتہ چلا تو محلے کے بہت سارے لوگ جمع ہو گئے، جیسے کوئی بزرگ ہمارے محلہ میں تشریف لاتے ہیں اور لوگوں کو پتہ چلتا ہے کہ فلاں صاحب کے یہاں فلاں بزرگ آئے ہوئے ہیں تو بہت سے لوگ ملاقات کے لئے پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری کی مناسبت سے آپ کے سامنے پیش کرنے کے لئے انہوں نے کچھ پکایا تھا، جب محلے کے لوگ آکر بیٹھے، گفتگو اور باتیں ہو رہی تھیں اور دیکھا جا رہا تھا کہ کون کون آیا ہے۔ حضرت مالک بن دُخشم رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اسی محلے کے رہنے والے تھے، اتفاق کی بات کہ وہ اس مجلس میں حاضر نہیں تھے تو) حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے متعلق کسی سے پوچھا: مالک بن دُخشم نظر نہیں آتے ؛ کہاں ہیں؟ اس پر ایک آدمی کو بولنے کا موقع مل گیا، کہنے لگا: وہ تو منافق آدمی ہے، اللہ اور اس کے رسول سے اس کو محبت ہی کہاں ہے؟ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایسا مت کہو، تمہیں معلوم نہیں کہ اس نے سچے دل سے لا الٰہ الا اللہ پڑھا ہے، اور جو آدمی سچے دل سے لا الٰہ الا اللہ پڑھتا ہے؛ اللہ تعالیٰ اس کو جہنم کے

اوپر حرام کردیتے ہیں۔

افادات:-دیکھئے! یہاں ایک آدمی نے جب مالک بن دُخشم کے متعلق نامناسب بات کہی تو نبیٔ کریم ﷺ نے فوراً ان کی طرف سے ڈفینس کیا۔اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی آدمی کسی مسلمان کے متعلق ایسی کوئی بات سنے تو فوراً اس کی طرف سے دفاع کرنا چاہیے۔

تم نے بہت غلط بات کہی

۱۵۳۰:-وعن كعب بن مالك- رضى الله عنه - فى حديثه الطويل فى قصةِ تَوْبَتِـهِ وَقَـدْ سبق فى باب التَّوبـةِ. قَالَ : قَالَ النـبىُّ ﷺ وَهُوَ جالِسٌ فى القَومِ بِتَبُوكَ: ((مَا فَعَلَ كَعبُ بن مالكٍ؟))فَقَالَ رَجلٌ مِنْ بَنِي سَلمَةَ: يَارسولَ الله، حَبَسَهُ بُرْدَاهُ والنَّظَرُ فى عِطْفَيـهِ. فَقَالَ لَهُ مُعاذُ بنُ جبلٍ - رضى الله عنه - : بِئْسَ مَا قُلْتَ، والله يَارسولَ الله! مَا علمنا عَلَيْهِ إلاَّ خَيْراً، فَسَكَتَ رسُولُ الله ﷺ.(متفقٌ عَلَيْهِ) ((عِطْفَاهُ)): جَانِبَاهُ،وهو إشارةٌ إلى إعجابِهِ بنفسِهِ.

ترجمہ مع تشریح:-حضرت کعب بن مالک کی لمبی روایت جوان کی توبہ کے سلسلہ میں (پہلی جلد میں) آچکی ہے اسی موقعہ کا یہ واقعہ بھی ہے (حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ غزوۂ تبوک میں شریک نہیں ہوسکے تھے، حالاں کہ ان کے پاس غزوہ میں شریک ہونے کے لئے سواری واسباب موجود تھے،لیکن ''آج جاتا ہوں،کل چلا جاؤں گا'' کے خیال سے ان سے سُستی ہوگئی اور نہیں جا پائے یہاں تک کہ شرکت کا موقعہ ہاتھ سے نکل گیا۔حضرت کعب بن مالک ؓ خود فرماتے ہیں کہ میں یوں سمجھتا تھا کہ جب تک حضور ﷺ پر وحی نہیں آئے گی آپ کو میری غیر حاضری کا پتہ نہیں چلے گا، اس لیے کہ

بہت بڑا مجمع تھا۔ ایک روایت کے مطابق اس لشکر کے اندر صحابہ کی تعداد ساٹھ ہزار اور ایک روایت کے مطابق پچاس ہزار تھی، اس لیے میرا نہ جانا بھی چھپا رہے گا، الّا یہ کہ وحی آجائے۔ بہر حال! انہوں نے بعد میں تحقیق کی کہ میرے متعلق حضور نے پورے سفر میں کوئی تذکرہ تو نہیں کیا۔ بتلایا گیا کہ جب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تبوک پہنچ گئے اور آپ کا وہاں چند روز قیام رہا، اسی پڑاؤ کے زمانہ میں) ایک دن نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مجلس لگی ہوئی تھی اور آپ کو یاد آگیا تو آپ نے پوچھا: کیا بات ہے کہ کعب بن مالک نظر نہیں آتے؟ انہی کے قبیلہ بنو سلمہ کے ایک آدمی نے کہا: یارسول اللہ! اس کو اپنی چادروں پر خود پسندی نے روک رکھا ہے (بعض لوگ اچھے لباس کی وجہ سے عجب میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ میرے جیسا اچھا لباس پہننے والا اور کوئی نہیں۔ گویا اس آدمی نے ان پر ایک فقرہ کستے ہوئے یہ جملہ کہا کہ وہ اپنی خود پسندی میں ایسا پھنسا ہوا ہے کہ اس کو یہاں آنے کی فرصت نہیں ملی) جب اُس آدمی نے یہ بات کہی تو حضرت معاذ رضی اللہ تعالٰی عنہ نے (جو اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے) فوراً کہا: تم نے بہت غلط بات کہی۔ اے اللہ کے رسول! ہم کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے متعلق اچھا ہی گمان رکھتے ہیں (یعنی یہ آدمی ان کے متعلق جو کہہ رہا ہے کہ وہ خود پسندی میں مبتلا ہیں؛ یہ بات درست نہیں ہے۔ گویا حضرت معاذ رضی اللہ تعالٰی عنہ نے اس آدمی کی تردید کی) اس تردید پر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خاموش رہے (گویا آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خاموشی کے ذریعہ حضرت معاذ رضی اللہ تعالٰی عنہ کی تائید فرمائی)۔

افادات:۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی کے سامنے اگر کسی مسلمان کی برائی کی جائے تو سننے والوں کا فریضہ اور ذمہ داری ہے کہ اس کی طرف سے دفاع کریں۔ شریعت کا ہمیں یہ حکم ہے کہ اگر وہ بات غلط ہو تو فوراً اس کی تردید کریں۔ اور اگر تردید کی طاقت نہ ہو تو وہاں سے اُٹھ جائیں۔ وہیں چپ چاپ بیٹھ کر باتوں کو سنتے رہنا گویا اس میں شریک ہونا ہے۔

باب بیان مایباح من الغیبة

کن صورتوں میں غیبت کی اجازت ہے؟

زبان کی حفاظت سے متعلق بیان چل رہا تھا اسی سلسلہ میں آج ایک نیا عنوان قائم کرر ہے ہیں: ’’باب بیان مایباح من الغیبة‘‘ اس باب میں احادیث کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ بعض سورتیں ایسی ہیں جن میں غیبت کی اجازت دی گئی ہے، اب وہ کون کون سی صورتیں ہیں اور کب گنجائش اور اجازت ہے؟ اسی کو آگے بیان کیا ہے۔

غیبت کی اجازت کے چھ سبب ہیں

’’إِعْلَمْ أَنَّ الْغِيْبَةَ تُبَاحُ لِغَرَضٍ صَحِيحٍ شَرْعِيٍّ لَا يُمْكِنُ الوُصُولُ إِلَيْهِ إِلاَّ بِهَا، وَهُوَ سِتَّةُ أَسْبَابٍ،، اگر کوئی صحیح شرعی غرض اور سبب ایسا موجود ہو کہ غیبت کے بغیر اس مقصود کو حاصل کرنا ممکن ہی نہ ہو، تو اس صورت میں غیبت کی اجازت دی گئی ہے، اور جن کی بنیاد پر غیبت کو درست قرار دیا گیا ہے ایسے اسباب کل چھ ہیں۔

پہلا سبب: فریادرسی

الأَوَّلُ: التَّظَلُّمُ، فَيَجُوزُ لِلمَظْلُومِ أَنْ يَتَظَلَّمَ إِلَى السُّلْطَانِ والْقَاضِي وغَيرِهِما مِمَّنْ لَهُ وِلاَيَةٌ، أَوْ قُدْرَةٌ عَلَى إِنْصَافِهِ من ظَالمه، فيقول: ظَلَمَنِي فُلاَنٌ بكذا.

پہلا سبب ''اَلتَّظَلُّمُ ''یعنی دادرسی اور فریادرسی۔کسی پر ظلم ہوا، اس کا حق مارا گیا، اس پر کسی بھی قسم کی جانی، مالی، یا عزت وآبرو کے اعتبار سے زیادتی کی گئی، تو اب اس مظلوم کو اس بات کی اجازت ہے کہ اپنے اوپر ہوئے ظلم وزیادتی کو دور کرنے کے لئے اور انصاف چاہنے کے لئے حاکم، بادشاہ یا قاضی کے سامنے، یا ایسے حضرات جو معاشرہ اور سماج میں قدرت والے اور صاحبِ اختیار ہیں جن کے پاس کچھ پاورس (Powers) ہیں اور وہ اس ظالم سے اس کا حق دلوا سکتے ہیں ان کے سامنے جا کر فریاد کرے، اور ظاہر ہے کہ جب ان کے سامنے حالات پیش کرے گا تو اس کو کہنا پڑے گا کہ فلاں نے میری زمین لے لی، میرے پیسے لے لیے، میرے ساتھ اس طرح زیادتی کی، میری عزت وآبرو کو مجروح کیا؛ یہ ساری باتیں جو پیش کی جائیں گی وہ غیبت شمار نہیں ہوں گی۔ہاں! یہی سب باتیں اگر آپ دوسروں کے سامنے بیان کرتے ہیں تب تو وہ غیبت ہے، لیکن اگر حاکم کے سامنے اس بات کو اس لیے پیش کر رہے ہیں کہ حاکم اس سے آپ کا حق دلوانے کی طاقت رکھتا ہے اور ظلم کو دور کرسکتا ہے؛ تو یہ ایک مقصود ہے کہ اپنا حق وصول کرنے کے لئے حاکم کے سامنے حالات کو پیش کیا جائے، تاکہ اس کے ذریعہ اپنا حق وصول کیا جاسکے، اور جس نے آپ کی حق تلفی کی ہے اور آپ کا حق دبالیا ہے، آپ کے ساتھ ظلم وزیادتی کا معاملہ کیا ہے، اس ظلم وزیادتی کو دور کیا جائے؛ تو اس کی اجازت ہے۔یہ پہلا سبب ہے جس کی وجہ سے غیبت کی اجازت ہے۔

دوسرا سبب؛ گناہ سے روکنا

الثَّانی: الاستِعانَةُ عَلَی تَغْیِیرِ المُنْکَرِ، وَرَدِّ العَاصِی إلَی الصَّوابِ، فیقولُ لِمَنْ یَرْجُو قُدْرَتَهُ عَلَی إزالَةِ المُنْکَرِ: فُلانٌ یَعْمَلُ کَذا، فازْجُرْهُ عَنْهُ

ونحو ذٰلِكَ ویکونُ مَقْصُودُهُ التَّوَصُّلُ إِلَى إِزالَةِ المُنْكَرِ ،فَإِنْ لَمْ يَقْصِدْ ذٰلِكَ كَانَ حَرَاماً.

دوسری صورت جس میں غیبت کی اجازت دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ایک آدمی کسی گناہ اور معصیت میں مبتلا ہے، اس کو اس گناہ سے روکنے اور باز رکھنے کے لیے کسی سے مدد طلب کی جائے، تاکہ وہ اس گناہ اور معصیت سے روک دے۔ مثلاً: کسی کا بیٹا سینما دیکھتا ہے، اور ظاہر ہے کہ سینما دیکھنا حرام کام ہے، اب کوئی آدمی اس کے باپ کو شکایت کرے کہ تمہارا بیٹا سینما دیکھتا ہے، تو اس کا مقصد یہ ہے کہ باپ اپنے بیٹے کو یہ گناہ کرنے نہ دے، اس گناہ سے روکے۔ اب کوئی آدمی اس شکایت کرنے والے سے یوں کہے کہ: تم نے تو باپ کے سامنے جاکر بیٹے کی غیبت کی، اور غیبت کرنا حرام ہے، تو اس سے کہا جائے گا کہ: جی ہاں؛ یہ غیبت ہی ہے، لیکن صحیح مقصد کے لیے اس کی اجازت ہے۔

اسی طرح کسی گنہ گار کو صحیح راہ پر لانے کے لئے اس کے حالات کسی کے سامنے پیش کرنا، تاکہ وہ اس کو اس گناہ سے دور رکھنے میں مددگار بنے۔ جیسے: باپ کے سامنے بیٹے کی، استاذ کے سامنے شاگرد کی، حاکم کے سامنے محکوم کی، بڑے کے سامنے اس کے چھوٹے کی، یا ذمہ دار اور تربیت کرنے والے کے سامنے اس کے ماتحت کی شکایت کرنا کہ وہ فلاں فلاں غلط کام کر رہا ہے۔ اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اس کا بڑا اس کو اس برائی سے روکے، ان باتوں کے پہنچانے والے کا مقصد یہی ہو کہ وہ برائی ختم ہو جائے، اس کی سینما دیکھنے کی عادت چھوٹ جائے، اگر جوا کھیل رہا ہے، شراب پیتا ہے تو وہ ان عادتوں سے باز آجائے، اسی لیے اس کی باتیں اوپر تک پہنچا رہا ہے؛ تب تو اس کا شکایت پہنچانا جائز اور درست ہے۔

اور اگر باپ تک بیٹے کی، یا استاد تک شاگرد کی، یا اوپر والے تک نیچے والے کی شکایت پہنچانے والے کا مقصد اس برائی کو دور کرنا نہیں ہے، بلکہ نیت یہ ہے کہ اس بہانے سے اس کو لوگوں کے سامنے اور زیادہ رُسوا کیا جائے، باپ سے کہتا ہے کہ تمہارا بیٹا ایسا کرر ہا ہے، تم اپنے بیٹے کو روکتے نہیں؟ لوگوں کے سامنے باپ سے اس کے بیٹے کے متعلق اس طرح کہنا ہی علامت ہے کہ اس کی نیت اصلاح کی نہیں ہے، بلکہ رسوا کرنے کی ہے۔ اس لیے کہ باپ سے اگر یہی بات کہنی تھی تو تنہائی میں بھی کہہ سکتا تھا، لیکن اس کا مقصد بیٹے کو اس برائی سے روکنا نہیں ہے؛ بلکہ سارے لوگوں کے سامنے باپ کو شرمندہ کرنا ہے اور بیٹے کو بھی رُسوا کرنا ہے، اس وجہ سے یہ گناہ ہے۔

تیسرا سبب: مسئلہ دریافت کرنا

الثَّالِثُ: الاسْتِفْتَاءُ، فيقُولُ لِلمُفْتِي: ظَلَمَنِي أَبِي أَوْ أخي، أَوْ زوجي، أَوْ فُلانٌ بكَذَا فَهَلْ لَهُ ذَلِكَ؟ وَمَا طريقي في الخلاصِ مِنْهُ، وتَحْصِيلِ حَقِّي، وَدَفْعِ الظُّلْمِ؟ وَنَحْو ذَلِكَ، فهذا جَائِزٌ لِلْحَاجَةِ، ولكِنَّ الأحوطَ والأفضَلَ أنْ يقول: مَا تقولُ في رَجُلٍ أَوْ شَخْصٍ، أَوْ زَوْجٍ، كَانَ مِنْ أَمْرِهِ كذا؟ فَإِنَّهُ يَحْصُلُ بِهِ الغَرَضُ مِنْ غَيرِ تَعْيِينٍ، وَمَعَ ذَلِكَ، فالتَّعْيِينُ جَائِزٌ كَمَا سَنَذْكُرُهُ في حَدِيثِ هِنْدٍ إنْ شَاءَ اللهُ تَعَالَى.

تیسری صورت جس میں غیبت کو درست اور جائز قرار دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ: آدمی اپنے حالات کے متعلق کسی مفتی صاحب سے مسئلہ پوچھے کہ مثلاً: میرے باپ یا بھائی نے میرے ساتھ یہ زیادتی کی ہے، یا شوہر نے بیوی کے ساتھ زیادتی کی، اس کی پٹائی کردی، یا اس کا کوئی حق نہیں ادا کیا، اب بیوی مفتی صاحب سے سوال کرتی ہے کہ

میرے شوہر نے میرے ساتھ ایسا معاملہ کیا ہے؟ اس کا یہ معاملہ کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ اگر درست نہیں ہے تو میں اپنے آپ کو اس کے ظلم سے کس طرح بچا سکتی ہوں؟ میرے لئے کیا تدبیر ہے؟ آپ مجھے کیا ہدایت دیتے ہیں؟ میرا شوہر میرے ساتھ ایسا کرتا ہے؛ تو شرعاً وہ گنہ گار ہے یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے کیا وعیدیں ہیں؟ اور بیوی کے اس پوچھنے کا مقصد یہ ہے کہ شوہر اپنی اس حرکت سے باز آ جائے۔

یا کوئی آدمی سوال کرے کہ: فلاں نے میرے ساتھ یہ معاملہ کیا تو کیا اس کے لئے میرے ساتھ ایسا معاملہ کرنا جائز اور درست تھا؟ ذرا بتلایئے کہ میرے لئے اب اس سے بچنے کی کیا شکل ہے؟ میرے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہے اس کو میں کیسے دور کر سکتا ہوں؟ شرعی حدود میں رہ کر میں ایسی کونسی تدبیر اختیار کروں کہ اس سے اپنا حق وصول کر لوں؟

مطلب یہ ہے کہ کسی کے ساتھ جو ظلم و زیادتی ہوئی ہو، اس کا شرعی حکم دریافت کرنے کے لئے، یا کسی سے اپنا حق وصول کرنے کے لئے، یا اپنے اوپر ہونے والے ظلم کو دور کرنے کے لئے، یا جو آدمی زیادتی کر رہا ہے اس پر کیا وعیدات ہیں ان کو معلوم کرنے کے لئے اگر کوئی آدمی کسی مفتی صاحب سے جب اس طرح کا سوال کرے گا تو ظاہر ہے کہ سامنے والے کے حالات بیان کرنے ہی پڑیں گے، تو اسی کا حکم بتلایا کہ ضرورت کی وجہ سے یہ جائز اور درست ہے، یہ غیبت میں شمار نہیں ہوگا۔

لیکن اس میں بھی احتیاط کا تقاضا یہ ہے اور بہتر شکل یہ ہے کہ کھلم کھلا کہنے کی بجائے ذرا مبہم الفاظ میں کہے تو بہتر ہے، مثلاً: ''میرے باپ نے میرے ساتھ یوں کیا'' کہنے کی بجائے یوں کہے کہ ''ایک باپ اپنے بیٹے کے ساتھ ایسا کر رہا ہے'' اس کے لئے کیا حکم ہے؟ ''ایک بھائی اپنے بھائی کے ساتھ یہ معاملہ کر رہا ہے'' شرعاً اس کا کیا

حکم ہے؟ اگر یوں کہے کہ ''ایسے آدمی کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ یوں کرتا ہو؟ ایسے آدمی کے متعلق شریعت کیا کہتی ہے جو اپنے بیٹے کے ساتھ یوں زیادتی کرتا ہو؟ ایسے آدمی کے لئے شریعت کا کیا حکم ہے جو اپنے بھائی کے ساتھ یہ معاملہ کرتا ہو؟ تو اس صورت میں ایک عام بات پوچھی جارہی ہے، اور وہ شخصیت کون ہے اس کو سامنے لائے بغیر بھی پوچھنے والے کا مقصود حاصل ہو جائے گا۔ اب اگر چہ احتیاط یہی ہے کہ کھلم کھلا نام نہ لیا جائے اس کے باوجود اگر کوئی آدمی اپنے بھائی، باپ کا نام لیتا ہے، یا بیوی اپنے شوہر کا کھلم کھلا نام لیتی ہے؛ تب بھی جائز ہے۔

چوتھا سبب: مسلمانوں کو کسی نقصان سے بچانا اور اس کی مختلف شکلیں

الرَّابِعُ: تَحْذِيرُ الْمُسْلِمِينَ مِنَ الشَّرِّ وَنَصِيحَتُهُمْ، وَذٰلِكَ مِنْ وُجُوهٍ:

چوتھا سبب جس میں غیبت کی اجازت ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی پوری جماعت یا کوئی فرد کسی کی طرف سے کسی برائی میں مبتلا ہو سکتے ہیں؛ تو اس فرد کو یا اس شخصیت کو یا اس جماعت کو اس برائی اور نقصان میں پڑنے سے بچانے کے لئے کسی کا حال بتلا یا دیا جائے (تفصیل آگے آرہی ہے) یا کسی کی خیر خواہی اور بھلائی چاہنے کے مقصد سے کسی کا حال بیان کیا جائے تو اس کی اجازت ہے۔ چناں چہ اس کی کئی شکلیں ہیں جن کو الگ الگ بیان کرتے ہیں۔

پہلی شکل: جرح وتعدیلِ رواۃ

مِنْهَا: جَرْحُ الْمَجْرُوحِينَ مِنَ الرُّوَاةِ والشُّهُودِ، وذٰلِكَ جَائِزٌ بِإِجْمَاعِ

الْمُسْلِمِیْنَ، بَلْ وَاجِبٌ لِلْحَاجَةِ.

پہلی شکل کو سمجھنے کے لیے کچھ تفصیل سنئے۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات اور احادیث کے سلسلہ کو امت تک پہنچانے کے لیے بیچ میں کچھ واسطے آتے ہیں، یعنی نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک بات کسی صحابی نے سنی، ان سے دوسرے نے سنی، ان سے ان کے شاگرد نے، پھر ان سے ان کے شاگرد نے سنی، اس طرح واسطہ در واسطہ وہ بات ہم تک پہنچی، بیچ میں کہیں پانچ دس آدمی آئے، جن کو حدیث نقل کرنے والے کہا جاتا ہے، اب حضراتِ محدثین نے حدیث کی حفاظت کی خاطر ان افراد کی چھان بین کی تاکہ کوئی آدمی کوئی بھی غلط بات نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب نہ کردے، چوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو بات نہیں کہی، اس کو یوں کہہ کر بیان کرنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی ہے اس پر بڑی سخت وعید ہے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّداً فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ'' جو آدمی مجھ پر قصداً جھوٹ باندھے اس کو چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنالے۔ اسی لیے حدیث بیان کرنے کے معاملہ میں حضراتِ علماء بہت احتیاط فرماتے ہیں بلکہ بعض حضراتِ صحابہ جنھوں نے براہِ راست نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ مبارک سے باتیں سنی تھیں، وہ بھی کبھی کبھی جب حدیث بیان کرتے تھے تو یوں نہیں کہتے تھے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا ہے، بلکہ احتیاط کے طور پر یہاں تک فرماتے تھے کہ یوں فرمایا، یا اس جیسا، یا اس کے قریب قریب ارشاد فرمایا ہے۔

بہرحال! کوئی بات حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں کہی پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف اس کی نسبت کرنا بڑی خطرناک چیز ہے۔ تو جھوٹی باتوں کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب ہونے سے بچانے کے لیے محدثین نے بڑی محنتیں کی ہیں کہ جو لوگ بیچ میں واسطہ بن

رہے ہیں؛ وہ کیسے ہیں؟ آیا سچے لوگ ہیں، یا اپنے دنیوی معاملات میں جھوٹ سے کام لیتے ہیں؟ ایک آدمی لوگوں کے ساتھ جھوٹا معاملہ کرتا ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ اگر ہم سے کوئی بات بیان کرے گا تو ہم اس پر کیسے اعتماد اور بھروسہ کر سکتے ہیں؟ جب وہ دوسری باتوں میں جھوٹ بولتا ہے تو اللہ اور رسول کے معاملہ میں جب کوئی بات کہے گا تو اس پر بھروسہ اور اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ تو حدیث کے نقل کرنے والے راویوں کے متعلق محدثین نے جرح کی، یعنی ان کے اندر جو جو کمزوری تھی اس کو ظاہر کیا کہ یہ آدمی جھوٹ بولتا ہے، یہ آدمی حدیثیں گھڑتا ہے، یا اس آدمی کا حافظہ اتنا مضبوط نہیں ہے، اس کی یادداشت کمزور ہے، اور جب کسی کا حافظہ اور یادداشت ہی کمزور ہو تو وہ دوسروں کی بات پوری پوری بیان نہیں کر سکتا، اس میں اس سے گڑبڑ ہو سکتی ہے، لہٰذا اس نے جو روایت نقل کی ہے اس میں بھی ہو سکتا ہے کہ یادداشت اور حافظہ کے کمزور ہونے کی وجہ سے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے الفاظ کو پورے طور پر بیان نہ کیا ہو۔

بہرحال! جتنے بھی حدیث کے نقل کرنے والے راویوں پر حضراتِ محدثین کی طرف سے جرح کی گئی ہے اور ان کی کمزوریوں کو بیان کیا گیا ہے، اس سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ایک طرح کی غیبت ہے، لیکن چوں کہ یہ دین کا ایک اہم معاملہ ہے، اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نام سے ایک چیز لوگوں کے سامنے پیش کی جا رہی ہے، اگر خدانہ کرے وہ غلط ہوئی تو اس صورت میں پورا دین متاثر ہوتا ہے، اس لیے امت کی خیرخواہی کا تقاضا یہی تھا کہ بات صاف کر دی جائے۔

اسی طرح گواہوں کے متعلق بھی یہی معاملہ ہے۔ ہر زمانہ میں اسلامی حکومت میں قاضی اور جج کی یہ ذمہ داری رہتی ہے کہ جن لوگوں کو گواہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے،

ان کے اندرونی حالات کی باقاعدہ تحقیق کرائے کہ یہ آدمی لوگوں کے ساتھ معاملات اور سچائی میں کیسا ہے؟ اس لیے کہ جب وہ کسی معاملہ میں گواہ بن کر کورٹ میں آرہا ہے تو معلوم ہونا چاہیے کہ اس آدمی کی پوزیشن سماج، معاشرے اور سوسائٹی میں کیا ہے؟ اور اس کو کیا مقام حاصل ہے؟ یہ معلوم کرنا قاضی کی ذمہ داری ہے۔ اس لیے کہ مثلاً کسی نے کسی پر دعویٰ کیا کہ میرا ایسا ایسا معاملہ ہے، اور جب اس سے پوچھا گیا کہ گواہ کون ہے؟ تو بتایا کہ فلاں آدمی ہے، تو اب اگر ایسا آدمی گواہ بن کر کورٹ میں جائے جس کی بات پر کوئی بھی اعتماد نہیں کرتا، سماج میں اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے، سوسائٹی میں اس کی بات کا کوئی اعتبار ہی نہیں کیا جاتا، اور ساری دنیا جانتی ہے کہ یہ جھوٹ بولتا ہے، اور اس کے معاملات ٹھیک نہیں ہیں؛ تو پھر ایسے آدمی کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہے۔

لہٰذا اسلامی حکومت کا جج قاضی جب گواہوں کے متعلق تحقیق کرے گا تو اس وقت لوگوں کی ذمہ داری ہوگی کہ اس کو بتائیں کہ فلاں آدمی کیسا ہے، اس میں کوئی کمی کمزوری ہو تو اس کو ظاہر کریں، بلکہ حاکم کی طرف سے ذمہ دار اور دیندار قسم کے ایسے لوگ مقرر ہوتے ہیں جو سارے لوگوں کے حالات سے باخبر ہوں، تاکہ جب ایسا کوئی معاملہ پیش آئے تو ان سے پوچھا جائے کہ فلاں آدمی گواہی میں آیا ہے، بتاؤ وہ کیسا ہے؟ اگر وہ کہیں کہ صحیح آدمی نہیں ہے، تو ان کی گواہی کی بنیاد پر اس کی گواہی رد کر دی جائے گی؛ اسی کو تعدیل کہتے ہیں۔

اسی کو اس عبارت میں بتایا ہے کہ گواہ یا راوی کی کمزوری کو ظاہر کرنے پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ جائز ہے۔ اگر اس کو ناجائز کہیں گے تو نہ کوئی فیصلہ صحیح ہو سکے گا نہ کوئی روایت امت تک صحیح پہنچ سکے گی۔ بلکہ ایک اہم ضرورت کی وجہ سے جائز ہی نہیں

بلکہ واجب ہے۔

جس کے متعلق تحقیق کی جائے اوراس کومعلوم ہے کہ اس میں فلاں کمزوری ہےتواب اس کی ذمہ داری ہے کہ اس کمزوری کو بیان کردے، اس کے لئے خاموش رہنا جائز نہیں ہے۔ اگرقاضی کی طرف سے آپ کے پاس تحقیق آئی اورآپ سے پوچھا گیا کہ آپ کے محلے کا فلاں آدمی فلاں مسئلے میں گواہی دینے کے لئے آیا ہے، وہ کیسا ہے؟ اورآپ جانتے ہیں کہ اس میں یہ یہ کمزوری ہےتو آپ کو بتلانا ضروری ہے، اگر آپ نے چھپایا، تو اللہ تعالیٰ کے یہاں آپ کوعذاب دیا جائے گا، اس لیے کہ آپ نے نہیں بتلایا جس کی وجہ سے فیصلہ غلط ہوا۔

بہرحال! ایک شکل تو یہ ہوئی جس میں مسلمانوں کو برائی سے بچانے کے لیے کسی کی غیبت کی اجازت دی گئی ہے۔

سسرالی رشتہ داری

ومنها: الْمُشَاوَرَةُ فی مُصاهَرَةِ إنْسانٍ أو مُشارکتِهِ، أَوْ إیداعِهِ، أَوْ مُعامَلَتِهِ، أَوْ غیرِ ذَلِكَ، أَوْ مُجَاوَرَتِهِ، ویجبُ عَلَى الْمُشَاوِرِ أنْ لا یُخْفِیَ حَالَهُ، بَلْ یَذْکُرُ الْمَسَاوِئَ الَّتی فِیهِ بِنِیَّةِ النَّصیحَةِ.

کسی کو برائی سے بچانے کی اور شکلیں بھی ہیں، ان میں ایک شکل آپسی رشتہ داری کے معاملات کی ہے، مثلاً: ایک آدمی اپنی لڑکی کا رشتہ کسی کے یہاں کرنا چاہتا ہے، وہ آپ کے پاس آیا کہ فلاں لڑکے کا ہماری لڑکی کے واسطے پیغام آیا ہے، آپ مشورہ دیجئے۔ اورآپ جانتے ہیں کہ اس لڑکے کے اندر یہ یہ کمزوریاں ہیں۔ یا لڑکا تو ٹھیک ٹھاک ہے لیکن خاندانی اعتبار سے اس کے گھرانے میں کسی قسم کی کمزوری ہے،

اس کے باوجود آپ چپ رہے، اوران باتوں کو ظاہر نہیں کیا؛ تو اس صورت میں آپ گنہگار ہوں گے۔ اس لیے کہ جب آپ سے مشورہ لیا جارہا ہے، تو آپ کی ذمہ داری ہے کہ جو بھی حقیقت حال ہو وہ بتلادیں کہ میرے نزدیک تمہارا یہ رشتہ مناسب ہے یا نہیں۔ جس سے بھی مشورہ لیا جارہا ہو وہ اس معاملہ میں امانت دار ہے، اور اس کی ذمہ داری ہے کہ صحیح صحیح مشورہ دے۔

موجودہ دَور کی ایک خرابی

ہمارے اس زمانہ میں اس معاملہ میں ایک کمزوری آگئی ہے جس کی طرف میں نشاندہی کرنا چاہتا ہوں کہ جس سے مشورہ لیا جارہا ہے اس کی ذمہ داری ہے کہ حقیقت کو سامنے رکھ کر مشورہ دے، اس کی دیانت کا تقاضا بھی یہی ہے، لیکن بہت سی مرتبہ لوگ ایسے موقعہ پر اپنی دشمنی نکالتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ایسی کوئی برائی نہیں ہے پھر بھی جھوٹ موٹ کہہ دیتے ہیں؛ تو ان کو تو اللہ تعالیٰ کو جواب دینا ہوگا۔ جیسے حقیقت میں کوئی برائی تھی اس کو بیان نہ کرنا گناہ ہے، اسی طرح اگر حقیقت میں کوئی برائی نہ ہو پھر بھی فقط اپنی دشمنی نکالنے کے لیے ایسا کہہ دینا کہ اس میں فلاں برائی ہے، تاکہ اس کے لڑکے کو وہ لڑکی نہ ملے؛ یہ بھی گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں ہر ایک چیز کا جواب دینا ہے۔ دنیا میں تو یہ کہہ کر چھوٹ جائے گا کہ مجھ سے تو مشورہ لیا گیا تھا، اس لیے میری ذمہ داری تھی کہ جو حقیقت حال ہو اس کو بتلادوں، اس لیے میں نے حقیقی بات بتلائی ہے، اس میں کوئی غلط کام نہیں کیا ہے، لیکن اصل معاملہ تو اللہ تعالیٰ جانتا ہے، اور حقیقی معاملہ اسی سے ہے۔

یہ سب فتنوں کے اسباب ہیں

لیکن ایک بات اور بھی ہے، جیسا میں نے اوپر کہا تھا کہ قاضی کی ذمہ داری

ہے کہ گواہوں کے متعلق تحقیق کرے۔تو قدیم زمانہ میں قاضی گواہوں کے متعلق دونوں طریقوں سے تحقیق کراتا تھا، خفیہ طور پر بھی اور کھلم کھلا بھی۔ ظاہراً پوچھا جاتا تھا کہ یہ گواہ بن کر آیا ہے تو کیسا ہے؟ تو وہ تعدیل والا کہتا تھا کہ یہ برابر ہے یا برابر نہیں۔ لیکن بعد میں جب حالات کچھ ایسے ہوئے جس کی وجہ سے اس کے ساتھ لوگ دشمنی رکھنے لگے تو پھر مشائخ نے کھلم کھلا کی جانے والی تعدیل کے متعلق فرمایا کہ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ایسے ہی یہاں پر بھی ہے کہ آپ کی بیٹی کا کوئی پیغام آیا اور آپ نے مشورہ لیا کہ فلاں کے یہاں سے پیغام آیا ہے، آپ کا کیا مشورہ ہے؟ اب جس سے مشورہ لیا گیا اس نے دیانت اور امانتداری کے تقاضے کو پورا کرتے ہوئے جو بات بھی اس کے علم میں تھی اس کے مطابق بتلا دیا کہ دیکھو! وہ لڑکا ذرا آؤٹ لائن ہے۔ یا اس کا فلاں فلاں معاملہ بھی ہے۔اب اس نے تو یہ مشورہ آپ کی خیر خواہی کے طور پر دیا، اور آپ اس پیغام کو رد کر رہے ہیں، تو آپ لوگوں سے یوں نہ کہیں کہ میں نے فلاں صاحب سے مشورہ کیا تھا۔آج کل تو ایسا ہو گیا ہے کہ لوگ اپنے سر سے بلا کو ٹلانے کے لئے یوں کہہ دیتے ہیں کہ میں نے فلاں مولانا صاحب یا مفتی صاحب سے مشورہ کیا تھا، انہوں نے یہ مشورہ دیا؛ یہ طریقہ بالکل غلط ہے۔اسی بنا پر آج کل تو مشورہ دینا اور صحیح بات بتلانا مشکل ہو گیا ہے۔ جیسے: اُس کے لئے بات چھپانا درست نہیں تھا، اِس کے لئے بھی اس بات کو کھولنا جائز نہیں ہے؛ یہ سب فتنوں کے اسباب ہیں۔ ہمارے معاشرے میں بہت سارے جھگڑے ایسی ہی باتوں سے پیدا ہوتے ہیں، اگر آپ اس رشتہ کو قبول کرنا نہیں چاہتے تو مت کیجئے، مگر اُس کو یہ نہ بتائیے کہ میں نے فلاں صاحب سے مشورہ کیا تھا تو اس نے یہ مشورہ دیا۔ بہر حال! یہ سسرالی رشتہ قائم کرنے کے لئے مشورہ کی بات ہوئی۔

یہ بھی غیبت میں شمار نہیں

دوسری بات کسی کے ساتھ پارٹنر شپ کی ہے۔مثلاً ایک آدمی آیا کہ فلاں کے ساتھ میں پارٹنر شپ میں دھندہ کرنا چاہتا ہوں، آپ کیا مشورہ دیتے ہیں؟ پارٹنر شپ کے لئے جس کا نام لیا ہے اس کو آپ خوب اچھی طرح جانتے ہیں، اس کے اندر کے حال سے بھی خوب واقف ہیں کہ اس سے پارٹنر شپ کرنا ٹھیک ہے یا نہیں۔اور آپ معاملہ کو برابر سمجھتے ہیں؛ تو اب آپ کی ذمہ داری ہے کہ اس میں ایسی کوئی کمزوری اور عیب ہو جس کی وجہ سے اس کے ساتھ شرکت اور پارٹنر شپ کرنا ٹھیک نہیں ہے، اور اگر یہ اس کے ساتھ پارٹنر شپ کرلے گا تو بے چارہ بہت پریشان ہوگا اور روئے گا؛ تو اس صورت میں اس سے کہہ دیں کہ: دیکھو بھائی! صحیح بات یہ ہے کہ اس کے ساتھ پارٹنر شپ کا معاملہ کرنا مناسب نہیں ہے۔اس کو غیبت میں شمار نہیں کیا گیا ہے۔ایسا کہنا جائز بلکہ بعض حالات میں ضروری ہے۔

ایک شکل یہ ہے کہ کوئی آدمی آپ کے پاس آیا اور کہا کہ: میں باہر ملک جارہا ہوں، مجھے اپنے پیسے یا فلاں چیز امانت رکھنی ہے، مَیں اپنا گھر فلاں صاحب کو سونپ کر جانا چاہتا ہوں، اور میرا سب کاروبار بھی ان کے ہاتھ میں دینا چاہتا ہوں، اب آپ جانتے ہیں کہ ان کا حال کیسا ہے؟ سارے لوگوں کے سامنے ان کا وہ حال کھلا ہوا نہیں ہے، لیکن آپ کو معلوم ہے؛ تو اس صورت میں آپ کے لیے ضروری ہے کہ اس کو برائی اور نقصان سے بچانے کے لئے صحیح مشورہ دیں، چاہے تفصیل بیان نہ کریں، مختصراً ہی کہہ دیجئے۔

دارومدار نیت پر ہے

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ آپ کے خاموش رہنے کی صورت میں کسی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے تو اس کو نقصان سے بچانے کے لئے اس کی خیر خواہی کے طور پر اگر آپ کوئی بات ظاہر کرتے ہیں، تو دل کی نیت سے تو اللہ تعالیٰ واقف ہے، سارا معاملہ اللہ تعالیٰ سے ہے، وہاں جواب دینا ہے، اگر آپ واقعۃً صحیح نیت سے یہ بات کہہ رہے ہیں تو اس صورت میں جائز ہے۔

یا کسی کے پڑوس کا کوئی مکان بک رہا ہے، اور کوئی آدمی آیا کہ میں خریدنا چاہتا ہوں، میرے لیے لینا مناسب ہے یا نہیں؟ اب اگر آپ مناسب نہیں سمجھتے تو بتلا دیجئے کہ پڑوسی میں یہ کمزوری ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ جس سے مشورہ لیا جا رہا ہے اس کے اوپر واجب اور ضروری ہے کہ اس کے سامنے جو حالات ہوں ان میں سے کسی چیز کو نہ چھپائے، بلکہ خیر خواہی کی نیت سے واضح کر دے۔ اس کی نیت برائی ظاہر کرنے کی نہ ہو۔ بلکہ نیت یہ ہو کہ میرے پاس یہ جو پوچھنے کے لئے آیا ہے اس کی بھلائی اسی میں ہے۔

نیت بدل جائے گی تو حکم بدل جائے گا

دیکھو! نیت بدل جائے گی تو حکم بدل جائے گا۔ آپ اس کی بھلائی چاہنے کے لئے نہیں بلکہ اس کی برائی کرنا ہی چاہتے تھے اور یہ پوچھنے آیا تو آپ کو موقع مل گیا اور آپ نے اس کو خوب برا بھلا کہا کہ: وہ تو ایسا ہے، اور ویسا ہے۔ یہ کہتے ہوئے آپ کی نیت اس کی برائی کرنا ہے، آپ کی نیت سامنے والے کی بھلائی چاہنا نہیں ہے؛ تو گناہ

اور حرام ہے، اور اگر مشورہ لینے آنے والے کی بھلائی چاہنے کی نیت سے وہی بات کہیں گے تو وہ کہنا واجب اور ضروری ہے۔

علمی یا عملی عقیدہ کی حفاظت کی خاطر

ومنها: إِذَا رأى مُتَفَقِّهاً يَتَرَدَّدُ إِلَى مُبْتَدِعٍ، أَوْ فَاسِقٍ يَأْخُذُ عَنْهُ الْعِلْمَ وخَافَ أَنْ يَتَضَرَّرَ الْمُتَفَقِّهُ بِذٰلِكَ، فَعَلَيْهِ نَصِيحَتُهُ بِبَيَانِ حَالِهِ، بِشَرْطِ أَنْ يَقْصِدَ النَّصِيحَةَ.

کوئی طالب علم یا دین سیکھنے والا دین سیکھنے کے لئے کسی کے پاس جا رہا ہے، اور جس کے پاس جا رہا ہے وہ بدعتی، یا فاسق اور بدکار آدمی ہے، اب اس طالب علم کو تو اس کا اندرونی حال معلوم نہیں ہے، لیکن آپ کو معلوم ہے۔ یا آپ کو اس بات کا ڈر ہے کہ اگر یہ اس کی صحبت میں رہے گا تو نقصان اٹھائے گا، تو اگر وہ پوچھنے نہ بھی آیا ہو تب بھی آپ کی ذمہ داری تھی کہ اس کو حالات سے آگاہ کر دیتے۔

دیکھو! پہلی صورت میں تو مسئلہ یہ تھا کہ سامنے والا مشورہ لینے کے لیے آیا تھا، لیکن یہاں وہ آپ سے پوچھنے نہیں آیا ہے، لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ علم اور دین سیکھنے کے لئے کسی پاس آتا جاتا ہے، تو اب اس کی خیر خواہی اسی میں ہے کہ اس کے حالات بیان بتا دیئے جائیں۔ بس! یہاں پر بھی وہی نیت کا مسئلہ نہایت ضروری ہے کہ اس کی نیت سامنے والے کی برائی نہ ہو، بلکہ نیت اس کی بھلائی چاہنا ہو۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ

وَهٰذَا مِمَّا يُغْلَطُ فِيهِ. وَقَدْ يَحْمِلُ الْمُتَكَلِّمَ بِذٰلِكَ الْحَسَدُ، وَيُلَبِّسُ

الشَّيطانُ عَلَيۡهِ ذٰلِكَ، ويُخَيِّلُ إِلَيۡهِ أَنَّهُ نَصِيحَةٌ فَلۡيُتَفَطَّنۡ لِذٰلِكَ.

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ایک ایسی بات ہے جس میں بہت سی مرتبہ غلطی ہوجاتی ہے۔ وہ کیسے؟ بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ یہ جس کے یہاں لوگ جاتے ہیں اُس پر اِس کو حسد ہے، اور اِس کے دل میں یہ ہے کہ یہ لوگ اُس کے یہاں کیوں جاتے ہیں؟ میرے پاس کیوں نہیں آتے، اس لیے یوں کہتا ہے کہ اُس میں تو فلاں فلاں کمزوریاں ہیں، وہاں مت جاؤ۔ اب دیکھو! یہاں خیر خواہی نہیں ہے، بلکہ اصل میں تو حسد کا جذبہ کام کررہا ہے جو اِس کے دل کے اندر چھپا ہوا ہے، لیکن اس کو اوپر سے عنوان یہ دیا جارہا ہے کہ میں تمہاری بھلائی چاہتا ہوں۔ تو کبھی شیطان ایسی غلط فہمی میں ڈال دیتا ہے۔ کہنے کا حاصل یہ ہے کہ ایسے معاملات میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

یہ بھی غیبت نہیں

وَمِنها: أَنۡ يكونَ لَهُ وِلايَةٌ لا يقومُ بِهَا عَلَى وَجۡهِها: إِمَّا بِأَنۡ لا يكونَ صَالِحاً لَهَا، وإما بِأَنۡ يكونَ فَاسِقاً، أَوۡ مُغَفَّلاً، وَنَحوَ ذَلِكَ فَيَجِبُ ذِكۡرُ ذَلِكَ لِمَنۡ لَهُ عَلَيۡهِ وِلايَةٌ عامَّةٌ لِيُزِيلَهُ، وَيُوَلِّيَ مَنۡ يُصۡلحُ. أَوۡ يَعۡلَمَ ذَلِكَ مِنۡهُ لِيُعامِلَهُ بِمُقۡتَضَى حالِهِ، وَلاَ يَغۡتَرَّ بِهِ، وأَنۡ يَسۡعَى فِي أَنۡ يَحُثَّهُ عَلَى الاسۡتِقامَةِ أَوۡ يَسۡتَبۡدِلَ بِهِ.

ایک صورت یہ ہے کہ بڑے حاکم کی طرف سے کسی کو کوئی عہدہ سونپا گیا، اور اس عہدے کی نسبت سے اس پر جو ذمہ داریاں اور تقاضے عائد ہوئے ان کو وہ پورا نہیں کرسکتا، یا تو اس لیے کہ جو ذمہ داری عہدہ ومنصب اور جو پوسٹ اس کو دی گئی ہے، دینے والے نے یہ سوچا کہ بڑا عالم ہے، لہٰذا اس کو یہ ذمہ داری سونپ دو، لیکن یہ جانتا ہے کہ اس پوسٹ کی نسبت سے جو کام آتے ہیں ان کو کرنے کی ان عالم صاحب میں

صلاحیت نہیں ہے؛ اس لیے اگر یہ کام ان کو سونپا جائے گا تو وہ اس کو انجام نہیں دے سکیں گے۔ مثلاً: کسی کو قاضی کی پوسٹ پر مقرر کیا گیا، کورٹ میں جج مقرر کیا گیا، لیکن اس میں وہ صلاحیت نہیں ہے۔ یا تو وہ آدمی جس کو یہ کام سونپا جارہا ہے وہ فاسق ہے، اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں اور شریعت کی خلاف ورزی میں مبتلا ہے۔ یا غفلت کا شکار ہے (مطلب یہ ہے وہ اس ذمہ داری کو پوری کرنے کی لیاقت اور صلاحیت نہیں رکھتا) تو اس کو اوپر والے حاکم تک بات پہنچانا ضروری ہے کہ فلاں کو جو پوسٹ یا عہدہ دیا گیا ہے؛ اس میں اس عہدے کے تقاضوں کو پورا کرنے اور اس عہدے کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ یا صلاحیت تو ہے، یعنی علمی اعتبار سے تو وہ مضبوط ہے، لیکن اس میں اتنی قوت نہیں ہے کہ اس کام کو انجام دے سکے؛ تو اوپر والے حاکم تک یہ بات پہنچانا ضروری ہے؛ اس کو غیبت نہیں کہیں گے۔

اور اوپر والے حاکم کی امانت ودیانت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جب اس کے علم میں یہ بات لائی جارہی ہے تو اس کی تحقیق کرے، اور اگر وہ بات صحیح ہو تو پھر اس کو اس منصب وعہدے سے ہٹادے۔ یا حاکم یہ سمجھتا ہے کہ اس کو بدلنے کی ضرورت نہیں ہے، اسی پوسٹ پر باقی رکھتے ہوئے اس کو ذرا سی تنبیہ کردینے سے اس کا معاملہ ٹھیک ہوجائے گا، یعنی اگر اس کو ذرا کہہ دیں گے کہ: دیکھو! کام برابر کرو؛ ورنہ تم کو (Suspend) کردیں گے اور اس عہدے سے ہٹادیں گے؛ تب تو کوئی حرج نہیں، اس وقت اس کو دھمکی دے دی جائے اور اس عہدہ پر باقی رکھا جائے۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے، یعنی اس میں صلاحیت ہی نہیں ہے، یا سدھار کی بھی امید نہیں؛ تو اس صورت کے اندر اس کو بدل دیا جائے۔

بہرحال! یہ سب صورتیں اور شکلیں مسلمانوں اور عام پبلک کو برائی اور نقصان سے بچانے کی تھیں جن میں غیبت کی اجازت ہے۔

پانچواں سبب؛ علانیہ مرتکب گناہ

الخامِسُ: أنْ يَكُونَ مُجَاهِراً بِفِسْقِهِ أَوْ بِدْعَتِهِ كالمُجَاهِرِ بِشُرْبِ الخَمْرِ، ومُصَادَرَةِ النَّاسِ، وأَخْذِ المَكْسِ، وجِبَايَةِ الأمْوَالِ ظُلْماً، وَتَوَلِّي الأمُورِ الباطِلَةِ، فَيَجُوزُ ذِكْرُهُ بِمَا يُجَاهِرُ بِهِ، وَيَحْرُمُ ذِكْرُهُ بِغَيْرِهِ مِنَ العُيُوبِ، إلاَّ أنْ يكونَ لِجَوازِهِ سَبَبٌ آخَرُ مِمَّا ذَكَرْنَاهُ.

غیبت کی اجازت کا پانچواں سبب یہ ہے کہ: کوئی آدمی کھلم کھلا اور علانیہ کسی گناہ کا مرتکب ہے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ کوئی آدمی چھپ کر شراب پیتا ہو، اس کا اظہار کرنا تو غیبت میں شمار ہوگا، لیکن ساری دنیا کے سامنے کھل کر شراب پیتا ہو اور آپ لوگوں کے سامنے کہیں گے کہ یہ شرابی ہے، تو اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے، آپ نے کوئی نیا انکشاف نہیں کیا ہے، بلکہ وہ اپنی یہ حرکت ساری دنیا کے سامنے کر ہی رہا ہے۔ لیکن اس کے صرف اسی گناہ کا اظہار کیا جا سکتا ہے جو وہ کھلم کھلا کر رہا ہو، اس کے کسی دوسرے گناہ کا تذکرہ کرنے کی بالکل اجازت نہیں۔ یعنی مان لیجئے کہ وہ شراب تو کھلم کھلا پیتا ہے، لیکن زنا چھپ کر کرتا ہے؛ تو اس کے شراب پینے کا تذکرہ تو آپ کر سکتے ہیں، لیکن زنا کا تذکرہ نہیں کر سکتے۔ جو گناہ چھپ کر کر رہا ہے اس کا اظہار کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

اسی طرح کوئی آدمی کھلم کھلا لوگوں کے سامنے فسق یا بدعت میں مبتلا ہے، یا لوگوں کا مال چھین لیتا ہے، یا کوئی حاکم ظلماً ٹیکس وصول کرتا ہے، یا لوگوں کے پاس سے مال چھین لیتا ہے، یا غلط کام اور حرکتیں کرتا ہے، تو جو غلط کام کھلم کھلا کرتا ہے اس کا تذکرہ کرنا ضروری ہے، لیکن اس میں دوسری جو کمزوریاں ہیں ان کو بیان کرنے کی اجازت

نہیں۔ مثلاً: کسی نے کہا کہ: فلاں آدمی شراب پیتا ہے، تو دوسرا کہتا ہے کہ: ارے جانے دو نا یار! تم شراب کی بات کرتے ہو؟ وہ تو زنا بھی کرتا ہے، اور جوا بھی کھیلتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی دوسری برائیوں کا ایک لمبا سلسلہ شروع کر دیا، حالاں کہ یہ دوسری باتیں چاہے اس میں ہیں، لیکن وہ ان کا ارتکاب کھلم کھلا نہیں کرتا؛ تو ان کو بیان کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

چھٹا سبب: پہچان کروانا

السَّادِسُ: التعرِيفُ. فإذا كَانَ الإِنْسانُ مَعْرُوفاً بِلَقَبٍ، كالأَعْمَشِ، والأعرَجِ، والأَصَمِّ، والأَعْمى، والأَحْوَلِ، وغَيْرِهِمْ جازَ تَعْرِيفُهُمْ بذلِكَ، وَيَحْرُمُ إِطْلاقُهُ عَلَى جِهَةِ التَّنْقِيصِ، ولو أمكَنَ تَعْرِيفُهُ بِغَيْرِ ذَلِكَ كَانَ أَوْلَى.

اور چھٹا سبب یہ ہے کہ لوگوں میں کسی کی پہچان کروانے کے لئے اس کے کسی عیب اور کمزوری کا تذکرہ کیا جائے، مثلاً: بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کوئی آدمی کسی نام سے مشہور ہو جاتا ہے، جیسے: ایک آدمی لنگڑا ہے، اور آپ یوں کہیں کہ وہ لنگڑا ہے؛ تب تو غیبت ہے، لیکن اگر اس کے نام کے ساتھ ہی لنگڑا مشہور ہو گیا، جیسے: مان لیجئے کہ کسی کا نام امتیاز ہے، آپ لوگوں سے کہیں کہ: امتیاز آیا تھا، تو لوگ پوچھتے ہیں کہ: کون امتیاز؟ صرف امتیاز کے نام سے اس کو کوئی پہچانتا ہی نہیں، اس لیے کہ وہ لنگڑے کے نام سے ہی مشہور ہے، تو آپ کہیں کہ: امتیاز لنگڑا؛ تو سامنے والا فوراً پہچان لیتا ہے۔ بعض مرتبہ کسی کا نام "کالیا" پڑ جاتا ہے، اب لوگ اس کو اسی نام سے پہچانتے ہیں، یعنی اس کے والدین نے اس کا حقیقی اور اصلی جو نام رکھا ہے اگر اس نام سے آپ کہیں کہ مثلاً: یوسف آیا تھا، تو سامنے والا پوچھتا ہے: کون یوسف؟ اب آپ کو کہنا پڑتا ہے کہ یوسف کالیا۔

حاصل یہ ہے کہ کوئی عیب ہی کسی کے نام کا حصہ بن گیا ہو اور اسی نام سے وہ مشہور ہو گیا ہو، اگر آپ اس عیب والے حصہ کو ہٹا دیتے ہیں تو کوئی بھی اس کو نہیں پہچانتا، اس لیے اس کی پہچان کروانے کے لئے اسی عیب والے حصہ کو بیان کرنا ضروری ہو گیا ہے؛ تو اس کی بھی اجازت ہے۔

چناں چہ ہمارے اسلاف میں ایک بڑے محدث اور عالم بزرگ امام اعمش گزرے ہیں، وہ علم نحو کے امام تھے۔ وہ ''اعمش'' ہی کے نام سے مشہور تھے، اور جس کی آنکھیں چندھیائی ہوئی ہوں اس کو عربی میں ''اعمش'' کہتے ہیں۔ اگر دوسرا کوئی نام لیا جائے تو کوئی نہیں جانتا۔ اسی طرح ''اعرج'' لنگڑے کو کہتے ہیں، لیکن ایک بڑے محدث اور فقیہ تھے جن کا نام ہی عبدالرحمن اعرج ہے، وہ اسی نام سے مشہور ہیں، ان کو ''اعرج'' ہی سے یاد کرتے ہیں۔ اسی طرح حاتم اصم بڑے بزرگ گزرے ہیں، ان کے بہت سے حالات اور واقعات آپ نے سنے ہوں گے، حالاں کہ ''اصم'' بہرے کو کہتے ہیں، لیکن وہ اسی نام سے مشہور ہیں۔ اسی طرح ''احول'' بھینگے کو کہتے ہیں، لیکن ایک بڑے عالم ''احول'' کے نام سے مشہور ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی ''اعمیٰ'' کے نام سے مشہور ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی آدمی اسی طرح کے کسی لقب سے مشہور ہو چکا ہو، اور دوسرا کوئی نام لینے سے لوگ اس کو نہ پہچانتے ہوں اور مجبوراً یہی نام لینا پڑتا ہو؛ تو اس کی بھی اجازت ہے۔ لیکن وہاں پر بھی یہ لفظ عیب لگانے کی نیت سے نہ کہا جائے، بلکہ اس نیت سے ایسا نام لیا جائے تا کہ لوگ اس کو پہچان سکیں۔ اور اگر کوئی دوسرا نام لے کر اس کی پہچان کروائی جا سکتی ہو، تو پھر وہی شکل اختیار کرنی چاہیے۔ ہاں! اگر ممکن ہی نہیں ہے جیسا کہ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کا اصلی نام ایسا چھپا رہ جاتا ہے

کہ گھر کے لوگوں اور قریب کے رشتہ داروں کو بھی پتہ نہیں ہوتا؛ تو پھر اس نام کو لینے کی اجازت ہے۔

فهذهٖ ستَّةُ أسبابٍ، ذَكَرَهَا العُلَمَاءُ وأكثرُها مُجمَعٌ عَلَيهِ، وَدَلائِلُهَا مِنَ الأحادِيثِ الصَّحيحَةِ مشهورَةٌ. فمن ذٰلِكَ:

بہرحال! یہ چھ اسباب ہیں جن کی بنیاد پر غیبت کی اجازت دی گئی ہے، اور یہ چھ اسباب ایسے ہیں جن پر تمام علماء نے بالاتفاق اجازت دی ہے، اور احادیث سے اس کی دلیلیں بھی مشہور ہیں، چناں چہ اسی قبیل کی کچھ احادیث یہاں پیش کرتے ہیں۔

یہ اپنے قبیلے کا بڑا بُرا آدمی ہے

۱۵۳۱:- عن عائشة رضی اللہ عنہا: أنَّ رجلاً استَأذَنَ عَلَى النبيِّ ﷺ فَقَالَ: ((ائْذَنُوا لَهُ، بِئسَ أخُو العَشِيرَةِ)) (متفق عَلَيهِ)

احتَجَّ بِهِ البخاري رحمہ اللہ في جوازِ غيبَةِ أهلِ الفسادِ وأهلِ الرِّيَبِ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے لئے ایک آدمی نے (گھر کے باہر سے) اجازت مانگی (کہ مَیں اندر آسکتا ہوں؟ اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس کو اندر آنے کی اجازت تو دیدو، لیکن یہ اپنے قبیلے کا بڑا بُرا آدمی ہے (پھر جب وہ شخص حضور کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑی محبت اور نرمی سے اس کے ساتھ بات چیت فرمائی، جب وہ آدمی چلا گیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک سوال کیا کہ: اے اللہ کے رسول! جب اس نے اجازت مانگی اس وقت تو آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ: بڑا بُرا آدمی ہے، لیکن جب وہ آپ کے پاس آکر بیٹھا تو آپ نے

بڑی محبت اور نرمی سے اس کے ساتھ گفتگو فرمائی؛ معاملہ سمجھ میں نہیں آیا؟ تو حضورِ اکرم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: اے عائشہ! تم نے مجھے بداخلاق کب پایا ہے؟)۔

افادات:۔ مطلب یہ ہے کہ وہ آدمی بُرا ہے، تو کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں بھی اس کے ساتھ برائی سے پیش آؤں؟ ایک برا آدمی اگر آپ کے پاس آجائے تو اس کی برائی اس کے ساتھ ہے، مگر آپ کے اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اس کے ساتھ اچھے اخلاق ہی سے پیش آئیں۔ حضور ﷺ کے جواب کا حاصل یہی تھا کہ وہ برا تھا اس کا مطلب یہ تھوڑا ہے کہ مَیں بھی بداخلاقی سے پیش آتا، مجھے تو اچھے اخلاق ہی سے اس کے ساتھ پیش آنا ہے۔ جیسے: کوئی شرابی آدمی آپ سے ملاقات کرنے کے لئے آیا تو کیا آپ اس کے شرابی ہونے کی وجہ سے اس کو دُھتکار دیں گے؟ اُس کا شرابی ہونا اپنی جگہ پر برا کام ہے، لیکن آپ تو اس کے ساتھ اچھے اخلاق ہی سے پیش آئیں۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر آپ ﷺ نے اس کے متعلق ایسا کیوں فرمایا تھا؟ تو حضراتِ علماء فرماتے ہیں: چوں کہ اس کے اندر آنے کے بعد حضور ﷺ اس کے ساتھ اچھے اخلاق ہی سے پیش آنے والے تھے، تو آپ کے اخلاق کا مظاہرہ کرنے سے حضرت عائشہؓ یا کسی دیکھنے والے کو کہیں یہ دھوکہ نہ ہوجائے کہ یہ بڑا اچھا آدمی ہے، اور پھر وہ کسی نقصان میں مبتلا نہ ہوجائے، اس لیے آپ نے پہلے ہی اس کی خرابی اور برائی کو ظاہر فرمادیا۔ جیسے: ایک آدمی لوگوں کے ساتھ فراڈ کرتا ہے، وہ کسی وقت آپ کے پاس آرہا ہو، اور اس کو آتا ہوا دیکھ کر آپ اپنے پاس بیٹھنے والوں سے یوں کہہ دیں کہ یہ تو بڑا فراڈی آدمی ہے، لیکن جب وہ آپ کے پاس آکر بیٹھے تو آپ اس کے ساتھ

بڑے اچھے اخلاق کا معاملہ کریں۔ تو یہاں یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس کی خرابی بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تو سمجھ لینا چاہیے کہ ضرورت اسی لیے تھی کہ آپ ایک ذمہ دار شخص ہیں، اور جب وہ آپ کے پاس آرہا ہے تو چوں کہ آپ تو اس کے ساتھ اچھے اخلاق ہی سے پیش آنے والے ہیں، اور آپ کے اس کے ساتھ اخلاق ومحبت کا معاملہ کرنے کی وجہ سے پاس بیٹھنے والوں کو کوئی غلط فہمی نہ ہوجائے اور کوئی یہ سمجھنے نہ لگے کہ ہم اس روز فلاں صاحب کی خدمت میں بیٹھے تھے، اور جب یہ آدمی آیا تھا تو انہوں نے اس کے ساتھ بڑی محبت کا معاملہ کیا تھا، اس کا مطلب ہے کہ یہ آدمی اچھا ہی ہوگا۔ اگر آپ کو ایسا اندیشہ اور ڈر ہو کہ اس کی برائی کا اظہار نہ کیا گیا تو لوگوں کو اس کے ذریعہ سے نقصان پہنچے گا اور اچھائی کے اسی زعم میں لوگ دھوکے میں پڑ جائیں گے؛ تو آپ کو چاہیے کہ اس کی برائی سے اپنے پاس بیٹھنے والوں کو واقف کردیں۔

بڑے آدمی کی یہ ذمہ داری ہے

بعض دھوکے بازوں کی عادت ہی ہوتی ہے کہ بڑوں کے پاس باقاعدہ آتے جاتے رہتے ہیں اور ان کے پاس بیٹھنے والوں کو یہ تأثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ میرا ان کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے، تو ایسے موقعہ پر اس بڑے آدمی کی یہ ذمہ داری ہے کہ اپنے پاس بیٹھنے والوں کو اس کی حالت سے واقف کردے، تاکہ کسی کو اس سے دھوکے میں پڑنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ اس روایت سے ایسے مواقع پر غیبت کا جواز ثابت ہوتا ہے، اسی لیے اس کو یہاں پیش کیا ہے۔

باب مایباح من الغیبة

بعض صورتیں جن میں غیبت کی اجازت دی گئی

غیبت کا بیان چل رہا تھا، اس میں بعض وہ صورتیں ہیں جن میں غیبت کی اجازت دی گئی ہے، یعنی کسی آدمی کی کمزوری یا عیب کو ظاہر کرنا بعض صورتوں میں جائز اور درست ہے، جس کی تفصیل پچھلی مجلس میں آ گئی تھی۔ ان ہی صورتوں میں یہ بھی ہے کہ اگر کسی آدمی کی شخصیت اور ذات میں کوئی برائی ہو اور اس سے پہنچنے والی اس برائی سے مسلمانوں کو بچانا اور ان کی خیر خواہی مقصود ہو؛ تو اس صورت میں اس کی اندرونی حالت سے لوگوں کو آگاہ کیا جا سکتا ہے۔

دونوں دین کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے

۱۵۳۲:- وعنها قالت قال رسول الله ﷺ ما أظن فلاناً وفلاناً يعرفان من ديننا شيئاً. (رواہ البخاری)

قال الليث بن سعدٍ أحد رواة هذا الحديث: هذان الرجلان كانا من المنافقين.

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو آدمیوں کے متعلق (جو بظاہر اچھے تھے اور ان کے نفاق کا لوگوں کو علم نہیں تھا لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تو اللہ تعالیٰ نے منافقین کے ناموں سے آگاہ کر دیا تھا، چناں چہ ایک موقعہ پر) فرمایا: میں نہیں سمجھتا کہ فلاں اور فلاں ہمارے دین کی باتوں سے کچھ بھی واقف ہوں۔

چناں چہ اس روایت کے راویوں میں ایک حضرت لیث بن سعد رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو بڑے امام

بھی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ وہ دونوں آدمی منافقین میں سے تھے، اس لیے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی اندرونی حالت سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا؛ تاکہ کسی کو غلط فہمی نہ ہو۔

افادات:۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی شکل وصورت اور ظاہری حالت سے لوگوں کو یہ دھوکہ ہوسکتا تھا کہ وہ دین کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں، اور اسی دھوکہ میں پڑ کر کوئی آدمی ان کی باتوں سے نقصان اٹھا سکتا تھا، اس لیے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حقیقتِ حال کا اظہار کرتے ہوئے فرمادیا کہ وہ دونوں دین کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے۔ اور پہلے بھی بتلایا جاچکا ہے کہ کسی کی طرف سے پہنچنے والی برائی اور نقصان سے مسلمانوں کو بچانے کے لئے اگر اس کے حال سے واقف کرانے کی ضرورت پڑ جائے تو وہ غیبت میں داخل نہیں ہے۔

تکلیف سے بچالیا

۱۵۳۳: وعن فاطمة بنتِ قيسٍ رَضِيَ اللهُ عنها قالت: أتيتُ النبيَّ ﷺ فقلتُ: إنَّ أَبَا الجَهْمِ وَمُعَاوِيَةَ خَطَبَانِي؟ فَقَالَ رسُولُ الله ﷺ: أَمَّا مُعَاوِيَةُ، فَصَعْلُوكٌ لَا مَالَ لَهُ. وأَمَّا أَبُو الجَهْمِ، فَلَا يَضَعُ العَصَا عَنْ عَاتِقِهِ. (متفق عَلَيْهِ)

وفي رواية لمسلم: ((وَأَمَّا أَبُو الجَهْمِ فَضَرَّابٌ لِلنِّسَاءِ))

وَهُوَ تفسير لرواية: ((لَا يَضَعُ العَصَا عَنْ عَاتِقِهِ)) وقيل: معناه: كثيرُ الأسفارِ

ترجمہ مع تشریح:۔ (حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کو ان کے شوہر نے طلاق دیدی تھی، عدت کے زمانہ ہی میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو ہدایت کردی تھی کہ اب جو بھی پیغام آئے، مجھ سے مشورہ کیے بغیر قبول مت کرنا، چناں چہ ان کی عدت پوری ہونے کے بعد جب ان کے پاس لوگوں کی طرف سے نکاح کے واسطے پیغامات

آئے تو اس سلسلہ میں انہوں نے نبیٔ کریم ﷺ کو آگاہ کیا کہ) ابوجہم اور معاویہ نے میرے پاس پیغامِ نکاح بھیجا ہے (اب آپ ہی مشورہ دیجئے کہ دونوں میں سے کس کا پیغام قبول کروں؟) حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: معاویہ تو ایک دم فقیر آدمی ہے، اس کے پاس مال ہے ہی نہیں (بھلا وہ تمہارا نفقہ کیا ادا کر سکیں گے؟) اور رہے ابوجہم! تو وہ اپنی لاٹھی کندھے سے نیچے اتارتے ہی نہیں۔

مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ: ابوجہم عورتوں کی بہت پٹائی کرتے ہیں۔ اور اس کا ایک معنٰی یہ بھی بتایا ہے کہ: ابوجہم سفر بہت کثرت سے کرتے ہیں۔

افادات:۔ حضورِ اکرم ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ ہوسکتا ہے کہ معاویہ کے ساتھ نکاح کے نتیجہ میں تمہیں نفقہ کے سلسلہ میں مشقت اور تکلیف اٹھانی پڑے۔ اور جیسا کہ پچھلی مجلس میں بتلایا تھا کہ مسلمانوں کو کسی کی طرف سے پہنچنے والی تکلیف سے بچانے کی شکلوں میں ایک یہ بھی تھا کہ کوئی آدمی رشتہ کے سلسلہ میں مشورہ کرنے کے لئے آیا ہو کہ مثلاً: میں اپنی بیٹی کا رشتہ فلاں سے کرنا چاہتا ہوں؛ آپ کا کیا مشورہ ہے؟ تو اگر اس میں ایسا کوئی عیب ہو، جو اِزدواجی زندگی کے لئے نقصان کا باعث بن سکتا ہو؛ تو وہ بتلادینا ضروری ہے۔ اگر اس سے واقف نہیں کرے گا تو یہ ایک طرح کی خیانت ہوگی۔ یہاں پر بھی چوں کہ حضرت معاویہؓ مالی اعتبار سے بالکل کمزور تھے، اس لیے نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا کہ: معاویہ تو بالکل فقیر آدمی ہے، اس کے پاس مال نہیں ہے، اس کے ساتھ نکاح کرکے کیا کروگی؟ اور ابوجہم اپنی لاٹھی کندھے سے نیچے اتارتے ہی نہیں، یعنی ہر وقت لاٹھی لیے پھرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے ساتھ نکاح کروگی تو یہ حالات تم کو بھی پیش آئیں گے، ان کی طرف سے پٹائی کی نوبت

آسکتی ہے؛ اب تم خود ہی سوچ لو اور فیصلہ کرلو۔ گویا حضور ﷺ نے ان کے ساتھ بھی نکاح کا مشورہ نہیں دیا۔ پھر آگے کیا ہوا اس کا تذکرہ یہاں نہیں ہے، لیکن دوسری روایتوں میں ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ نے اپنی طرف سے حضرت اسامہ بن زیدؓ کا نام لیا کہ تم ان سے نکاح کرلو۔ چناں چہ بعد میں انہی کے ساتھ نکاح ہوا، حالاں کہ اس وقت تک ان کی طرف سے پیغام نہیں آیا تھا۔

بہرحال! چوں کہ انہوں نے مشورہ طلب کیا تھا تو ان کو نقصان پہنچنے کی جو چیز تھی وہ بتلادی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایسی بات بتادینا غیبت میں شمار نہیں ہوتا۔

غزوۂ بنی المصطلق کا ایک واقعہ

۱۵۳۴:- وعن زيد بن أرقم رضي الله عنه قَالَ: خرجنا مَعَ رسُولِ الله ﷺ في سَفَرٍ، أَصَابَ النَّاسَ فِيهِ شِدَّةٌ، فَقَالَ عبدُ اللهِ بن أُبَيّ: لَا تُنْفِقُوا عَلَى مَنْ عِندَ رسولِ اللهِ ﷺ حَتَّى يَنْفَضُّوا، وقال: لَئِنْ رَجَعْنَا إِلَى المَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الأَعَزُّ مِنْهَا الأَذَلَّ، فَأَتَيتُ رسُولَ اللهِ ﷺ، فَأَخْبَرْتُهُ بذٰلِكَ، فَأَرْسَلَ إِلَى عبدِ اللهِ بن أُبَيٍّ، فَاجْتَهَدَ يَمِينَهُ: مَا فَعلَ. فقالوا: كَذَبَ زيدٌ رَسُولَ الله ﷺ، فَوَقَعَ فِي نَفْسِي مِمَّا قَالُوهُ شِدَّةٌ حَتَّى أَنْزَلَ اللهُ تَعَالَى تَصْدِيقِي: إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ. ثُمَّ دعاهُمُ النبيّ ﷺ لِيَسْتَغْفِرَ لَهُمْ فَلَوَّوْا رُؤُوسَهُمْ. (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت زید بن اُرقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ نبیٔ کریم ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں نکلے، اس سفر میں لوگوں کو بڑی تکلیف پہنچی (اس لیے کہ پانی کی قلت تھی) اسی موقعہ پر عبداللہ بن اُبی نے کہا تھا: اللہ کے رسول کے ساتھ جو لوگ مکہ مکرمہ سے ہجرت کرکے آئے ہیں ان (مہاجرین) پر پیسہ خرچ مت کرو، یہاں تک کہ وہ خود ہی بھاگ جائیں گے۔ اور اس نے

یہ بھی کہا تھا کہ: ہم لوگ جب مدینہ لوٹیں گے تو ہم میں جو عزت والا ہے وہ ذلیل کو نکال دے گا۔ حضرت زید بن اُرقم فرماتے ہیں کہ: میں حضورا کرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور حضور کو اس کی باتوں سے واقف کیا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے عبداللہ بن اُبی کو بلوایا (اور اس سے تحقیق فرمائی تو) اس نے بہت تاکید کے ساتھ قسم کھا کر یوں کہا: میں نے ایسا کہا ہی نہیں ہے (وہ اپنی بات سے پھر گیا) حضرت زید بن اُرقم فرماتے ہیں: اس پر لوگ مجھے کہنے لگے: کہ زید نے آکر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو غلط باتیں بتلائیں۔ لوگوں کی ان باتوں کی وجہ سے مجھے بڑی تکلیف ہوئی (دوسری روایتوں میں ہے کہ میں لوگوں سے منھ چھپاتا پھرتا تھا، اس لیے کہ جو بھی ملتا مجھے ڈانٹتا اور ملامت کرتا تھا) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میری بات کی سچائی کو قرآنِ کریم میں اتارا ﴿إذا جاءك المنافقون﴾ چناں چہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے منافقین کو بلایا، تاکہ آپ ان کے لئے دعائے مغفرت فرمائیں، تو انہوں نے انکار کرتے ہوئے اپنے سروں کو پھیر لیا (کہ ہم نہیں آتے۔)

افادات: ۔یہ واقعہ غزوۂ بنی المصطلق میں پیش آیا تھا، بنی المصطلق خزاعہ کی ایک شاخ ہے، یہ لوگ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان میں پانی کے ایک چشمے کے پاس آباد تھے، ان کے سردار حارث بن ابی ضرار کے متعلق نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اطلاع ملی کہ اس نے اپنے خاندان اور قبیلے کے چند لڑاکو لوگوں کو جمع کیا ہے، اور اس لشکر کے ذریعہ وہ مدینہ منورہ پر حملہ کا ارادہ رکھتا ہے، جب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو یہ اطلاع ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک صحابی بُریدہ بن حُصَیب اسلمی رضی اللہ عنہ کو حالات کی تحقیق کے لئے بھیجا کہ معلوم کرو کہ کیا واقعتاً ایسا ہی ہے چناں چہ انہوں نے آکر بتایا کہ بات بالکل صحیح ہے، اور ان لوگوں نے ایک لشکر جمع کیا ہے جو عنقریب مدینہ منورہ پر حملہ کرنے والا ہے۔ اس پر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اس سے پہلے کہ وہ ہم پر حملہ کریں؛ ہم ہی اپنا دفاع کیوں نہ کرلیں؟ چناں چہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تیاری فرمائی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا لشکر

لے کر ان کی طرف روانہ ہو گئے، اب ان لوگوں کو تو یہ توقع تھی ہی نہیں کہ حضور ﷺ ان پر حملہ آور ہوں گے، اس لیے وہ لوگ بڑے اطمینان سے ایک چشمے پر تالاب کے کنارے قیام پذیر تھے، حضورِ اکرم ﷺ اچانک وہاں پہنچ گئے، ان کے ساتھ مقابلہ ہوا، جس میں ان کے کچھ لوگ مارے گئے اور کچھ بھاگ گئے، بہت سارے قید پکڑے گئے اور بہت سارا مال اور اونٹ بکریاں غنیمت کے طور پر حاصل ہوا۔ اس لشکر میں مسلمانوں کے ساتھ بہت سے منافقین بھی مدینہ منورہ سے آئے ہوئے تھے کہ پہلے ہی سے مالِ غنیمت ملنے کی امید اور توقع تھی۔

جنگ ختم ہونے کے بعد نبیٔ کریم ﷺ اپنی عادتِ شریفہ کے مطابق وہیں قیام پذیر تھے اسی دوران یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک جگہ پانی کے ایک گڑھے میں تھوڑا سا پانی تھا، اور چوں کہ پانی کی بڑی قلت چل رہی تھی، اس لیے جہاں جہاں گڑھوں میں پانی تھا وہاں کسی نے اپنی ڈھال رکھ دی تھی، کسی نے چمڑا رکھ دیا تھا، کسی نے کوئی اور چیز رکھ دی تھی۔ گویا لوگوں نے اس پانی پر اپنا قبضہ جمالیا تھا۔ ایک جگہ اسی طرح پانی تھا جس کے سلسلہ میں ایک مہاجری حضرت جہجاہ بن قیسؓ اور ایک انصاری حضرت سنان بن وبرہؓ میں جھگڑا ہو گیا، اور اسی میں مہاجری نے انصاری کو زور سے ایک دھپّہ مار دیا، اس پر وہ انصاری چلائے اور انصار کو اپنی مدد کے لئے آواز دی: ''یالَلأنصار'' اے انصاریو! آؤ؛ میری مدد کرو۔ اس پر مہاجری نے بھی پکارا: ''یالَلمهاجرین'' اے مہاجرین! آؤ؛ میری مدد کرو۔

اب لشکر تو ایک بہت بڑے علاقہ کے اندر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا، اور جہاں ان دونوں میں جھگڑا ہو رہا تھا وہ جگہ نبیٔ کریم ﷺ سے کافی دُور تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے

ان دونوں کی وہ آوازیں- جوانہوں نے اپنی اپنی جماعت کو مدد کے لئے دی تھی- حضور ﷺ کے کانوں تک پہنچادی۔ جب آپ ﷺ نے یہ جملہ سنا تو ارشاد فرمایا: ''ما بال دعوة الجاهلية'' یہ جاہلیت والی آواز اور جاہلیت والا نعرہ کہاں سے آرہا ہے؟۔

یہی تعصب ہے

اس کو جاہلیت والا نعرہ اس لیے کہا کہ قبیلے، خاندان، وطن اور اپنی جماعت کی بنیاد پر کسی کو مدد کے لئے بلانا، اور کون حق پر ہے اور کون ناحق؛ یہ سب کچھ دیکھے بغیر ہی ان کا ساتھ دینا؛ یہی تو تعصب کہلاتا ہے، اور اسلام اس کی بالکل اجازت نہیں دیتا۔ بلکہ اسلام نے تو ایک ہی حکم دیا ہے: تم اپنے بھائی کی مدد کرو، اگر وہ مظلوم ہے تو اس کو ظلم سے چھڑاؤ، اور اگر وہ ظالم ہے تو اس کو ظلم کرنے سے روکو۔ چناں چہ بخاری شریف میں ہے، نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''أُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِماً أَوْ مَظْلُوماً'' اپنے بھائی کی مدد کرو، چاہے ظالم ہو یا مظلوم۔ کسی نے پوچھا: ''أَنْصُرُهُ إِذَا كَانَ مَظْلُومًا، أَفَرَأَيْتَ إِذَا كَانَ ظَالِمًا كَيْفَ أَنْصُرُهُ'' اگر وہ مظلوم ہے تو میں اس کی مدد کروں؛ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے، لیکن اگر وہ ظالم ہے تو اس کی مدد کیسے کروں؟ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ظالم کو ظلم کرنے سے روکو؛ یہی اس کی مدد ہے۔ اس لیے کہ وہ دوسرے پر ظلم کر کے دراصل خود اپنے ہی ساتھ زیادتی کر رہا ہے، اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا کر کے اللہ کے عذاب کا حقدار بنا رہا ہے، جب آپ اس کو ظلم کرنے سے روکیں گے تو ایک طرف تو مظلوم کی حمایت ہو جائے گی کہ اس کو ظلم سے بچالیں گے، اور دوسری طرف اس کو بھی ظلم کرنے سے روک کر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا ہونے اور اس ظلم کے نتیجہ میں قیامت میں اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچالیں گے۔ اس سے بڑی مدد اور کیا

ہوسکتی ہے؟ بہر حال! اسلام نے تو مدد کی بنیاد اور مدار حق اور ناحق پر رکھا۔ ایک مسلمان کی ذمہ داری اور فریضہ ہے کہ وہ حق کی مدد کرے۔ اگر دو آدمیوں میں لڑائی ہو رہی ہو، ایک مسلمان ہو، دوسرا کافر اور غیر مسلم ہو، لیکن مسلمان ناحق پر ہو اور کافر حق پر ہو؛ تو ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم حق کی طرف داری کریں۔ یہ مسلمان ہے اس وجہ سے اس کی طرف داری کرنے کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔

چناں چہ خود نبیٔ کریم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں بھی جب مقدمات آتے تھے تو جو حق پر ہوتا تھا اسی کے مطابق آپ فیصلہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا ہی ہوا کہ ایک منافق اور یہودی کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہو گیا، اور وہ اپنا فیصلہ حضورِ اکرم ﷺ کے پاس لے گئے۔ نبیٔ کریم ﷺ نے اس یہودی کے حق میں فیصلہ دیا۔ تو وہ منافق کہنے لگا کہ: چلو! ہم اپنا یہ فیصلہ حضرت عمرؓ کے پاس لے کر جائیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ حضرت عمرؓ چوں کہ غیر مسلموں کے معاملہ میں بڑے سخت ہیں، تو اس معاملہ میں وہ میری رعایت اور میرے فیور میں فیصلہ کر دیں گے۔ یہودی نے کہا: ٹھیک ہے؛ وہاں چلو۔ چناں چہ دونوں ان کے پاس پہنچے اور اپنا معاملہ پیش کیا۔ یہودی نے کہا: دیکھو! ہم یہ معاملہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں پیش کر چکے ہیں اور آپ نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس منافق سے پوچھا: کیا ایسا ہوا ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں! ایسا ہی ہوا ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا: اچھا ٹھہرو؛ میں ابھی آتا ہوں۔ گھر میں گئے، تلوار لے کر آئے اور اس منافق کا سر قلم کر دیا اور فرمایا: جو آدمی اللہ کے رسول کے فیصلے پر راضی نہ ہو؛ اس کا یہی فیصلہ ہے۔ اس پر بعض لوگوں نے شور مچایا کہ حضرت عمرؓ نے ایک مسلمان کو قتل کر دیا؛ تو قرآنِ پاک میں آیت نازل ہوئی: ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ

حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴿۶۵﴾ [سورۃ النسآء]

میں یہ عرض کرر ہا تھا کہ اسلام تو یہ حکم دیتا ہے کہ آپ حق کی حمایت کریں، چاہے وہ کسی کے پاس بھی ہو، ایک غیر مسلم بھی اگر حق پر ہے تو آپ فیصلہ اس کے حق میں کریں۔ آپ مسلمان ہیں اور وہ بھی مسلمان ہے اس کی وجہ سے اس کی طرف داری کرنا اور ناحق فیصلہ کرنا؛ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی؛ یہ تو صریح ظلم وزیادتی ہے، لیکن آج کل ہر جگہ یہی معاملہ ہو گیا ہے کہ میرے خاندان والا ہے، میرے محلے والا ہے، میری بستی والا ہے، میری پارٹی والا ہے؛ اس لیے میں اس کی مدد کروں گا؛ چاہے وہ حق پر ہو یا نہ ہو؛ حالاں کہ اسلام اس کی بالکل اجازت نہیں دیتا، اسی کو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ جاہلیت والا طریقہ ہے ’’دَعُوْهَا، فَإِنَّهَا مُنْتِنَةٌ‘‘ اس کو چھوڑو: یہ بڑا بدبودار نعرہ ہے۔ اسی دوران قریب تھا کہ جھگڑا طول پکڑ لیتا لیکن حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیچ میں پڑے اور دونوں کو سمجھا کر ایک دوسرے سے معافی تلافی کرائی اور معاملہ ختم ہو گیا اور سب شیر وشکر ہو گئے۔

چوں کہ اس لشکر میں منافقین کی بھی ایک جماعت آئی ہوئی تھی، اور منافقین کا سردار عبداللہ بن اُبی بھی ساتھ آیا ہوا تھا، لیکن جس وقت یہ جھگڑا ہوا وہ وہاں موجود نہیں تھا، اپنی قیامگاہ پر تھا، اس کو بعد میں پتہ چلا کہ آج ایسا جھگڑا ہوا۔ ویسے بھی وہ اندر سے تو مسلمانوں کا مخالف ہی تھا، ظاہری طور پر اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا، اس نے اپنی ایک مجلس کے اندر جہاں اس کے خاص چیلے چانٹے اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے پوچھا: آج کیا واقعہ ہوا؟ لوگوں نے بتایا کہ ایک مہاجری نے ایک انصاری کو دھپّہ مار

دیا تھا۔ تو اس نے کہا: میں تو ہمیشہ کہتا ہی رہتا ہوں کہ تمہیں لوگ ان کو باہر سے بلا کر لائے ہو، اور اپنے گھروں میں پناہ دی ہے، ان کے کھانے پینے کا انتظام کیا ہے، اب دیکھو! تمہارے ٹکڑوں پر پلے ہوئے آج تمہارے سر پر سوار ہو گئے ہیں۔ تم لوگ اب بھی اگر ہوش میں نہ آئے تو آئندہ اور بہت کچھ دیکھو گے۔ تم کو ابھی بھی سنبھلنے کی ضرورت ہے، ورنہ یہ لوگ تم کو مدینہ میں رہنے بھی نہیں دیں گے۔ اور دیکھو! تم لوگ ان کو کھلا پلا رہے ہو؛ اس لیے وہ اپنے یہاں پڑے ہوئے ہیں، اگر ان پر خرچ کرنا اور کھلانا پلانا چھوڑ دو گے؛ تو وہ سب آپ ہی آپ منتشر ہو جائیں گے اور بھاگ جائیں گے۔ ابھی بھی موقع ہے، یہ فیصلہ کر لو کہ یہاں سے جانے کے بعد ہم میں سے عزت والا ذلیلوں کو نکال دے گا۔ وہ اپنے آپ کو اور اپنے قبیلے والوں کو عزت والا کہتا تھا، اور نعوذ باللہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مہاجرین (جو مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے آئے تھے) کو ذلیل کہتا تھا۔ اور ویسے بھی جس مجلس کے اندر اس نے یہ بات کہی تھی وہاں سب اسی کے لوگ تھے، لیکن اس کے باوجود اس طرح کے لوگ جب ایسی باتیں کرتے ہیں تو ایک دم کھل کر نہیں کرتے، کچھ مبہم ہی کہتے ہیں۔ اس نے بھی یہ بات ایک دم کھل کر نہیں کہی تھی۔ لیکن اس مجلس میں ایک صغیر السّن صحابی حضرت زید بن اُرقم رضی اللہ عنہ موجود تھے، ان کا تعلق بھی اسی قبیلۂ خزرج سے تھا، اور عبداللہ بن اُبی بھی اسی قبیلے کا تھا۔ انہوں نے عبداللہ بن اُبی کی زبان سے یہ جملے سنے تو فوراً بول پڑے؛ تو ذلیل آدمی ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو عزت والے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو عزت دے رکھی ہے؛ تو کیا ان کو نکالے گا؟ مَیں ابھی جا کر تیری بات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتاتا ہوں۔ یہ سن کر وہ تو سٹپٹا گیا کہ میرا راز فاش ہو گیا، اب یہ بات وہاں پہنچ جائے گی، تو اب اس نے باتیں بنانا

شروع کیں کہ میرا مطلب یہ تھا اور وہ تھا۔ حضرت زید بن اُرقم نے کہا: میں تو بات پہنچا ہی دوں گا۔ چناں چہ وہ حضورِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اپنے چچا کے واسطے سے انہوں نے وہ بات حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچائی کہ عبداللہ بن اُبی نے آپ کے متعلق یوں کہا ہے۔

اگرچہ عبداللہ بن اُبی منافق تھا، لیکن اس کا اپنے قبیلے میں ایک مقام تھا، اور وہ نفاق پر اسی لیے تو آمادہ ہوا تھا کہ نبیٔ کریم ﷺ کے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لانے سے پہلے مدینہ والوں نے اس کو اپنا بادشاہ بنا نا طے کر لیا تھا، اس کی تاج پوشی ہونے ہی والی تھی کہ وہاں اسلام پھیلا اور حضورِ اکرم ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو اس کے سارے معاملے پر پانی پھر گیا، اس لیے اس کے دل میں حسد پیدا ہوا، اور اسی حسد کی آگ کی بنیاد پر وہ مسلمانوں کے ساتھ دشمنی رکھتا تھا اور نفاق پر اتر آیا تھا۔

بہرحال! وہ اپنے قبیلے کا بڑا آدمی تھا اور حضرت زید بن اُرقم رضی اللہ عنہ چھوٹی عمر کے صحابی تھے، اپنے قبیلے میں بھی ان کا کوئی زیادہ مقام نہیں تھا۔ جب انہوں نے حضور ﷺ سے کہا کہ وہ آپ کے متعلق ایسا کہتا ہے، تو حضور ﷺ نے بھی فرمایا: اے لڑکے! تو جو بات کہہ رہا ہے وہ صحیح ہے؟ ذرا سمجھ کر بولنا کہ تو کس کے متعلق کہہ رہا ہے؟ حضرت زید نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں سچ کہتا ہوں۔ پھر پوچھا: تم نے برابر سنا ہے؟ تم اونگھ میں تو نہیں تھے؟ انہوں نے کہا: میں نے برابر سنا ہے، اس نے یہی کہا ہے۔ جب انہوں نے یہ بات حضور ﷺ تک پہنچائی تو وہ مسلمانوں میں پھیل گئی، اور پورے لشکر میں اسی کا چرچا ہونے لگا کہ عبداللہ بن اُبی نے نعوذ باللہ حضورِ اکرم ﷺ کو ذلیل اور اپنے آپ کو عزت والا کہا ہے۔ اور اس نے یہ بھی کہا کہ ہم جب مدینہ پہونچیں گے تو ان سب کو

وہاں سے نکال دیں گے۔ جب یہ بات لشکر میں پھیلی تو حضرت عمرؓ حضورِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ اجازت دیجئے کہ میں عبداللہ بن اُبی کا سر قلم کر کے آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ اب چوں کہ وہ ظاہر میں تو مسلمان تھا، اس لیے حضورِ اکرم ﷺ نے جواب میں فرمایا: ہم ایسا نہیں کریں گے؛ ورنہ لوگ یوں کہیں گے کہ محمد (ﷺ) اپنے ساتھیوں کو ہی قتل کرواتے ہیں۔ عبداللہ بن اُبی کے ایک بیٹے تھے جن کا نام بھی عبداللہ تھا اور وہ سچے اور مخلص مؤمن تھے، جب ان کو پتہ چلا کہ میرے باپ نے ایسی بات کہی ہے اور حضرت عمرؓ نے جا کر حضورِ اکرم ﷺ کی خدمت میں یہ بات عرض کی ہے، لیکن حضور ﷺ نے منع فرما دیا ہے تو وہ حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میرے باپ نے جو بات کہی ہے، اس کی وجہ سے اگر آپ کا ارادہ اس کو قتل کروانے کا ہو تو آپ مجھے حکم دیجئے، سارے مدینہ والے جانتے ہیں کہ مدینہ میں کوئی بھی اپنے باپ کا اتنا مطیع وفرمانبردار نہیں ہے جتنا میں ہوں، لیکن آپ کے معاملہ میں اس کا سر لا کر میں ہی پیش کرتا ہوں۔ آپ کو اگر یہ کام کروانا ہے تو آپ کسی اور سے نہ کہیے، یہ کام میں ہی کروں گا، اس لیے کہ اگر خدا نہ کرے آپ نے کسی اور کو سونپا اور اس نے میرے باپ کا سر قلم کر دیا، پھر بعد میں میرے اوپر غیرت طاری ہوئی، تو کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اپنے باپ کے قاتل کو سوسائٹی میں چلتا پھرتا دیکھ کر اس کو قتل کر دوں اور اپنی عاقبت برباد کرلوں، اس لیے قتل کروانے کا ارادہ ہو تو کسی اور سے یہ خدمت لینے کی ضرورت نہیں ہے، اس خدمت کے لئے میں اپنے آپ کو پیش کرتا ہوں۔ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: نہیں! ہم تو تمہارے باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہتے ہیں، ہمارا ان کو قتل کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکمتِ عملی

پھر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لشکر کو حکم دیا کہ چلو! یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔ دوپہر سے کچھ پہلے کا وقت تھا، لشکر وہاں سے روانہ ہوا اور دن کا بقیہ حصہ چلتے رہے، پھر رات بھر چلے، اور دوسرا دن بھی آدھی دوپہر تک چلتے رہے، گویا پورے چوبیس گھنٹے تک سفر جاری رہا، اتنے لمبے سفر کی وجہ سے لوگ تھک تھکا کر چور ہو گئے، اور جب آپ نے رکنے کا حکم دیا تو لوگ سواریوں سے اترتے ہی سو گئے۔ اور آپ کا مقصد بھی یہی تھا کہ کسی بھی بہانہ سے یہ چرچا بند ہو، اس لیے کہ ایسے چرچے عام طور پر فرصت کے موقعہ پر ہی ہوا کرتے ہیں، جب سب لوگ تھکے ہارے ہوں گے اور نیند کا تقاضا ہوگا تو کون بیٹھے گا؟ اگر کوئی کسی کو پکڑ کر کہے گا کہ آؤ بھائی! بیٹھو، ہم کچھ باتیں کرتے ہیں، تو دوسرا کہے گا کہ: مجھے تو نیند آرہی ہے۔

خیر! جب لوگ روانہ ہوئے تو عبداللہ بن اُبی کو بلا کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا کہ تو نے ایسا کہا ہے؟ تو اس نے قسم کھا کر کہا: اللہ کی قسم! میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی ہے، جو کچھ یہ لڑکا کہہ رہا ہے وہ سب جھوٹ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے مقابلہ میں ایک چھوٹا اور کم عمر لڑکا جو کہہ رہا ہے تو اسی کی بات کو مانا جائے گا، اس چھوٹے کی بات کی طرف کون دھیان دے گا؟ اس لیے لوگوں نے حضرت زید بن اُرقم کو ملامت کرنی شروع کی کہ تو نے یہ کیا حرکت کر ڈالی، ایک بڑے آدمی کو بلا وجہ ذلیل و رسوا اور بدنام کیا۔ حضرت زید بن اُرقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں تو بالکل سچا تھا، لیکن اس کے مقابلہ میں میری حیثیت بہت کم تھی، اس لیے لوگوں نے اسی کی بات کو سچ مانا اور خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم نے ایسا کیوں کیا؟ سارے لوگ مجھے ڈانٹ رہے تھے اور میں لوگوں سے منھ

چھپا رہا تھا، لیکن میں اپنے جی میں یہ سمجھتا تھا کہ اللہ تعالیٰ ضرور میری بات کی سچائی کو ظاہر کریں گے۔ چناں چہ راستہ ہی میں سورۂ منافقون نازل ہوئی، جس میں یہ آیتیں ہیں: ﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ﴾ اے اللہ کے رسول! جب آپ کے پاس منافقین آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، تو اللہ تعالیٰ بھی جانتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ منافقین جھوٹے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے تیرے کان کی تصدیق کی

اسی سورت میں آگے اللہ تعالیٰ نے وہ ساری باتیں بھی نازل فرمائیں جو حضرت زید بن اَرقم نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتلائی تھیں، کہ وہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ ہم میں کا عزت والا جب مدینہ پہنچے گا تو ذلیل کو وہاں سے نکال دے گا۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ جو لوگ اللہ کے رسول کے ساتھ آئے ہیں ان پر خرچ مت کرو؛ تاکہ وہ یہاں سے بھاگ جائیں۔ جب یہ سورت نازل ہوئی تو حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دورانِ سفر ہی میرے پاس آئے اور میرا کان مروڑ کر فرمایا: اے لڑکے! اللہ تعالیٰ نے تیرے کان کی تصدیق کر دی۔ یعنی تم نے جو کچھ کہا تھا وہی درست تھا، اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی تائید آ گئی۔

یہ سورت نازل ہوئی اس سے پہلے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اور دوسرے بعض صحابہ نے عبد اللہ بن اُبی کو سمجھایا کہ اگر تیری بھول ہو گئی ہو تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس چلا جا، معافی مانگ لے، اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کر کہ آپ میرے لیے دعائے

مغفرت کریں، آپ ﷺ کی دعا کی برکت سے تیرا گناہ بھی معاف ہوجائے گا، لیکن اس نے غرور کے مارے منھ پھیر لیا کہ مَیں نہیں جاتا۔ اس کے اس رویّے کا بھی قرآنِ پاک کی اس سورت میں تذکرہ آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: جب ان کو یوں کہا جاتا ہے کہ اللہ کے رسول کے پاس آؤ؛ تاکہ وہ تمہارے گناہوں کی معافی مانگیں؛ تو وہ اپنے سر کو پھرا لیتے ہیں اور انکار کرتے ہیں۔ جب یہ ساری باتیں سامنے آگئیں تو اب تو بات صاف ہوگئی۔

تب اس کو جانے دیا

پھر جب لشکر مدینہ کے قریب پہنچا تو عبداللہ بن اُبی کے بیٹے حضرت عبداللہ نے اپنے باپ کے اونٹ کی نکیل پکڑ کر نیچے بٹھا دیا اور اس پر پاؤں رکھ کر کھڑے ہوگئے اور کہا کہ: میں تم کو مدینہ میں داخل ہونے نہیں دوں گا جب تک تم اس بات کا اقرار نہ کرلو کہ تم خود ذلیل ہو، اور اللہ کے رسول عزت والے ہیں۔ تو عبداللہ بن اُبی کہنے لگا: میں تو عورتوں سے بھی زیادہ ذلیل ہوں، بچوں سے بھی زیادہ ذلیل ہوں، اللہ تعالیٰ کے رسول بڑے عزت والے ہیں۔ حضرت عبداللہ نے کہا: پھر بھی میں تم کو جانے نہیں دوں گا جب تک کہ نبیٔ کریم ﷺ تم کو مدینہ میں داخل ہونے کی اجازت نہ دیں گے۔ سب لوگ جمع ہوگئے، حضور ﷺ کو بھی پتہ چلا تو آپ تشریف لائے اور صاحبزادہ سے فرمایا: چھوڑ دو، اور جانے دو؛ تب انھوں نے اس کو جانے دیا۔

بہرحال! اس قصہ میں حضرت زید بن اَرقم نے حضورِ اکرم ﷺ کو عبداللہ بن اُبی کی باتیں پہنچائیں، اور منافقوں کی غلط روش سے حضور ﷺ کو آگاہ کیا؛ وہ ایک طرح کی غیبت تھی، لیکن ان کے شر سے مسلمانوں کو بچانے کے لئے اس کی ضرورت تھی

اوراس کی اجازت ہے۔اسی کو بتانے کے لیے یہ روایت یہاں لائے ہیں۔

ایک مسئلہ؛لیکن غلط فہمی نہ ہو

۱۵۳۵:- وعن عائشة رَضِيَ اللهُ عنها قالت: قالت هِنْدُ امْرَأَةُ أَبي سفْيَانَ للنَّبِيِّ ﷺ: إنَّ أَبَا سُفْيَانَ رَجُلٌ شَحِيحٌ، وَلَيْسَ يُعْطِينِي مَا يَكْفِينِي ووَلَدِي إلاَّ مَا أَخَذْتُ مِنْهُ وَهُوَ لا يَعْلَمُ؟ قَالَ: ((خُذِي مَا يَكْفِيكِ وَوَلَدَكِ بِالْمَعْرُوفِ)) (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ مع تشریح:۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت ابوسفیان کی بیوی ہند بنت عتبہ نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مسئلہ پوچھا کہ: ابوسفیان بخیل آدمی ہیں، میری اور میرے بچوں کی ضرورتوں کے مطابق خرچہ نہیں دیتے (جس کی وجہ سے ہم کو تکلیف ہوتی ہے) البتہ اگر میں ان کی بے خبری میں ان کے مال میں سے اپنی اوراپنے بچوں کی ضرورت کے مطابق کچھ نکال لوں تو ہی ہماری ضرورتیں پوری ہوسکتی ہیں۔حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا: تمہارے اورتمہارے بچوں کے لئے دستور کے مطابق جتنا کافی ہوجائے اتنا تم اصولی طور پر لے سکتی ہو۔

افادات:۔ہند بنت عتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ ہیں، فتح مکہ کے موقعہ پراسلام لائی تھیں۔روایتوں میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکہ مکرمہ میں فاتحانہ داخل ہونے سے پہلے رات کے وقت ابوسفیان تحقیقِ حال کے لئے ادھر نکلے تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چوکیداروں نے ان کو گرفتار کرکے حضور کی خدمت میں پیش کردیا، پھر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی سفارش پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو چھوڑ دیا، اوراسی موقعہ پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی تاکید پر انہوں نے ایمان بھی قبول کرلیا، اگرچہ اس وقت دل میں ایمان پختگی کے ساتھ نہیں بیٹھا تھا، پھر بعد میں پختہ بھی ہوگیا۔دوسرے روز جب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ مکرمہ میں فاتحانہ

داخل ہوئے اور مکہ والوں نے ایمان لانا شروع کیا تو کوہِ صفا پر بیٹھ کر نبیٔ کریم ﷺ لوگوں سے بیعتِ ایمان لینے لگے، اس وقت عورتوں کی مستقل ایک جماعت آئی اور انہوں نے بھی نبیٔ کریم ﷺ سے بیعتِ ایمان کی، انہیں میں حضرت ہندہ بھی تھیں، چوں کہ بیعت کے اندر حضور اکرم ﷺ نے گناہوں سے بچنے کی تاکید فرمائی، اس لیے انہوں نے یہ مسئلہ پوچھا۔

اب دیکھئے! یہاں حضرت ہندہ کا ابوسفیان کی غیر موجودگی میں ان کے متعلق حضور ﷺ کی خدمت میں یہ کہنا کہ وہ بخیل آدمی ہے؛ یہ ایک طرح کی غیبت ہی کہی جاسکتی ہے، لیکن چوں کہ ان کو مسئلہ پوچھنا تھا کہ ان کی طرف سے نفقہ دینے میں جو کمی رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے بیوی بچوں کو تکلیف ہوتی ہے، اس کا حل کیا ہے، اس لیے انہوں نے سارے حالات حضور اکرم ﷺ کے سامنے پیش کیے۔

یہ مسئلہ سن کر کوئی آدمی یہ نہ سمجھ لے کہ مفتی صاحب نے اجازت دیدی تو اب ہماری تجوریاں کھل جائیں گی۔ نبیٔ کریم ﷺ نے جو اجازت دی اس میں ''دستور کے مطابق'' کی قید لگائی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی عورت کو اس کا شوہر نفقہ اور خرچہ اس کے حق کے مطابق دیتا ہے، لیکن اس کو فضول خرچی کی وجہ سے کمی کی شکایت رہتی ہے؛ تو پھر ایسی عورت کو شوہر کے مال میں سے بلا اجازت لینے کی گنجائش نہیں ہے۔

اور پچھلی مجلس میں آیا تھا کہ جن صورتوں میں غیبت کی اجازت دی ہے اس میں تیسری شکل ''استفتاء'' تھی یعنی کسی مفتی صاحب سے مسئلہ پوچھنے کے لئے کسی کے حالات بتلانے ضروری ہوجائیں؛ تو وہ غیبت میں داخل نہیں ہے، اس کی دلیل کے طور پر یہ روایت یہاں پیش کی ہے۔

باب تحریم النمیمة

چغلی حرام ہونے کا بیان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قال اللہ تعالیٰ:- هَمَّازٍ مَّشَّاءٍۭ بِنَمِيمٍ. (سورۃ القلم: ۱۱)

وقال تعالیٰ:- مَا يَلْفِظُ مِن قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ. (سورۃ ق: ۱۸)

زبان کی حفاظت کے سلسلہ میں مختلف عنوانات چل رہے ہیں، اوپر غیبت کا تذکرہ ہوا، اب نیا باب قائم کیا ہے: چغلی کے حرام ہونے کا بیان۔

چغلی کسے کہتے ہیں؟

چغلی کسے کہتے ہیں؟ خود ہی اس کا مطلب بیان فرماتے ہیں:- ''وھی نَقْلُ الْكَلَامِ بَيْنَ النَّاسِ عَلٰى جِهَةِ الْإِفْسَادِ'' فساد پھیلانے اور نقصان پہنچانے کی غرض سے ایک آدمی کی بات دوسروں کے پاس پہنچانا اور دوسروں کے سامنے نقل کرنا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: چغلی کے متعلق عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی نے کسی کے متعلق کوئی بات کہی اور وہ بات برائی اور عیب کی ہو تب ہی چغلی ہے، مثلاً: زید نے خالد کے متعلق کوئی بات کہی، تو اب سننے والا وہ بات خالد سے جا کر کہے کہ تمہارے متعلق زید نے ایسا ایسا کہا ہے؛ عام طور پر اسی کو چغلی سمجھا جاتا ہے، یہ چغلی ضرور ہے، لیکن چغلی صرف اسی کے اندر محدود نہیں، بلکہ صاحبِ معاملہ کے نزدیک جس بات یا کام کا چھپانا مطلوب و منظور ہو اور وہ اس کو لوگوں کے سامنے ظاہر کرنا پسند نہ کرتا

ہو، اور اس معاملہ کا سننے یا دیکھنے والا اس کو دوسروں کے سامنے ظاہر کر دے؛ تو یہ بھی چغلی میں داخل ہے۔

ہاں! اگر اس کی وجہ سے کسی کو نقصان پہنچتا ہو تو اس کو ظاہر کرنے کی اجازت ہے، جیسا کہ غیبت کے بیان میں تذکرہ آیا تھا کہ کسی مسلمان کو نقصان سے بچانے کے لئے غیبت کی اجازت تھی، وہی اصول چغلی میں بھی ہے۔ جیسے: کسی آدمی نے کسی کے یہاں سے مال چرایا، اور دوسرے نے دیکھ لیا، مثلاً: زید نے خالد کے گھر سے مال چرایا ہے، تو اب وہ آدمی اگر خالد کو اطلاع کر دیتا ہے کہ زید نے تمہارے گھر سے مال چرایا ہے، تا کہ خالد کا مال اس کو واپس مل جائے؛ تو یہ چغلی میں داخل نہیں ہے۔

لیکن اگر زید نے خود اپنا مال کہیں چھپا کر رکھ رہا تھا (عام طور پر آدمی اپنے مال کو حفاظت کی غرض سے چھپا کر ہی رکھتا ہے) اور کسی نے اس کو چھپاتے ہوئے دیکھ لیا اور پھر وہ لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے کہ میں نے دیکھا کہ اس کے پاس پیسے ہیں جو اس نے فلاں جگہ چھپا کر رکھے ہیں، تو چوں کہ زید اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ میرا یہ بھید لوگوں کے سامنے ظاہر ہو کہ میرے پاس یہ چیز ہے، اب جس نے دیکھا وہ کسی کے سامنے اس کو بیان کرے گا؛ تو یہ بھی چغلی میں داخل ہے۔

چغلی کی مختلف شکلیں

اور ایک بات یہ بھی ہے کہ کہنے والے نے کسی کے متعلق کوئی عیب اور برائی کی بات دوسرے تک پہنچائی اسی کو ہم لوگ چغلی سمجھتے ہیں، لیکن چغلی صرف یہی نہیں ہے، بلکہ اس بات کو پہنچانے کی وجہ سے جس کو پہنچائی گئی اس کو دکھ ہو، یا جس نے کہی تھی اس کو دکھ ہو، یا کسی تیسرے آدمی کو اس سے تکلیف ہو؛ یہ سب چغلی میں شمار ہوگا۔ جیسے: زید

اور خالد کے درمیان گفتگو ہورہی تھی، اسی دوران یوسف کا تذکرہ آ گیا تو زید نے خالد سے یوسف کے متعلق کچھ کہا، اور وہ بکر نے سن لیا، اب بکر عمرو سے کہتا ہے کہ زید اور خالد بات کررہے تھے اور انہوں نے یوسف کے متعلق یوں کہا ہے۔ اب یوسف کے متعلق زید اور خالد میں جو بات ہوئی تھی، یوسف پسند نہیں کرتا تھا کہ وہ کسی اور کے سامنے آئے، لیکن اس سننے والے بکر نے عمرو تک وہ بات پہنچائی؛ تو یہ بھی چغلی میں داخل ہے۔ اور پھر چغلی کے لئے زبان سے کہنا ہی ضروری نہیں ہے، بلکہ کوئی آدمی لکھ کر کسی کو اطلاع کرے، یا اشارے سے اطلاع کرے؛ یہ بھی چغلی ہے۔

اسی طرح کسی کی کوئی بات دوسرے تک پہنچائی وہ بھی چغلی ہے، اور کسی کا کوئی کام دوسرے تک پہنچایا تو وہ بھی چغلی ہے۔ اور جس کو پہنچایا گیا ہے چاہے اس کو دکھ نہ ہوا ہو، کسی تیسرے کو دکھ ہورہا ہو؛ تو وہ بھی چغلی ہے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ وہ عیب اور بری بات ہونا ہی ضروری نہیں ہے، بلکہ کوئی اچھا کام یا بات بھی صاحبِ معاملہ چھپانا چاہتا ہو، اس کو دوسروں کے سامنے ظاہر کردینا بھی چغلی میں داخل ہے، جیسے: کوئی آدمی تنہائی میں بیٹھ کر کسی کتاب کا مطالعہ کرتا ہے، اور اس کو پسند نہیں کہ میرے اس کتاب کے مطالعہ والے اہم معاملہ کا کسی کو پتہ چلے، اور وہ اپنے طور پر یہ کام چھپ کر کررہا ہے، کسی نے دیکھ لیا کہ وہ فلاں کتاب کا مطالعہ کرتا ہے۔ اب یہاں اگر لوگوں کو پتہ چل جائے گا کہ فلاں آدمی فلاں کتاب کا مطالعہ کررہا تھا تو اس کے لیے کوئی عیب نہیں ہے، لیکن چوں کہ وہ اس کا ظاہر ہوجانا پسند نہیں کرتا تھا اور دوسرے نے اس کو ظاہر کردیا تو یہ بھی چغلی میں داخل ہے۔

اسی لیے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: لوگوں کے جو بھی حالات آپ دیکھیں

اگر کوئی کام کرتے ہوئے دیکھیں، یا کسی کو کچھ کہتے ہوئے سنیں، تو بس خاموشی اختیار کرلو؛ اس کام اور بات کا کسی کے سامنے اظہار نہ کرو۔ ہاں! اگر اس کی وجہ سے کسی کو نقصان پہنچ سکتا ہے، اور صرف اس کو نقصان سے بچانے کی نیت سے وہ بات اس تک پہنچا رہے ہو تو اس کی گنجائش ہے، اور وہ چغلی میں داخل نہیں ہے۔

چغلی برا کام ہے

یہاں چغلی کی برائی کے سلسلہ میں قرآنِ پاک کی دو آیتیں پیش کی ہیں:-

﴿هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيمٍ﴾ لوگوں پر عیب لگانے والا اور چغلی کرنے والا ہے۔ اس آیت میں اس حرکت کو شناعت وقباحت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ چغلی برا کام ہے۔

گناہوں سے روکنے کا مؤثر ترین ذریعہ

اور باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ آدمی جو بھی بات بولتا ہے (تو ہر ایک کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ) اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے اوپر ایک چوکس نگران موجود ہے۔

اور دیکھو! آدمی کو گناہوں سے روکنے کے لئے جو چیز زیادہ مؤثر ہے وہ یہی احساس اور خیال کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہے، اور میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں، چاہے کوئی کام کر رہا ہوں، یا کوئی بات بول رہا ہوں، یا کوئی حرکت کر رہا ہوں؛ میری ہر ہر چیز سے اللہ تعالیٰ واقف ہے، اور مجھے کل اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کا جواب دینا ہے۔ اگر کسی آدمی کو احتساب کا ڈر ہوگا یعنی یہ احساس ہوگا کہ میرے اس کام کی اللہ

تعالیٰ کی طرف سے نگرانی ہورہی ہے اور مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہے؛ تو اس صورت میں اگر وہ تنہائی میں ہوگا تب بھی اپنے آپ کو گناہوں سے بچائے گا۔

آج حکومت کے قوانین لوگوں کو گناہ سے کیوں نہیں روک پاتے؟ حالاں کہ قوانین ان پر عمل کرانے کے واسطے ہی بنائے جاتے ہیں، اور عمل کرانے والا پولیس کا پورا عملہ ہوتا ہے، اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس کے لئے باقاعدہ عدلیہ اور کورٹ کا پورا نظام بنا ہوا ہے جو اس کے خلاف کارروائی کر کے اس کو اس جرم کی سزا دیتا ہے۔ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود جرائم کا سلسلہ بند نہیں ہوتا۔ کیوں؟ اسی لیے کہ دلوں میں احتساب کا ڈر اور جذبہ نہیں ہے۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو دین لے کر آئے ہیں اور دیگر حضرات انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا بھی خلاصہ یہی ہے کہ آدمی کے دل میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا خوف پیدا کر دیا جائے، اور یہ جذبہ بیدار کر دیا جائے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہو کر جواب دینا ہے۔ اگر یہ جذبہ پیدا ہو جائے گا تو آدمی لوگوں کے سامنے ہوگا تب بھی، اور تنہائیوں میں ہوگا تب بھی؛ کبھی اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرے گا، اس لیے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ بھلے ہی لوگ مجھے نہیں دیکھ رہے ہیں، میں رات کی اندھیری میں ہوں، یا جنگل کی تنہائیوں میں ہوں، اور میر ی اس حرکت کو دیکھنے والا میرے سامنے کوئی موجود نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے، اور مجھے اس کو جواب دینا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ کہاں گیا؟

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ سفر میں تشریف لے جا رہے تھے، بھوک کا احساس ہوا تو دیکھا کہ جنگل کے اندر ایک آدمی بکریاں چرا رہا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے

اس سے کہا: مجھے بھوک لگ رہی ہے، تم مجھے بکری کا دودھ دُوہ کردے دو۔ چرواہے نے کہا: یہ بکریاں میری نہیں، بلکہ میرے آقا کی ہیں، میں تو غلام ہوں اور میرے آقا نے چرانے کے لئے میرے حوالے کی ہیں، اس کا دودھ دُوہ کر کسی کو دینے کا مجھے اختیار نہیں ہے۔ حضرت ابن عمرؓ نے سوچا کہ ذرا اس کا امتحان لیا جائے!۔ اس سے کہا: اچھا! میں تم کو ایک تدبیر بتلاتا ہوں جس میں تمہارا بھی فائدہ ہے اور میرا بھی فائدہ ہے۔ پوچھا: وہ کیا ہے؟ فرمایا: ایسا کرو کہ تم ایک بکری مجھے بیچ دو، میں اس کی قیمت تم کو ادا کر دیتا ہوں مجھے بکری مل جائے گی تو پھر میری کھانے پینے کی جو ضرورت ہے وہ دودھ سے پوری ہو جائے گی، اور تم کو بکری کی قیمت مل جائے گی۔ رہا تمہارا آقا! تو اگر وہ تم سے پوچھے کہ ایک بکری کا کیا ہوا؟ تو اس کو بتا دینا کہ بھیڑیا کھا گیا۔ آقا کو کیا پتہ چلے گا، جب تم اس سے یہ کہو گے تو وہ مان لے گا۔ اس لیے کہ اُس زمانہ میں عام طور پر بھیڑیے بکریوں کے ریوڑوں پر حملہ کر دیا کرتے تھے جس کے نتیجہ میں ایک دو بکریاں گھٹ جاتی تھیں۔ یہ سن کر وہ غلام کہنے لگا: ''یَاهٰذَا، فَأَیْنَ اللہ؟'' اے بھلے آدمی! پھر اللہ تعالیٰ کہاں گیا؟ یعنی اللہ تعالیٰ تو دیکھ رہا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ چرواہے کے اس قصے کو بیان فرماتے تھے اور اس کے اس جملہ کو مزہ لے لے کر دہرایا کرتے تھے کہ: ایک چرواہا جنگل کی تنہائیوں میں یہ کہتا ہے کہ: اللہ تعالیٰ کہاں گیا؟ اللہ تعالیٰ کہاں گیا؟۔

آدمی کے دل میں جب یہ جذبہ بیدار ہو جائے تو پھر آدمی کہیں بھی، کسی بھی حالت میں ہو؛ کبھی کوئی نافرمانی نہیں کیا کرتا۔ اسی احساس کو مستحضر کرنے کے لئے باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہر انسان کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ وہ جو کچھ بھی بول رہا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے اس بول پر ایک نگران (فرشتہ) مقرر ہے جو بالکل

چوکس ہے، ذرّہ برابر بھی غفلت میں نہیں ہے، برابر نگرانی کر رہا ہے، آدمی جو چیز بھی بولتا ہے وہ فرشتہ اس کو نوٹ کر لیتا ہے اور اس کا پورا ریکارڈ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا جائے گا اور اس کو اس کا جواب دینا ہوگا۔ جو آدمی ہر وقت یہ سمجھے گا تو پھر بھلا وہ چغلی، غیبت یا زبان کے کسی بھی گناہ کرنے کی جرأت کرے گا؟

چغل خور جنت میں نہیں جائے گا

۱۵۳۶:۔وعن حذیفة رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ نَمَّامٌ. (متفق علیہ)

ترجمہ:۔حضرت حذیفہؓ بن یمان فرماتے ہیں کہ نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: چغل خور جنت میں نہیں جائے گا۔

افادات:۔آج ہمارے معاشرے اور سوسائٹی میں اس طرح کی چیزیں بہت عام ہو چکی ہیں۔ لوگ دوسروں کے حالات کی ٹوہ لگے رہتے ہیں اور ادھر کی ادھر کرتے رہتے ہیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ بعض لوگ نقصان پہنچانے کی غرض سے نہیں بلکہ صرف تفریح کی غرض سے اس میں مبتلا رہتے ہیں کہ کسی کو کچھ کرتے ہوئے دیکھا تو دوسری طرف جا کر دوستوں کی محفل میں تفریح اور وقت گذاری، ٹائم پاس کے طور پر کہتے ہیں کہ: ارے یار! فلاں تو یوں کر رہا تھا۔ بعضوں کا تو مشغلہ ہی یہی ہوتا ہے کہ لوگوں کے جو حالات ان کی نگاہوں کے سامنے آتے ہیں ان کو دوسروں کے سامنے بیان کرتے رہتے ہیں؛ یہ بھی چغلی میں داخل ہے۔ آدمی اپنی نادانی، جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے ایسی چیز اپنی زبان سے بول دیتا ہے جس پر نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اتنی سخت وعید ارشاد فرمائی کہ ایسا آدمی جنت میں نہیں جائے گا۔

اب یہ سوال ہوتا ہے کہ کیا ہمیشہ نہیں جائے گا؟ حالاں کہ ایمان والوں کو اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر جنت میں جانے کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ کیا گیا ہے۔

تو حضراتِ علماء فرماتے ہیں: ''لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ نَمَّامٌ مَادَامَ نَمَّامًا'' وہ چغلی کے اس کے گناہ کی وجہ سے جہنم میں بھیجا گیا اور اس گناہ کی سزا پوری کر کے اس کو اس گناہ سے پاک کر دیا گیا؛ اب تو وہ نمّام یعنی چغل خور نہیں رہا، بلکہ چغلی کا گناہ اس سزا بھگتنے کی وجہ سے صاف ہو گیا، تو اب وہ اس لائق ہو جائے گا کہ اس کو جنت میں بھیجا جائے۔

عذابِ قبر میں مبتلا کرنے والے دو گناہ

۱۵۳۷:-وعن ابن عباسٍ رضی الله عنهما : أَنَّ رسولَ الله ﷺ مرَّ بِقَبْرَيْنِ فَقَالَ:((إِنَّهُمَا يُعَذَّبَانِ، وَمَا يُعَذَّبَانِ فِى كَبِيرٍ ! بَلَى إِنَّهُ كَبِيرٌ : أَمَّا أَحَدُهُمَا، فَكَانَ يَمْشِي بِالنَّمِيمَةِ، وأَمَّا الآخَرُ فَكَانَ لَا يَسْتَتِرُ مِنْ بَوْلِهِ)).

(متفق عَلَيْهِ. وهذا لفظ إحدى روايات البخاري)

قَالَ العلماءُ معنى: ((وَمَا يُعَذَّبَانِ فِى كَبِيرٍ)) أيْ: كَبِيرٍ فِى زَعْمِهِمَا. وقِيلَ: كَبِيرٌ تَرْكُهُ عَلَيْهِمَا

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ کا گزر دو قبروں پر ہوا تو حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان دونوں قبر والوں کو قبر میں عذاب ہو رہا ہے، اور کسی بڑی بات پر عذاب نہیں ہو رہا ہے، لیکن حقیقت میں وہ دونوں بہت بڑے گناہ ہیں، ان میں سے ایک تو لوگوں کی چغلی کیا کرتا تھا، اور دوسرا اپنے پیشاب سے نہیں بچتا تھا۔

افادات:- اللہ تعالیٰ عالمِ برزخ کے احوال کبھی کبھار نبیٔ کریم ﷺ پر کھول دیتے تھے تاکہ آپ ﷺ لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کر کے نصیحت فرمائیں، حتّٰی کہ عبرت کے لئے کبھی کبھی عام انسانوں پر بھی وہاں کے احوال کو کھول دیا جاتا ہے۔

''کسی بڑی بات پر عذاب نہیں ہو رہا ہے'' یعنی ان کے خیال اور ذہن میں یہ کوئی بڑی چیز نہیں تھی اور وہ ان کو معمولی سمجھتے تھے۔ یا یہ مطلب ہے کہ ایسے مشکل کام نہیں تھے جن کو چھوڑنا مشکل ہو، اگر بچنا چاہتے تو آسانی سے بچ سکتے تھے، اس معنیٰ کر فرمایا کہ وہ کوئی بڑی چیز نہیں تھی۔ ورنہ آگے خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی فرماتے ہیں کہ حقیقت میں وہ دونوں بہت بڑے گناہ ہیں، لیکن اگر آدمی ارادہ کر لے اور ہمت سے کام لے تو ان سے بچنا کوئی مشکل نہیں۔ جتنے بھی گناہ ہیں ان تمام کے متعلق آدمی اگر یہ سوچ لے کہ مجھے نہیں کرنے ہیں، اور پھر جب بھی دل میں ان گناہوں کے کرنے کا تقاضہ پیدا ہو اس وقت ہمت سے کام لے کر اپنے آپ کو ان سے بچائے اور روک لے؛ تو ان سے بچنا اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔

''لَا یَسْتَتِرُ مِنْ بَوْلِهِ'' کا مطلب بعض لوگوں نے یہ بیان کیا ہے کہ پیشاب کرتے وقت لوگوں سے اپنا ستر چھپانے کا جو اہتمام کرنا چاہیے وہ نہیں کرتا تھا، جیسا کہ بعض لوگ سب کے سامنے اپنا ستر کھول کر پیشاب پاخانہ کرنے کے لئے اس طرح بیٹھ جاتے ہیں کہ لوگ دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ تو ان میں سے ایک ایسا ہی تھا کہ اپنے ستر کو لوگوں سے چھپانے کا اہتمام نہیں کرتا تھا، لوگوں کے سامنے اپنا ستر کھولے ہوئے پیشاب کر لیا کرتا تھا۔ اور بعضوں نے کہا کہ پیشاب کے چھینٹوں سے اپنے آپ کو بچاتا نہیں تھا؛ اس لیے آدمی کو پیشاب کرتے وقت بہت زیادہ احتیاط کرنے کی ضرورت ہے کہ پیشاب کرنے کے دوران قطرے اور چھینٹے اپنے کپڑوں یا جسم کو لگنے نہ پائیں۔ اگر آدمی اس سے نہیں بچے گا تو عذابِ قبر میں مبتلا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس سے حفاظت فرمائے۔

یہاں تو یہ روایت اس لیے لائے ہیں کہ دیکھو! چغلی ایک ایسا گناہ ہے جس کی

وجہ سے آدمی عذابِ قبر میں مبتلا ہوجاتا ہے، حالاں کہ ان سے بچنا بہت آسان ہے پھر بھی لوگ اس کا اہتمام نہیں کرتے۔

سلامتی اسی میں ہے کہ

۱۵۳۸:-وعن ابن مسعود رضی الله عنه: أن النبی ﷺ قال: ((أَلَا أُنَبِّئُكُمْ مَا العَضْهُ؟ هِيَ النَّمِيمَةُ؛ القَالَةُ بَيْنَ النَّاسِ)). (رواه مسلم)

((العَضْهُ)): بفتح العين المهملة، وإسكان الضاد المعجمة، وبالهاء عَلَى وزن الوجهِ. ورُوِي ((العِضَةُ)) بكسر العين وفتح الضاد المعجمة عَلَى وزن العِدَة. وهي: الكذب والبُهتان، وعلى الرِّواية الأولى: العَضْهُ مصدرٌ يقال: عَضَهَهُ عَضهاً، أيْ: رماهُ بالعَضْهِ.

ترجمہ:-حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں بتلاؤں کہ عضہ کیا ہے؟ عضہ یعنی چغلی، لوگوں کے درمیان کسی کی بات کو پیش کرنا۔

آگے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ وضاحت کرتے ہیں کہ بعضوں نے ''اَلْعَضْہُ'' پڑھا ہے جس کا معنیٰ چغلی کرنا۔ اور بعضوں نے ''الْعِضَۃُ'' پڑھا ہے جس کا معنیٰ جھوٹ بولنا اور کسی کے اوپر بہتان لگانا۔

افادات:- بہرحال چغلی خطرناک گناہ ہے، آدمی کو اس سے اپنے آپ کو بچانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کے جو بھی حالات آدمی کی نگاہوں کے سامنے آویں، یا کان میں پڑیں؛ سلامتی اسی میں ہے کہ آدمی خاموش رہے، چاہے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو، یا کانوں سے سنا ہو؛ ہر حال میں کسی کے بھی سامنے اس کے اظہار سے اپنے آپ کو بچائے؛ تب ہی چغلی سے بچ سکتا ہے۔

باب النهي عن نقل الحديث وكلام الناس إِلَى ولاة الأمور إِذَا لَمْ تَدْعُ إِلَيْهِ حاجة كخوف مفسدة ونحوه

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نیا عنوان قائم کیا ہے: حاکموں اور عہدہ داروں کے سامنے بھی لوگوں کی باتوں کو پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے جب کہ کسی قسم کی خرابی اور نقصان کا اندیشہ نہ ہو، ہاں! اگر چند لوگ بیٹھ کر کوئی سازش کر رہے ہیں اور مشورہ کر رہے ہیں کہ مثلاً: کل فلاں کے یہاں چوری کرنی ہے، یا فلاں کو قتل کرنا ہے، اور ان کا یہ پلان کسی نے سن لیا تو اس صورت کے اندر اگر اس کی اطلاع حاکم کو کر دی جائے کہ اس کے نتیجہ میں اس برائی اور نقصان سے لوگوں کی حفاظت ہو جائے گی؛ تو یہ تو ضروری ہے۔ لیکن اگر ایسی بات نہیں ہے، ویسے ہی کچھ لوگ آپس میں مل کر اگر بیٹھتے ہیں، باتیں کرتے ہیں، تو جیسا کہ بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ لوگوں کی ہر ہر چیز حکمرانوں تک پہنچاتے رہتے ہیں کہ فلاں فلاں دو آدمی بیٹھے تھے اور ایسی ایسی باتیں کر رہے تھے، یا فلاں آدمی فلاں جگہ گیا تھا؛ یہ بھی کبیرہ گناہ ہے، اس سے بھی اپنے آپ کو بچانا چاہیے۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ گناہ اور سرکشی کے کاموں میں لوگوں کی مدد مت کرو۔

میرا سینہ لوگوں کی طرف سے بالکل صاف ہو

۱۵۳۹:-وعن ابن مسعودٍ-رضی الله عنه-قَالَ قَالَ رسُولُ الله ﷺ:

((لا يُبَلِّغُنِي أَحَدٌ مِنْ أَصْحَابِي عَنْ أَحَدٍ شَيْئاً ،فإِنِّي أُحِبُّ أَنْ أَخْرُجَ إِلَيْكُمْ وأَنَا سَليمُ الصَّدْرِ)). (رواه أبوداودوالترمذي)

ترجمہ:-حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:تم میں سے کوئی میرے صحابہ کے متعلق کوئی بات مجھ تک نہ پہنچائے،اس لیے کہ میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ میں تمہارے درمیان ایسی حالت میں آؤں کہ میرا سینہ اور دل لوگوں کی طرف سے بالکل سلامت اور صاف ہو۔

افادات:-اور جب کسی کے متعلق کوئی بات پہنچائی جائے گی تو ظاہر ہے کہ جس کو بات پہنچائی گئی ہے اس کے دل میں جس کی بات پہنچائی گئی ہے اس کے متعلق کدورت اور میل آجائے گا۔مثلاً:کسی نے کہا کہ آپ کے متعلق فلاں آدمی یوں بول رہا تھا،فلاں آدمی یوں کرر ہا تھا،تو اس بات کو سننے کے نتیجہ میں اب اس کے متعلق دل صاف نہیں رہے گا۔

حضورِاکرم ﷺ کے پاس منافقین اہلِ ایمان کی باتیں اس طرح پہنچاتے رہتے تھے،تو حضورِاکرم ﷺ نے منع فرمادیا کہ کوئی بھی آدمی میرے صحابہ کی کوئی بات مجھ تک نہ پہنچائے۔اس لیے کہ اگر کسی کی کوئی بات پہنچے گی تو ظاہر ہے کہ اس کے متعلق دل میں جیسی صفائی رہنی چاہیے وہ نہیں رہے گی،اور دل میں ایک میل سا آجائے گا۔ حضورِاکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ میں جب تمہارے درمیان میں آؤں تو میں یہ چاہتا ہوں کہ میرا دل ہر ایک کی طرف سے صاف ہو،اس میں کسی کے متعلق کسی قسم کا میل نہ

ہو۔اوراس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ حضورا کرم ﷺ کا تعلق اپنی امت کے ساتھ ایک رسول کا تھااورظاہر ہے کہ اگر خدانخواستہ آپ کے دل میں کسی کے متعلق کوئی میل ہوا تو آپ کا فیض لوگوں کو نہیں پہنچے گا۔اس لیے یہ ضروری تھا کہ حضورا کرم ﷺ کی امت کا ہر ہر فرد حضور ﷺ سے فائدہ اٹھانے والا بن جائے،اس لیے حضورا کرم ﷺ نے اس کی خاص طور سے تاکید فرمائی۔

باب ذَمِّ ذِي الْوَجْهَيْنِ

دو چہرے والے کی برائی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دو چہرے والا یعنی ایسا آدمی جس کو ہم اپنی زبان میں ''دوغلا'' کہتے ہیں، قرآن وحدیث میں اس کی بھی بہت سخت برائی اور وعید آئی ہے۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿یَسۡتَخۡفُوۡنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا یَسۡتَخۡفُوۡنَ مِنَ اللّٰہِ وَھُوَ مَعَھُمۡ اِذۡ یُبَیِّتُوۡنَ مَا لَا یَرۡضٰی مِنَ الۡقَوۡلِ، وَکَانَ اللّٰہُ بِمَا یَعۡمَلُوۡنَ مُحِیۡطًا﴾ بعض لوگ ایسے ہیں جو گناہ کرتے وقت اپنے آپ کو لوگوں سے تو چھپانے کا اہتمام کرتے ہیں، یعنی ان کی پوری کوشش یہ تو ہوتی ہے کہ ہم کو گناہ کرتے ہوئے کوئی نہ دیکھ لے؛ لیکن اللہ تعالیٰ جو ہر چیز سے واقف ہے جو ان کو دیکھ رہا ہے، اس سے چھپنے کا اہتمام نہیں کرتے؟ جب وہ ایسی چیزوں اور باتوں کی تدبیر کرتے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ خوش نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ ان کے تمام اعمال کو گھیرے ہوئے ہے، بندے جو کچھ بھی کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی ہر ہر چیز سے واقف ہے۔

میں نے شروع میں بتلا دیا تھا کہ آدمی کے دل میں ہمیشہ یہ احساس بیدار رہنا چاہیے کہ میں جو کچھ بولتا اور کرتا ہوں؛ اس سب کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے، اور مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کا حساب دینا ہے۔

سب سے برا آدمی

۱۵۴۰:-وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ:

((تَجِدُونَ النَّاسَ مَعَادِنَ: خِيَارُهُم فِي الجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الإِسْلَامِ إِذَا فَقُهُوا. وتَجِدُونَ خِيَارَ النَّاسِ فِي هَذَا الشَّأْنِ أَشَدَّهُمْ كَرَاهِيَةً لَهُ. وَتَجِدُونَ شَرَّ النَّاسِ ذَا الوَجْهَيْنِ، الَّذِي يَأْتِي هؤُلَاءِ بِوَجْهٍ، وَهَؤُلَاءِ بِوَجْهٍ)). (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:-حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگوں کو تم کانوں کی طرح پاؤ گے۔ان میں کا جو(گھرانہ اور خاندان) زمانۂ جاہلیت میں عمدہ اور بہتر سمجھا جاتا تھا اسلام میں داخل ہونے کے بعد بھی وہ بہتر ہی رہے گا جب کہ وہ دینی علم حاصل کرلے۔اور تم لوگوں میں اس آدمی کو بہترین پاؤ گے جو اس امارت کو سب سے زیادہ ناپسند کرتا ہو(مطلب یہ ہے کہ جو لوگ حکمرانی سے جتنے دور ہیں وہ اتنے ہی اچھے ہیں، اس لیے دل میں اس کا جذبہ نہیں ہونا چاہیے کہ مجھے کرسی مل جائے۔کرسی، منصب اور عہدہ سے جو اپنے آپ کو جتنا زیادہ دور رکھے گا وہ اتنا ہی اچھا آدمی ہے۔ہاں! اگر ناپسندیدگی کے باوجود ذمہ داروں کی طرف سے زبردستی وہ کام اس کو سونپا گیا تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد بھی ہوتی ہے) اور تم لوگوں میں سب سے برا اس آدمی کو پاؤ گے جو دو چہرے والا ہو، جو ایک کے سامنے آتا ہے تو ایک بات کرتا ہے اور دوسرے کے سامنے جاتا ہے تو دوسری بات کرتا ہے(ایسا آدمی اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے زیادہ برا ہے، اور اس کے لئے سخت وعید ہے)۔

افادات: کان؛ جس کو ہم گجراتی میں (ખાણ) اور انگریزی میں (Mainse) کہتے ہیں۔مختلف چیزوں کی کانیں ہوتی ہیں، جتنے بھی معدنیات ہیں وہ سارے کے سارے کانوں سے حاصل ہوتے ہیں، جیسے: سونا، چاندی، تانبہ، لوہا، کوئلہ، وغیرہ

وغیرہ؛ ہر ایک چیز اسی کی کان اور معدن سے ملا کرتی ہے، وہ اس کان کی خصوصیت کہنی چاہیے، اسی طرح لوگوں کا حال بھی ہے۔ یعنی ہر ہر گھرانے اور خاندان کا اپنا خاص وصف اور خصوصیت ہوا کرتی ہے جو اس خاندان کے افراد میں پائی جاتی ہے، جیسے: کوئی گھرانہ علمی ہوتا ہے تو اس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس گھر کے ہر ہر فرد کو علم سے خاص لگاؤ ہوتا ہے، اور اس کا ہر ایک فرد کسی نہ کسی علمی خدمت کے اندر لگا ہوا ہوتا ہے۔ تو خاندانی اوصاف اور خوبیوں کے ساتھ اگر ایمان بھی مل جائے تو پھر ایمان ان ساری خوبیوں کو اور زیادہ جلا بخش دے گا، جیسے: آج ہی ایک صاحب بتا رہے تھے کہ میں ایک غیر مسلم بھائی سے ملا اور ان سے گفتگو کی نوبت آئی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان میں ساری خوبیاں ہیں، فقط ایمان کی کمی ہے۔ تو ایسا ہوتا ہے کہ بعض گھرانے خاندانی طور پر ایسے ہوتے ہیں کہ اس سے تعلق رکھنے والے تمام افراد میں بھی وہی سب خوبیاں پائی جاتی ہیں، جیسے: سمجھداری، تحمل و بردباری، سخاوت، بہادری ہوتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان سارے اوصاف کے ہوتے ہوئے بھی جو کام بھی انجام دیئے جائیں گے ان کا اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہونا ایمان کے اوپر موقوف ہے، اگر ان میں ایمان نہیں ہے تو سب چیزیں بیکار ہو جائیں گی۔ اس لیے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ لوگ بھی کانوں کی طرح ہیں، زمانۂ جاہلیت میں جو شریف اور عمدہ سمجھے جاتے تھے، اسلام لانے کے بعد بھی وہ وہی سمجھے جائیں گے، یعنی اسلام نے تو ان کی ان خوبیوں میں گویا چار چاند لگا دیئے۔ جب کہ وہ دینی علم حاصل کرلیں یعنی علمِ دین حاصل کرنے کے بعد اس پر اور زیادہ پالش چڑھ جاتی ہے۔

یہاں تو یہ روایت اس لیے لائے ہیں کہ جو آدمی دو چہرے والا ہو کہ ایک کے

سامنے ایک بات کرے اور دوسرے کے سامنے دوسری بات کرے؛ ایسے آدمی کو لوگوں میں سب سے برا فرمایا گیا ہے۔

منافقت یہی ہے

۱۵۴۱: -وعن محمد بن زيدٍ: أَنَّ ناساً قالوا لجدِّهِ عبدِ اللهِ بن عمر رضی اللہ عنہما : إِنَّا نَدْخُلُ عَلَى سَلاَطِينِنَا فَنَقُولُ لَهُمْ بِخِلاَفِ مَا نَتَكَلَّمُ إِذَا خَرَجْنَا مِنْ عِنْدِهِمْ. قَالَ: كُنَّا نَعُدُّ هَذَا نِفَاقاً عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ. (رواه البخاری)

ترجمہ: -حضرت محمد بن زید کہتے ہیں کہ کچھ لوگ ہمارے دادا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس حاضر ہوئے اور کہا: ہم جب ہمارے حکمرانوں کے پاس جاتے ہیں تو ان سے ایسی باتیں کرتے ہیں جو اس کے خلاف ہوتی ہیں جو ان کے پاس سے نکلنے کے بعد ہم کرتے ہیں (یعنی باہر آکر تو ان کی برائی کرتے ہیں لیکن ان کے سامنے ان کی تعریف کرتے ہیں) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ارشاد فرمایا: نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں ہم اس کو نفاق شمار کرتے تھے۔

افادات: -منافقت یہی ہے کہ کسی کے سامنے اس کی تعریف کریں اور بعد میں اس کی برائی کریں۔ اگر آپ کا دل اس سے مطمئن ہی نہیں ہے تو پھر سامنے بھی تعریف کیوں کرتے ہو۔ کسی کے سامنے یہ ظاہر کرنا کہ میں آپ کا مداح ہوں اور وہاں سے نکل کر اس کی برائیاں کرنا؛ یہ تو ایک طرح کا دھوکہ اور نفاق ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں ہم اس کو منافقت ہی خیال کرتے تھے کہ ظاہر میں کچھ ہو اور باطن میں کچھ ہو۔ آدمی کو ایسا نہیں ہونا چاہیے، اس سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔

باب تحریم الکذب

جھوٹ کی حرمت کا بیان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قال اللہ تعالیٰ :- وَلَا تَقۡفُ مَا لَیۡسَ لَکَ بِہٖ عِلۡمٌ. (الاسرأ: ۳۶)

وقال تعالیٰ :- مَا یَلۡفِظُ مِنۡ قَوۡلٍ اِلَّا لَدَیۡہِ رَقِیۡبٌ عَتِیۡدٌ. (ق: ۱۸)

زبان کی حفاظت کا بیان چل رہا ہے، زبان کی بے احتیاطی اور غلط استعمال کے نتیجہ میں جو گناہ سرزد ہوتے ہیں ان میں سے غیبت اور چغلی کا پہلے بیان آ چکا۔ یہاں علامہ نوویؒ نے نیا باب قائم کیا ہے: جھوٹ کا حرام ہونا۔

جھوٹ بھی وہ گناہ ہے جو زبان سے سرزد ہوتا ہے۔ اور ہر آدمی جانتا ہے کہ جھوٹ کس کو کہتے ہیں، اس کی وضاحت اور تشریح کی کوئی ضرورت نہیں ہے، البتہ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ جیسے اور معاملات میں ہوتا ہے یہاں پر بھی ہم لوگوں نے جھوٹ کو کچھ حالات یا چیزوں کے ساتھ خاص کر رکھا ہے کہ صرف یہی جھوٹ ہے، حالاں کہ ہماری روزمرہ کی زندگی میں معاشرہ میں ہماری جانب سے بہت سی چیزوں میں جھوٹ کا ارتکاب ہوتا ہے، لیکن مرتکب کا خیال اور وہم بھی اس طرف نہیں جاتا کہ میں جھوٹ کا ارتکاب کر رہا ہوں۔ جیسے: ایک سچا اچھا پڑھا لکھا آدمی جو نماز روزہ کا پابند ہے، بزرگوں کی صحبت میں اٹھتا بیٹھتا ہے اور دین دار ہے، لیکن وہ بھی جب بعض معاملات کو انجام دیتا ہے تو اس کو خیال بھی نہیں ہوتا کہ میں اس کام کو کر کے جھوٹ کے گناہ میں مبتلا

ہو رہا ہوں۔ آگے اس سلسلہ میں تفصیل عرض کروں گا۔

جیسا کہ علامہ نوویؒ ہر باب کے شروع میں اس موضوع کے مناسب کچھ آیتیں پیش کرتے ہیں۔ یہاں بھی ایک دو آیتیں پیش کی ہیں:۔

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ﴾ جس کا تمہیں علم نہ ہو اس بات کو اپنی طرف سے مت کہو اور اس کے درپے نہ ہو۔ یعنی جو بات تم نہیں جانتے اگر وہ کہو گے تو ظاہر ہے کہ جھوٹ ہو جائے گا اور غلط شہادت کو شامل ہو جائے گا۔ اس لیے کہ گواہی کے لیے یہ ضروری ہے:﴿إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ آدمی اس بات کو جانتے ہوئے اس کے متعلق اطلاع دے تب ہی وہ گواہی ہے، لیکن ایک آدمی جانتا نہیں ہے اور وہ اس کے متعلق کہے گا تو وہ جھوٹی گواہی ہو جائے گی۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ علامہ نوویؒ نے اس آیت کو پچھلے ابواب میں بھی ذکر کیا تھا کہ آدمی جو بات بھی اپنی زبان سے نکالتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے اوپر ایک چوکس نگراں مقرر ہے جو اس کی زبان سے نکلنے والی ہر ہر بات کو ریکارڈ کرتا ہے۔ اور میں پہلے بتلا چکا ہوں کہ آدمی کو جب یہ احساس پیدا ہو جائے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اور اس کو محفوظ بھی کیا جا رہا ہے، تو اس صورت میں پھر گناہ اور نافرمانی سے بچنا آسان ہو جائے گا۔ جیسے: ہم اور آپ یہاں بیٹھے ہیں، اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ اس جماعت خانہ کے اندر ایسے آلات فٹ کیے گئے ہیں جن کے ذریعہ ہماری ہر حرکت وسکون سے واقف ہوا جاتا ہے، ہم جو کچھ بولتے ہیں اس سے ان آلات کو فٹ کرنے والوں کو واقفیت ہوتی ہے؛ تو ہم اور آپ ہر ہر حرکت بہت احتیاط کے ساتھ انجام دیں گے اور ہر بات بڑی

احتیاط کے ساتھ اپنی زبان سے نکالیں گے۔ تو جب ہمارا یہ ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر آدمی پر باقاعدہ فرشتے مقرر ہیں جو ہر بات کو نوٹ کرتے ہیں تو پھر جیسے ہم دنیا کے حکمرانوں سے ڈرتے ہوئے احتیاط برتتے ہیں، وہاں بھی احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔

سچائی کا ایک بہت بڑا فائدہ

۱۵۴۲:-وعن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رسولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم:((إنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إلَى البِرِّ، وإنَّ البِرَّ يَهْدِي إلَى الجَنَّةِ، وإنَّ الرَّجُلَ لَيَصْدُقُ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللهِ صِدِّيقاً. وإنَّ الكَذِبَ يَهْدِي إلَى الفُجُورِ، وإنَّ الفُجُورَ يَهْدِي إلَى النَّارِ، وإنَّ الرَّجُلَ لَيَكْذِبُ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللهِ كَذَّاباً)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سچ؛ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری کی طرف لے جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری آدمی کو جنت تک لے جاتی ہے، اور آدمی سچ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں (صدیق) سچا لکھا جاتا ہے۔ اور بے شک جھوٹ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی طرف لے جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی جہنم تک پہنچاتی ہے، اور آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں (کذّاب) جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے (گویا اس کے بعد اس کو سچ کی توفیق نہیں ہوتی۔ یعنی آدمی اگر سچائی کی عادت ڈالے تو اس کا خاصہ اور اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری اور نیکی کے راستہ پر چلنے کی توفیق ہوگی)۔

آسان نسخہ

افادات: - یہاں سچائی کا ایک بہت بڑا فائدہ بتایا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہم اور آپ اپنی زندگی میں جن مختلف گناہوں کے عادی ہو چکے ہیں، متعدد نافرمانیاں ہم سے سرزد ہو جاتی ہیں، اور ہم چاہتے ہیں کہ ان سے اپنے آپ کو بچائیں، اور جب اس کا احساس ہوتا ہے تو اس کے لیے مختلف تدبیریں بھی عمل میں لائی جاتی ہیں لیکن ان تدبیروں کے ذریعہ سے بھی ہم اپنے آپ کو ان برائیوں سے بچانے کے معاملہ میں کامیاب نہیں ہو پاتے؛ اس مقصد کے لئے اس حدیث پاک میں نبیٔ کریم ﷺ نے ایک بڑا آسان نسخہ ہم کو بتلایا ہے کہ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں اور ہر وقت آپ سے نیکی اور بھلائی ہی سرزد ہو تو ایک چیز کا اہتمام کرلو، اور وہ یہ ہے کہ سچائی اختیار کرلو۔ آپ یہ طے کرلیجئے کہ میں ہمیشہ سچ بولنے کا اہتمام کروں گا، کبھی جھوٹ کے قریب نہیں جاؤں گا، اگر آپ صرف اس ایک نیکی کو اپنے اوپر لازم کرلیں گے تو نبیٔ کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کا خاصہ اور قدرتی نتیجہ یہ ہوگا کہ نیکی کے راستہ پر چلنے کی توفیق ہوگی، اور جب آپ اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کریں گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ جنت تک پہنچ جائیں گے۔ کتنا آسان نسخہ ہے۔!

صرف جھوٹ چھوڑا تو سب گناہ چھوٹ گئے

ایک مرتبہ ایک آدمی نبیٔ کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں بہت سارے گناہوں میں مبتلا ہوں، چوری بھی کرتا ہوں، مجھ سے زنا کا بھی ارتکاب ہوتا ہے، شراب بھی پیتا ہوں، جھوٹ بھی بولتا ہوں، اب یہ سارے

گناہ یکبارگی چھوڑنے کی مجھ میں طاقت نہیں، میں کوئی ایک ہی گناہ چھوڑ سکتا ہوں؛ اب اس سلسلہ میں آپ فرمائیں کہ کون سا گناہ پہلے چھوڑوں؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جھوٹ بولنا چھوڑ دو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو صرف اسی ایک چیز کی تاکید فرمائی۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے، میں وعدہ کرتا ہوں کہ جھوٹ نہیں بولوں گا۔ چناں چہ جب اس نے شراب پینے کا ارادہ کیا تو سوچا کہ میں تو یہ عہد کر کے آیا ہوں کہ جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اب اگر شراب پیتا ہوں اور بعد میں مجھ سے پوچھا جائے گا کہ تو نے شراب پی ہے؟ تو مجھے کہنا پڑے گا کہ ہاں! پی ہے؛ تو پھر شراب کی سزا مجھ پر جاری کی جائے گی، اس لیے میں شراب نہیں پیتا۔ پھر جب چوری کرنے کا ارادہ کیا تو پھر یہی خیال آیا کہ میں نے تو عہد کیا ہے کہ جھوٹ نہیں بولوں گا، اگر بعد میں مجھ سے پوچھا جائے گا کہ کیا تو نے چوری کی ہے؟ اب مجھے جھوٹ تو بولنا نہیں ہے، اس لیے کہنا پڑے گا کہ ہاں! میں نے چوری کی ہے، تو چوری کی سزا مجھ پر جاری ہوگی۔ یہی معاملہ زنا کا بھی ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے سارے ہی گناہ چھوٹ گئے۔ (التذكرة الحمدونية لأبي المعالي، ۴۹/۳)

اپنی اصلاح کا سرا ہمارے ہی ہاتھ میں ہے

دیکھو! اس حدیث میں یہ نہیں بتلایا کہ گناہ کیسے چھوٹتے ہیں، بس! حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو اجمالی طور پر یہ بتلا دیا کہ اگر آپ سچائی کو لازم پکڑ لو گے تو اس کی برکت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اطاعت وفرمانبرداری کی توفیق عطا فرمائیں گے۔ اب کیسے عطا فرمائیں گے؟ اس کی ایک مثال میں نے آپ کے سامنے پیش کی جو حدیث کی کتابوں میں موجود ہے کہ وہ آدمی دوسرے گناہوں سے کیسے بچ گیا۔ اسی طریقہ سے اللہ تعالیٰ اس سچ کی برکت سے دوسرے گناہوں سے بچنے کا راستہ سمجھائیں گے اور نیکیوں پر چلنا

آسان کردیں گے۔اس لیے اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری میں لگے رہیں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے اپنے آپ کو بچائیں تو اس کا آسان راستہ یہی ہے کہ جھوٹ کو چھوڑ کر سچ کو اختیار کرلیں۔

اور آدمی سچ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ آدمی اللہ کے یہاں صدیق لکھا جاتا ہے۔صالح اور نیک لوگوں کے اللہ تعالیٰ کے یہاں چار درجے ہیں۔ہم روزانہ ہر نماز کی ہر رکعت کے اندر دعا کرتے ہیں: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ اے اللہ! صراط مستقیم یعنی سیدھے راستہ کی ہمیں رہنمائی فرما اور اس پر چلا، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا۔وہ کون لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا؟ تو قرآن پاک ہی میں دوسری جگہ ان کی چار جماعتیں بتلائی گئی ہیں: ﴿فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ﴾ ایک تو نبیوں کی جماعت، دوسری صدیقوں کی جماعت، تیسری شہیدوں کی جماعت اور چوتھی صالحین اور عام نیک لوگ کی جماعت۔یہ چار جماعتیں ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا۔اب ان چار جماعتوں میں پہلی جماعت انبیاء علیہم السلام کی ہے، اور نبوت کسی کے اختیار اور قابو کی چیز نہیں ہے، کوئی آدمی یہ چاہے کہ میں نبوت کے درجے تک پہنچ جاؤں، تو چاہے وہ چوبیس گھنٹے عبادت کرتا رہے تب بھی اپنے ارادہ واختیار سے وہ نبی نہیں بن سکتا۔مطلب یہ ہے کہ نبوت کا درجہ اختیاری نہیں ہے، اللہ تعالیٰ جس کو چاہے نبی بنادیں، اور وہ دروازہ اب بند ہوگیا ہے، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، لیکن باقی تین جماعتیں جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا ہے ان تینوں کا دروازہ کھلا ہوا ہے، ان میں سب سے پہلا درجہ صدیق کا ہے، گویا

نبوت کے بعد کا سب سے اونچا درجہ صدیقین کا ہے۔ اور یہ درجہ سچ کے نتیجہ میں آدمی کو حاصل ہوتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ آدمی سچ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ صدیق لکھا جاتا ہے۔ اس لیے میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اپنی اصلاح اور نیکی کی راہ اختیار کرنے کے لئے ایک بہت بڑا اسرا ہمارے ہاتھ آ گیا۔ جب ہم اپنی اصلاح کے معاملہ میں سوچتے ہیں کہ ہم سے گناہ چھوٹنے کا نام نہیں لیتے اور برائیاں نہیں چھوٹتیں، ہم کیا تدبیر اختیار کریں، اور پھر ہم مختلف تدبیریں اختیار بھی کرتے ہیں؛ تو یہ بہت اچھی، مختصر اور آسان سی تدبیر ہے، اگر ہم اسی (سچائی) کو لازم پکڑ لیں تو نبیٔ کریم ﷺ وعدہ فرماتے ہیں کہ اس کے نتیجہ میں طاعت اور نیکی کی توفیق ہوگی۔

خالص منافق کی چار خصلتیں

۱۵۴۳:- وعن عبد الله بن عمرو بن العاص رضی الله عنهما: أن النَّبِيّ ﷺ قَالَ: ((أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ، كَانَ مُنَافِقاً خَالِصاً، وَمَنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ، كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنْ نِفَاقٍ حَتَّى يَدَعَهَا: إِذَا أُؤْتُمِنَ خَانَ، وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ)). (متفق عَلَيْهِ)

وَقَدْ سبق بيانه مَعَ حديث أَبي هريرة بنحوه في ((باب الوفاءِ بالعهدِ))

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: چار خصلتیں اور عادتیں جس آدمی کے اندر ہوں گی، وہ خالص منافق ہے اور جس میں ان میں سے ایک خصلت اور عادت ہوگی تو گویا نفاق کی ایک عادت اس میں موجود ہے یہاں تک کہ وہ اس کو چھوڑ دے۔ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے، اور جب بات کرے تو جھوٹ بولے، اور جب کسی سے عہد و پیمان کرے تو اس کے خلاف کرے، اور

جب کسی کے ساتھ جھگڑا کرے تو گالی گلوچ پر اتر آئے۔

افادات:۔ یہاں تو یہ روایت اسی لیے لائے ہیں کہ جھوٹ نفاق کی خصلت وعادت ہے۔جس کسی میں یہ خصلت ہے، اس سے جب تک توبہ نہیں کرتا گویا اس میں نفاق کی ایک خصلت موجود ہے۔ویسے اس کو منافق اور کافر نہیں کہیں گے، بلکہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ایک منافق کے اندر جتنی برائیاں ہو سکتی ہیں وہ ساری برائیاں کلمہ پڑھتے ہوئے اور ایمان کا دعویٰ کرتے ہوئے اس آدمی کے اندر موجود ہیں، لیکن چوں کہ کلمہ پڑھ رہا ہے اس لیے کفر کا فتویٰ نہیں لگایا جائے گا، ہاں! یہ ضرور کہیں گے کہ یہ آدمی حقیقی معنیٰ میں مؤمن نہیں ہے اور ایمان کی جو برکات اور ثمرات ہیں اس سے محروم ہے۔

یہ بہت ضروری ہے

بعض روایتوں میں یہاں تک ہے کہ ''وَإِنْ صَلَّى وَصَامَ وَزَعَمَ أَنَّهُ مُؤْمِنٌ'' چاہے ایسا آدمی روزہ رکھتا ہو، نماز پڑھتا ہو، اور یوں سمجھتا ہو کہ میں ایمان والا ہوں؛ تب بھی وہ مکمل ایمان والا نہیں ہے۔معلوم ہوا کہ ہم نے گویا اسلام اور ایمان کو روزہ نماز تک محدود کر رکھا ہے، ایک آدمی روزہ نماز کا اہتمام کرتا ہے، تو وہ یوں سمجھتا ہے کہ میں پورے دین پر عمل کر رہا ہوں، پھر چاہے وہ بازار کے اندر جا کر جھوٹ بولے، امانت میں خیانت کرے، رشوت لے، اور چاہے دوسری بہت ساری برائیوں میں مبتلا رہے، مثلاً: معاملات کی عدم صفائی، فریب ودھوکہ دہی، عہد شکنی اور گالی گلوچ سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت محسوس ہی نہیں کرتا، لیکن یہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ چاہے وہ روزہ رکھتا ہو، نماز پڑھتا ہو، اور یوں سمجھتا ہو کہ میں مؤمن ہوں؛ تب بھی وہ

منافق ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام صرف نماز روزہ کا نام نہیں ہے، بلکہ اسلام ان صفات کی بھی ہمیں دعوت دیتا ہے کہ ہمیں اپنے اندر یہ خوبیاں پیدا کرنی چاہئیں اور ان برائیوں سے اپنے آپ کو کلی طور پر بچانے کا اہتمام کرنا ہے؛ یہ بہت ضروری ہے۔

ہر مذہب میں جھوٹ کو برا سمجھا گیا

اور میں آپ کو بتاؤں کہ جھوٹ کی برائی صرف اسلام کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ یہ تو ایسا گناہ ہے جو ہر زمانہ اور ہر ملت و مذہب اور ہر قوم میں برا سمجھا گیا ہے، زمانۂ جاہلیت میں بھی جب کہ لوگ ہر قسم کی برائیوں میں مبتلا تھے، کوئی گناہ ایسا نہیں ہوگا جس کا وہ لوگ ارتکاب نہ کرتے ہوں، لیکن وہ لوگ بھی جھوٹ کو اپنے لیے بہت بڑا عیب سمجھتے تھے۔ چناں چہ روایتوں میں آتا ہے کہ جس وقت نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیصرِ روم کے نام دعوتِ اسلام کی غرض سے خط بھیجا، تو جب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نامۂ مبارک اس کے پاس پہنچا اس وقت وہ ملکِ شام کے سفر پر بیت المقدس کی زیارت کے لئے آیا ہوا تھا، وہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نامۂ مبارک اس کے پاس پہنچایا گیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس مبارک خط کو پڑھنے سے پہلے اس نے ضروری سمجھا کہ جن شخصیت کی طرف سے یہ خط بھیجا گیا ہے ان کے متعلق کچھ معلومات حاصل کروں کہ وہ کون ہیں؟ تاکہ اس خط کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکے۔ چناں چہ خط کھلوا کر پڑھنے سے پہلے اس نے اپنے درباریوں سے کہا: جن کی طرف سے یہ خط بھیجا گیا ہے اُن سے واقفیت رکھنے والے کچھ لوگ اگر ہماری مملکت میں ہوں تو ان کو میرے پاس لایا جائے، میں ان سے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ جس زمانہ میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ خطوط روانہ کیے تھے وہ صلحِ حدیبیہ کے بعد کا زمانہ تھا، مشرکینِ مکہ کے ساتھ صلح چل رہی تھی، اور یہ خط

قیصر روم کے پاس اسی زمانہ میں پہنچا تھا۔ اتفاق کی بات کہ ابوسفیان جو مکہ والوں کے سردار اور آپ ﷺ کے پکے مدِ مقابل تھے، وہی ایک تجارتی قافلہ لے کر وہاں پہنچے ہوئے تھے، قیصر کے لوگوں نے اُنہیں کو لاکر دربار میں پیش کر دیا کہ یہ لوگ اسی علاقہ کے رہنے والے ہیں۔ چناں چہ قیصر نے با قاعدہ دربار قائم کیا اور ان لوگوں کو بلا کر اپنے سامنے بٹھایا اور پہلے تو یہ پوچھا کہ یہ خط جن کی طرف سے میرے پاس پہنچایا گیا ہے، ان سے خاندانی اور نسبی رشتہ داری کے اعتبار سے سب سے زیادہ قریب کون ہے؟ اتفاق کی بات کہ ابوسفیان ہی سب سے زیادہ قریب تھے۔ اس لیے کہ حضور ﷺ کے اجداد میں عبد مناف پر جا کر ان کا اور نبیٔ کریم ﷺ کا نسب مل جاتا ہے، تو ابوسفیان نے کہا: میں نسب کے اعتبار سے ان کا سب سے زیادہ قریبی رشتہ دار ہوں۔ لہٰذا قیصر نے ان کو آگے بٹھایا اور دوسروں کو پیچھے بٹھایا، پھر اس نے اپنے ترجمان کے ذریعہ پورے قافلہ والوں سے ایک بات کہی کہ: دیکھو! میں اُن کے متعلق اِن سے جو کچھ سوالات کروں گا، اگر یہ غلط جواب دیں تو مجھے بتا دینا، پھر اس نے بہت سارے سولات کیے ،جس کا لمبا چوڑا قصہ ہے۔

مَیں اپنی طرف جھوٹ کی نسبت پسند نہیں کرتا

خیر! اصل بات جو میں بتلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ بعد میں ابوسفیان کہتے تھے کہ قیصر نے جب میرے قافلہ والوں سے یہ کہا کہ اگر یہ کوئی غلط جواب دیں تو مجھے بتلا دیجیو، تو میں یہ بات جانتا تھا کہ اگر حضور ﷺ کے متعلق کوئی غلط جواب دوں گا تو (اگر چہ قیصر نے کہا ہے کہ بتلا دیجیو، لیکن) اس مجلس میں میرے قافلہ والوں میں سے کوئی بھی میری تردید نہیں کرے گا، کیوں کہ وہ ان کے سردار تھے اس لیے وہ میرے

متعلق قیصر کو کبھی نہ بتاتے کہ یہ غلط بول رہے ہیں، لیکن یہ بات ضرور ہے کہ وہاں سے واپسی کے بعد جب مکہ پہنچیں گے تو وہاں چرچا ہوگا کہ انہوں نے قیصر کے سامنے یہ جواب غلط دیا تھا، اور میری طرف جھوٹ کی نسبت ہوگی، اور میں اپنی طرف جھوٹ کی نسبت پسند نہیں کرتا ہوں۔

تو دیکھو! ایک شخص شرک اور بہت ساری برائیوں کے اندر مبتلا ہونے کے باوجود جھوٹ کی نسبت کو اپنے لیے گوارا نہیں کرتا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹ کو وہ بھی برا سمجھتے تھے۔ اور حقیقت میں جھوٹ بڑی خطرناک چیز ہے۔

بچوں کی تربیت میں بھی سچ کا اہتمام کیجیے

یہاں تک کہ بچوں کے ساتھ بھی جھوٹ کا ارتکاب کرنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی، ابوداؤد شریف میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک عورت اپنے بچے کو بلا رہی تھی کہ ادھر آ! میں کچھ دوں گی۔ نبی کریم ﷺ نے اس عورت سے پوچھا: جس وقت تو اپنے اس بچے کو یوں کہہ رہی تھی کہ آ! میں کچھ دیتی ہوں؛ اس وقت تیرے دل میں یہ نیت تھی کہ میں کچھ دوں گی؟ اس نے کہا: ہاں! میرے پاس کھجوریں تھی اور میری نیت تھی کہ میں اس کو ایک کھجور دوں گی۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر ایسا نہ ہوتا تو تمہارے نامۂ اعمال میں ایک جھوٹ لکھا جاتا۔

دیکھو! ہم تو اپنے بچوں کے ساتھ جب معاملہ کرتے ہیں تو بہت سی مرتبہ ایسی باتیں بول دیتے ہیں کہ: سوجا! ورنہ کتا آیا۔ حالاں کہ کتا نہیں آیا پھر بھی کہتے ہیں کہ کتا آیا، تو یہ جھوٹ ہوگیا، بچے کو سلانے کے لئے ہم اپنے نامۂ اعمال کے اندر جھوٹ شامل کر رہے ہیں۔ ایسی بہت ساری چیزیں ہوتی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ بچہ جب اپنے ماں

باپ کو دیکھے گا کہ وہ بات بات میں جھوٹ بولتے ہیں، یا جو کہتے ہیں وہ بات سچی نہیں ہوتی، تو اس کی طبیعت پر کیا اثر پڑے گا؟ وہ کیا سیکھے گا؟ یہی سیکھے گا نا کہ جھوٹ گناہ کا کام نہیں ہے، پھر وہ بھی جھوٹ کا عادی بن جائے گا۔ تو اگر ہم بچوں کی صحیح تربیت کرنا چاہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ان کے مزاج میں جھوٹ کی برائی، شناعت اور قباحت بیٹھ جائے تو اس صورت میں ضروری ہے کہ ہم بھی اس کے سامنے جھوٹ بولنے سے بچیں، اور بار بار ان کے سامنے جھوٹ کی برائی بیان کریں۔

بچوں کو جھوٹ سے بچانے کا ایک نسخہ

حضرت قاری امیر حسن صاحبؒ جو حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کے خلفاء میں سے تھے، وہ فرماتے تھے کہ: چوں کہ حدیث پاک میں آتا ہے کہ آدمی جب جھوٹ بولتا ہے تو اس کے منھ سے ایسی بدبو نکلتی ہے کہ فرشتہ اس سے میلوں دور چلا جاتا ہے۔ تو جھوٹ بولنے کے نتیجہ میں منھ سے بدبو آنا یہ تو حقیقت ہے، اب اس بدبو کا احساس اگر چہ ہم لوگوں کو نہ ہو، لیکن اہل اللہ کو اس کا احساس ہو جاتا ہے۔ تو حضرت قاری صاحبؒ فرماتے تھے کہ: ہمارے بچپن میں ہمارے گھر کے بڑوں کو دیکھا کہ جب کوئی بچہ کوئی ایسی بات بول دیتا تھا جو جھوٹ کے قبیل کی ہوتی تو بچوں کو سکھانے کے لئے کہتے کہ: منھ سے بدبو آرہی ہے؛ تو ہم اپنا منھ دوسرے بچوں کو سنگھواتے تھے کہ دیکھو! کیا میرے منھ سے بدبو آرہی ہے؟

اور واقعۃً جب حضور ﷺ فرما رہے ہیں کہ منھ سے بدبو آتی ہے، تو اب اگر ہم بچوں کو جھوٹ سے روکنے کے لئے کہہ دیں کہ تمہارے منھ سے بدبو آرہی ہے؛ تو اس میں کوئی غلط بات نہیں ہے، اگر چہ ہمیں اس کا احساس نہ ہو۔ بچوں کو جھوٹ سے بچانے

کے لئے اور ان کی تربیت کے لئے کتنا اچھا انداز ہے۔ تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ بچوں کے ساتھ جو معاملہ ہو رہا ہے ان کو بہلانے پھسلانے کے لئے بھی ہماری زبان سے جھوٹ کا ارتکاب نہ ہو۔

مذاق میں بھی جھوٹ بولنے کی اجازت نہیں

یہاں تک کہ مذاق میں بھی جھوٹ بولنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ حدیث پاک میں آتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ایک آدمی لوگوں کو ہنسانے کے لئے جھوٹ بولتا ہے اس کے لئے ہلاکت ہے، یعنی جھوٹ کی وجہ سے جہنم میں جائے گا۔ بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ لوگوں کے سامنے جھوٹی باتیں اس لیے بولتے ہیں تاکہ لوگ اس سے ہنسیں، تو لوگوں کو ہنسانے کی خاطر جھوٹ بولنے کی وجہ سے لوگ تو ہنس رہے ہیں اور یہ جہنم میں جائے گا۔ یہاں تک کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مذاق میں بھی جھوٹ کی اجازت نہیں دی۔

بوڑھیاں جنت میں نہیں جائیں گی

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مزاح بھی فرمایا ہے لیکن اس میں بھی سچ کا اہتمام فرمایا کرتے تھے، ایک مرتبہ ایک بوڑھی عورت آئی (یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا تھیں) اور کہنے لگیں: دعا کر دیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں بھیج دیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بوڑھیاں جنت میں نہیں جائیں گی۔ وہ روتے ہوئے واپس جانے لگیں تو آپ نے فرمایا: ان کو بتا دو کہ کوئی بھی بڑھیا بوڑھی ہونے کی حالت میں جنت میں نہیں جائے گی، بلکہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو بھی جنت میں بھیجیں گے تو تینتیس (۳۳) سال کی عمر کی

جوان بنا کر بھیجیں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ تو مزاح بھی فرماتے ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مزاح تو کرتا ہوں لیکن سچ کے علاوہ اپنی زبان سے نہیں نکالتا۔

سواری کے لیے اونٹ کا بچہ

ایک مرتبہ ایک دیہاتی نے آکر آپ سے سواری مانگی: اے اللہ کے رسول! مجھے سواری کے لئے اونٹ دیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہم تو آپ کو اونٹ کا بچہ دیں گے۔ وہ کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! میں اونٹ کا بچہ لے کر کیا کروں گا؟ مجھے تو سواری کے لئے جانور چاہیے۔ آپ نے فرمایا: ہر اونٹ اونٹنی کا بچہ ہی ہوتا ہے نا!؟ جیسے ہم میں سے ہر آدمی اپنی ماں سے ہی پیدا ہوتا ہے، تو ہر آدمی اپنی ماں کا بچہ ہی ہوا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سامنے والا جو بات کہہ رہا ہے اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کسی کی بات کی فوراً تردید نہ کی جائے۔

جھوٹی گواہی شرک کے برابر ہے

اور پھر جھوٹی گواہی کو تو شرک کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ: بڑے گناہوں میں سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: شرک اور بت پرستی۔ پھر پوچھا گیا کہ اس کے بعد کون سا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ماں باپ کی نافرمانی کرنا۔ پھر پوچھا گیا: اس کے بعد کون سا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے پھر سیدھے بیٹھ گئے اور آپ نے فرمایا: ''أَلَا! وَقَوْلَ الزُّوْرِ، أَلَا! وَقَوْلَ الزُّوْرِ'' سنو! اس کے بعد جھوٹی گواہی سب سے بڑا گناہ ہے، سنو! اس کے بعد

جھوٹی گواہی سب سے بڑا گناہ ہے۔ گویا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جھوٹی گواہی کی اہمیت کو بتانے کے لیے ایک تو اس کو شرک اور ماں باپ کی نافرمانی کے ساتھ جوڑا، اور پھر اس کی اور زیادہ اہمیت بتلانے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنا ٹیک چھوڑ کر سیدھے بیٹھ گئے اور تین تین مرتبہ اس بات کو دہرایا۔

قرآنِ کریم میں بھی ہے: ﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ﴾ بتوں کی پرستش سے بچو اور جھوٹی بات سے بھی بچو۔ گویا قرآنِ کریم میں بھی بت پرستی اور جھوٹ کو ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جھوٹ کتنا خطرناک گناہ ہے!

جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ

ہمارے معاشرہ میں جھوٹ کی بعض شکلیں پھیلی ہوئی ہیں جن سے احتیاط نہیں کی جاتی، اسی میں ایک میڈیکل سرٹیفکیٹ بھی ہے۔ عام طور پر لوگ معمولی معمولی باتوں پر جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ بناتے ہیں۔ ہاں! اگر کہیں کسی کی جان کا خطرہ ہے، یا کسی ظالم کی طرف سے ناقابلِ برداشت ظلم میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو؛ تب تو بات دوسری ہے، لیکن ایسا نہیں ہوتا ہے پھر بھی بناتے ہیں۔ مثلاً: ایک آدمی کسی فرم، یا کمپنی یا کسی فیکٹری میں نوکری کرتا ہے، وہاں سے چھٹی لینے کے لئے جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ پیش کر دیا جاتا ہے تا کہ چھٹی مل جائے، اس لیے کہ اتفاقی رخصت (Casual) تو وہ جناب وصول کر چکے ہیں، اب بیماری والی چھٹیاں رہ گئیں ہیں اور بیماری والی چھٹیاں بغیر بیماری کے نہیں مل سکتیں، چوں کہ سرکاری دفاتر میں (Sick Note) رکھنے کے لئے سرٹیفکیٹ کی ضرورت ہے، تو اس کے لئے وہاں پر جھوٹا سرٹیفکیٹ پیش کیا جاتا

ہے؛تو یہ صریح جھوٹ ہے۔جو بھی ڈاکٹر ایسا سرٹیفکیٹ لکھ دیتا ہے وہ تو جھوٹی گواہی میں آجائے گا، یہ تو اور زیادہ خطرناک گناہ ہوجائے گا۔اس لیے کہ اس کا گناہ تو جھوٹ سے بھی بڑھ کر ہے اس لیے کہ جھوٹا سرٹیفکیٹ دینے والا ڈاکٹر اس کی جھوٹی تصدیق کر کے خود تو ایک گناہ میں مبتلا ہو ہی رہا ہے ساتھ ہی دوسرے آدمی کو بھی نقصان پہنچا رہا ہے۔لہٰذا چھٹیاں لینے کے لئے، یا اسی طرح کے دیگر معاملات کے لئے میڈیکل سرٹیفکیٹ کی ضرورت ہوتی ہے، جیسے:بعض مرتبہ کسی کمپنی کی طرف سے بیماری کے علاج معالجہ کے لئے کچھ پیسے دیئے جاتے ہیں،اس کے لیے میڈیکل سرٹیفکیٹ پیش کر دیا جاتا ہے۔یہ سب اس کی طرف سے تو جھوٹ میں شامل ہے،اور جو ڈاکٹر صاحب ایسا میڈیکل سرٹیفکیٹ دے رہے وہ جھوٹی گواہی کی وعید میں شامل ہو رہے ہیں۔

ایک قصہ

حضرت مولا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ ایک صاحب مجھ سے ملے جو باہر کسی ملک میں ملازمت کرتے تھے،میں نے پوچھا:کب جا رہے ہو؟تو وہ کہنے لگے:ویسے تو میری چھٹی کل پوری ہو رہی ہے لیکن مزید آٹھ دن اور بڑھ گئے۔میں نے پوچھا:کیسے؟کیا ہوا؟تو کہنے لگے:میں نے وہاں اپنا میڈیکل سرٹیفکیٹ بھیج دیا ہے اس کی وجہ سے آٹھ دن مل جائیں گے۔میں نے کہا:اس میں کیا لکھا؟کہنے لگے:اس میں لکھوایا کہ میں سفر کے قابل نہیں ہوں۔میں نے کہا:؟اللہ کے بندے!آپ تو صوم وصلوۃ کے پابند ہو،بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے والے،تلاوت اور تسبیحات کا اہتمام کرنے والے ہو،کیا آپ واقعتاً سفر کے قابل نہیں ہیں؟ایسا

میڈیکل سرٹیفکیٹ جو بھیجا، تو آپ کو معلوم ہے کہ اس کا کیا مطلب ہوا؟ یہ تو صریح جھوٹ ہو گیا۔ تو بہت سی مرتبہ آدمی ایسی باتوں کا ارتکاب کر لیتا ہے اور اس کی وجہ سے گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے لیکن اس کا احساس بھی نہیں ہوتا ہے۔

کیرکٹر سرٹیفکیٹ (تصدیق نامہ)

ایسے ہی کسی کو کیرکٹر سرٹیفکیٹ یا مدرسوں کے لیے تصدیق نامہ دیا جاتا ہے، میں اس کو بہت بھگتتا ہوں، مدرسہ والے ہمارے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ تصدیق نامہ لکھ دیجئے۔ ہمارے حضرت مفتی محمود حسن صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا معمول یہ تھا کہ کوئی اس طرح کی بات لے کر آتا تو حضرت فرماتے کہ: بھائی دیکھو! میں جس مدرسہ میں گیا ہوں یا جس مدرسہ کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اس کے متعلق تو میں تصدیق لکھ دوں گا کہ یہ مدرسہ میرا دیکھا ہوا ہے۔ اس لیے کہ تصدیق کا مطلب ہی ایک گواہی ہے، اور گواہی تو اسی کی ہوتی ہے جو آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ اور اگر دیکھا ہی نہیں ہے تو پھر کیسے لکھ دوں؟ اس جواب پر مدرسے والے ناراض ہوتے ہیں۔ آج کل بہت سے لوگ نہیں دیکھا ہوتا پھر بھی اس لیے لکھ دیتے ہیں کہ نیکی کا کام ہے اور کسی کا کام بن جائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ کسی کا کام ہو جائے گا یا کسی کی دھوکہ دہی میں مبتلا ہو جائے گا؟ اگر آپ نے نہیں دیکھا ہو تو اس طرح کی تصدیق نہیں لکھی جا سکتی، ہاں! نہ دیکھنے کی صورت میں ویسے ہی امداد کی درخواست کی جا سکتی ہے، لیکن دیکھنے کی صورت میں جس انداز سے تصدیق نامہ لکھا جاتا ہے اور سرٹیفکیٹ دیا جاتا ہے؛ وہ نہیں ہونا چاہیے۔ مثلاً: کوئی آدمی کسی کو لے کر آیا کہ مفتی صاحب! اس کو ذرا کیریکٹر سرٹیفکیٹ لکھ دیجئے نا۔ تو اگر آپ واقف نہیں ہیں تو کیسے لکھ کر دے سکتے ہیں؟

کیریکٹر سرٹیفکیٹ کب دیں؟

حضرت عمرؓ ایک آدمی کو کسی جگہ کا گورنر بنانا چاہتے تھے، تو آپ نے اس کے متعلق دوسرے سے پوچھا: اس کا کیا حال ہے؟ جواب دیا: اچھا آدمی ہے۔ پوچھا: تم نے کیسے کہا کہ اچھا آدمی ہے؟ کیا کبھی تمہارا اس کے ساتھ لین دین کا معاملہ ہوا ہے؟ کہا: نہیں۔ پوچھا: کبھی تم نے اس کے ساتھ کوئی سفر کیا ہے؟ کہا: نہیں۔ تو اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا: شاید تم نے اس کو رکوع سجدہ کرتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا۔ دیکھو! میں حضرت عمرؓ کے الفاظ نقل کر رہا ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس کے ساتھ لین دین کا معاملہ کیا جائے اور وہ اس میں کھرا اترے، اور اس کے ساتھ سفر کریں اور وہ دورانِ سفر اپنے اخلاق و اعمال کے اعتبار سے کھرا اترے؛ تب ہی آپ اس کے متعلق فیصلہ کر سکتے ہیں۔ ورنہ اس کے بغیر کسی کے متعلق کیرکٹر سرٹیفکیٹ نہیں دیا جا سکتا۔ ہاں یوں کہا جا سکتا ہے کہ میں اس کو دیکھتا ہوں کہ برابر مسجد میں آتا ہے اور نماز پڑھتا ہے، باقی اس کے دوسرے حالات سے میں واقف نہیں ہوں۔ اس لیے اگر ہم نے کسی کے متعلق لاعلمی میں کیریکٹر سرٹیفکیٹ دے دیا تو ایک تو جھوٹ کا گناہ ہوا، لیکن ساتھ ہی دوسرے کو بھی دھوکہ میں ڈالا۔ اس لیے کہ وہ ہمارے سرٹیفکیٹ ہی کی بنیاد پر اس پر بھروسہ اور اعتماد کرے گا اور ہو سکتا ہے کہ وہ نقصان اٹھائے۔ تو دوسرے کو جو نقصان ہوا اس کا ذریعہ آپ بنیں گے، اس لئے اس میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

جھوٹا خواب بیان کرنے کی وعید

۱۵۴۴:- وعن ابن عباس رضی اللہ عنهما، عن النبی ﷺ قَالَ : ((

مَنْ تَحَلَّمَ بِحُلُمٍ لَمْ يَرَهُ، كُلِّفَ أَنْ يَعْقِدَ بَيْنَ شَعِيرَتَيْنِ وَلَنْ يَفْعَلَ، وَمَنِ اسْتَمَعَ إِلَى حَدِيثِ قَوْمٍ وَهُمْ لَهُ كَارِهُونَ، صُبَّ فِي أُذُنَيْهِ الآنُكُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ صَوَّرَ صُورَةً عُذِّبَ وَكُلِّفَ أَنْ يَنْفُخَ فِيهَا الرُّوحَ وَلَيْسَ بِنَافِخٍ)). (رواه البخاری)

((تحلم)): أيْ قَالَ إنَّه حلم في نومه ورأى كذا و كذا، وَهُوَ كاذب.

و((الآنك)) بالمدّ وضم النون و تخفيف الكاف: وَهُوَ الرَّصَاصُ المذاب.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے ایسا خواب بیان کیا جو دیکھا نہیں، تو قیامت کے روز اس کو پابند کیا جائے گا کہ دو جَوْ کے دانوں کے درمیان گرہ لگائے (اور جب تک گرہ نہیں لگائے گا وہاں تک وہ عذاب میں مبتلا رہے گا) اور وہ گرہ نہیں لگا سکے گا۔ اور جو آدمی کچھ لوگوں کی باتوں کی طرف کان لگائے اور سننے کی کوشش کرے حالاں کہ وہ اس کو ناپسند کرتے ہوں؛ تو قیامت کے دن اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جائے گا۔ اور جو آدمی کوئی تصویر بنائے گا تو قیامت کے روز اس کو پابند کیا جائے گا کہ جو تصویر تو نے بنائی ہے اس میں جان ڈال، اور وہ اس میں جان نہیں ڈال سکے گا (جب تک وہ ایسا نہیں کرے گا وہاں تک عذاب میں مبتلا رہے گا۔)

افادات:- اس روایت میں جھوٹ کی ایک اور شکل بتلائی ہے۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ دوسروں کو اپنا معتقد بنانے کے لئے، یا دوسروں سے مالی فائدہ حاصل کرنے کے لئے کہتے ہیں کہ حضرت! میں نے تو آپ کو خواب میں دیکھا کہ آپ جنت میں ہیں۔ یہ سن کر سامنے والا خوش ہوجاتا ہے، اس کے بعد اپنی ضرورتیں اس کے سامنے رکھتے ہیں اور وہ خوش ہوکر پوری کردیتا ہے۔ اگر ویسے ہی جاکر اس سے کہتے کہ مجھے آپ سے یہ کام ہے، اور مجھے سو روپئے قرض دو، تو وہ نہیں دیتا۔ لیکن اس کے لیے پہلے پلیٹ فارم تیار کرلیا تو کام بن گیا۔ اب ایسا کہنے والا سمجھتا ہے کہ اس

میں کوئی بات نہیں ہوئی، حالاں کہ یہ بہت خطرناک گناہ ہوا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ خواب دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے دکھایا جاتا ہے، لہٰذا بیداری کے اندر جو جھوٹ بولا جاتا ہے اس کے مقابلہ میں خواب کے متعلق جھوٹ بولنے کی شناعت اور برائی بہت زیادہ ہے، کیوں کہ خواب کے متعلق یہ بھی آیا ہے کہ وہ نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔ بعض لوگ اپنے خوابوں کے ذریعہ مختلف دنیوی اور دینی فوائد حاصل کرنے کے لئے، یا دوسروں کو اپنا معتقد بنانے کے لئے، یا دوسروں سے اپنا کام نکلوانے کے لئے نعوذ باللہ ویسے ہی کہہ دیتے ہیں کہ میں نے خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا اور آپ نے یوں فرمایا۔ یہ بہت خطرناک گناہ ہے۔

گناہ بے لذت

اور جو آدمی کچھ لوگوں کی باتوں کی طرف کان لگا کر سننے کی کوشش کرے اور وہ اس کو ناپسند کرتے ہوں، مثلاً: چند آدمی تنہائی میں بیٹھ کر باتیں کررہے ہیں، اور وہ اس بات کی کوشش کررہے ہیں کہ ہماری بات کوئی دوسرا نہ سنے، لیکن کوئی آدمی چپکے سے ان کی طرف کان لگائے۔ یا بعضوں کو دوسروں کے فون سننے کی عادت ہوتی ہے، وہ بھی اس میں داخل ہیں۔ قیامت کے دن ایسے لوگوں کے کانوں میں پگھلایا ہوا سیسہ ڈالا جائے گا۔ دیکھو! کتنا سخت عذاب ہے۔

ذرا غور کرو کہ دوسروں کی باتیں سن کر کیا فائدہ ہوا؟ کیا کچھ پیسے مل گئے؟ یا مکان ٹھیک ہوگیا؟ کوئی نوکری مل گئی؟ کوئی اور ترقی حاصل ہوگئی؟ کچھ بھی نہیں ملا، صرف گناہ بے لذت ہے، اور اس پر کتنا خطرناک عذاب ہے!۔

سب سے بڑا جھوٹ

۱۵۴۵:-وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: ((أَفْرَى الفِرَى أَنْ يُرِيَ الرَّجُلُ عَيْنَيْهِ مَا لَمْ تَرَيَا)). (رواہ البخاری)

ومعناه: يقول: رأيتُ، فيما لَمْ يَرَهُ.

ترجمہ:-حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمام بہتانوں میں سب سے بڑا بہتان اور سب سے بڑا جھوٹ یہ ہے کہ آدمی اپنی آنکھوں کو وہ چیز دکھلائے جو اس نے نہیں دیکھی ہے۔

افادات:-یعنی خواب میں جو چیز نہیں دیکھی ہے، لیکن لوگوں کے سامنے یوں بیان کرتا اور ظاہر کرتا ہے کہ میں نے یہ خواب دیکھا ہے۔اس میں بھی لوگوں کے سامنے جھوٹ موٹ خواب بیان کرنے کی شناعت بیان فرمائی ہے۔اور یہ بہت بڑا گناہ ہے، کوئی آدمی اس کو معمولی بات نہ سمجھے۔

حضور اکرم ﷺ کا ایک لمبا خواب

۱۵۴۶:-وعن سَمُرَةَ بنِ جُنْدُبٍ-رضی اللہ عنہ- قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ مِمَّا يُكْثِرُ أَنْ يَقُولَ لأَصْحَابِهِ: ((هَلْ رَأَى أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنْ رُؤْيَا؟)) فَيَقُصُّ عَلَيْهِ مَنْ شَاءَ اللهُ أَنْ يَقُصَّ، وإنَّهُ قَالَ لنا ذَاتَ غَدَاةٍ: ((إنَّهُ أَتَانِي اللَّيْلَةَ آتِيَانِ، وإنَّهُمَا قَالا لِي: انْطَلِقْ، وإنِّي انْطَلَقْتُ مَعَهُمَا، وإنَّا أَتَيْنَا عَلَى رَجُلٍ مُضْطَجِعٍ، وَإِذَا آخَرُ قَائِمٌ عَلَيْهِ بِصَخْرَةٍ، وَإِذَا هُوَ يَهْوِي بِالصَّخْرَةِ لِرَأْسِهِ، فَيَثْلَغُ رَأسَهُ، فَيَتَدَهْدَهُ الحَجَرُ هَا هُنَا، فَيَتْبَعُ الحَجَرَ فَيَأْخُذُهُ فَلاَ يَرْجِعُ إِلَيْهِ حَتَّى يَصِحَّ رَأْسُهُ كَمَا كَانَ،

ثُمَّ يَعُودُ عَلَيْهِ، فَيَفْعَلُ بِهِ مِثْلَ مَا فَعَلَ الْمَرَّةَ الأُوْلَى!)) قَالَ: ((قُلْتُ لهما : سُبْحَانَ اللهِ! مَا هَذَانِ؟ قَالا لى: انْطَلِقِ انْطَلِقْ، فَانْطَلَقْنَا، فَأَتَيْنَا عَلَى رَجُلٍ مُسْتَلْقٍ لِقَفَاهُ، وَإِذَا آخَرُ قَائِمٌ عَلَيْهِ بِكَلُّوبٍ مِنْ حَدِيدٍ، وَإِذَا هُوَ يَأْتِي أَحَدَ شِقَّيْ وَجْهِهِ فَيُشَرْشِرُ شِدْقَهُ إِلَى قَفَاهُ، ومِنْخَرَهُ إِلَى قَفَاهُ، وعَيْنَهُ إِلَى قَفَاهُ، ثُمَّ يَتَحَوَّلُ إِلَى الجَانِبِ الآخَرِ، فَيَفْعَلُ بِهِ مِثْلَ مَا فَعَلَ بِالجَانِبِ الأَوَّلِ، فَمَا يَفْرَغُ مِنْ ذَلِكَ الجَانِبِ حَتَّى يَصِحَّ ذَلِكَ الجَانِبُ كما كَانَ، ثُمَّ يَعُودُ عَلَيْهِ فَيَفْعَلُ مِثْلَ مَا فَعَلَ فِي المَرَّةِ الأُولَى)) قَالَ: ((قُلْتُ: سُبْحَانَ اللهِ! مَا هذانِ؟ قالا لى: انْطَلِقِ انْطَلِقْ، فَانْطَلَقْنَا، فَأَتَيْنَا عَلَى مِثْلِ التَّنُّورِ)) فَأَحْسِبُ أَنَّهُ قَالَ: ((فإذا فِيهِ لَغَطٌ، وأصواتٌ، فَاطَّلَعْنَا فِيهِ فإذا فِيهِ رِجَالٌ وَنِساءٌ عُرَاةٌ، وَإِذَا هُمْ يَأْتِيهِمْ لَهَبٌ مِنْ أَسْفَلَ مِنْهُمْ، فإذا أتاهُمْ ذَلِكَ اللَّهَبُ ضَوْضَوْا. قُلْتُ: مَا هَؤُلاءِ؟ قَالا لِي: انْطَلِقِ انْطَلِقْ، فَانْطَلَقْنَا، فَأَتَيْنَا عَلَى نَهْرٍ)) حَسِبْتُ أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ: ((أَحْمَرُ مِثْلُ الدَّمِ، وَإِذَا فى النَّهْرِ رَجُلٌ سابحٌ يَسْبَحُ، وَإِذَا عَلَى شَطِّ النَّهْرِ رَجُلٌ قَدْ جَمَعَ عِنْدَهُ حِجَارَةً كثيرةً، وَإِذَا ذَلِكَ السَّابِحُ يَسْبَحُ، مَا يَسْبَحُ، ثُمَّ يَأْتِي ذَلِكَ الَّذِى قَدْ جَمَعَ عِنْدَهُ الحِجَارَةَ، فَيَفْغَرُ لَهُ فاهُ فَيُلْقِمُهُ حَجَراً، فَيَنْطَلِقُ فَيَسْبَحُ، ثُمَّ يَرْجِعُ إِلَيْهِ، كُلَّمَا رَجَعَ إِلَيْهِ، فَغَرَ لَهُ فَاهُ، فَأَلْقَمَهُ حَجَراً، قُلْتُ لهُمَا: مَا هذانِ؟ قالاَ لِي: انْطَلِقِ انْطَلِقْ، فَانْطَلَقْنَا، فَأَتَيْنَا عَلَى رَجُلٍ كَرِيهِ المرْآةِ، أَوْ كَأَكْرَهِ مَا أنتَ رَاءٍ رجُلاً مَرْأىً، فإذا هُوَ عِنْدَهُ نَارٌ يَحُشُّهَا وَيَسْعَى حَوْلَهَا. قُلْتُ لَهُمَا: مَا هَذَا؟ قالاَ لى: انْطَلِقِ انْطَلِقْ، فَانْطَلَقْنَا، فَأَتَيْنَا عَلَى رَوْضَةٍ مُعْتَمَّةٍ فِيهَا مِنْ كُلِّ نَوْرِ الرَّبِيعِ،

وَإِذَا بَيْنَ ظَهْرَي الرَّوْضَةِ رَجُلٌ طَوِيلٌ لا أَكَادُ أَرَى رَأْسَهُ طُولاً فِي السَّمَاءِ، وَإِذَا حَوْلَ الرَّجُلِ مِنْ أَكْثَرِ وِلْدَانٍ رَأَيْتُهُمْ قَطُّ، قُلْتُ: مَا هَذَا؟ وَمَا هؤُلاءِ؟ قالا لي: انْطَلِقِ انْطَلِقْ، فَانْطَلَقْنَا، فَأَتَيْنَا إِلَى دَوْحَةٍ عَظِيمَةٍ لَمْ أَرَ دَوْحَةً قَطُّ أَعْظَمَ مِنْهَا، وَلاَ أَحْسَنَ! قالا لي: ارْقَ فِيهَا، فَارْتَقَيْنَا فِيهَا إِلَى مَدِينَةٍ مَبْنِيَّةٍ بِلَبِنِ ذَهَبٍ وَلَبِنِ فِضَّةٍ، فَأَتَيْنَا بَابَ الْمَدِينَةِ فَاسْتَفْتَحْنَا، فَفُتِحَ لَنَا فَدَخَلْنَاهَا، فَتَلَقَّانَا رِجَالٌ شَطْرٌ مِنْ خَلْقِهِمْ كَأَحْسَنِ مَا أنت راءٍ! وَشَطْرٌ مِنْهُمْ كَأَقْبَحِ مَا أنت راءٍ! قالا لَهُمْ: اذْهَبُوا فَقَعُوا فِي ذَلِكَ النَّهْرِ، وَإِذَا هُوَ نَهْرٌ مُعْتَرِضٌ يَجْرِي كَأَنَّ ماءَهُ الْمَحْضُ فِي الْبَيَاضِ، فَذَهَبُوا فَوَقَعُوا فِيهِ. ثُمَّ رَجَعُوا إِلَيْنَا قَدْ ذَهَبَ ذَلِكَ السُّوءُ عَنْهُمْ، فَصَارُوا فِي أَحْسَنِ صُورَةٍ)) قَالَ: ((قالا لِي: هذِهِ جَنَّةُ عَدْنٍ، وهذاك مَنْزِلُكَ، فسَمَا بَصَرِي صُعُداً، فإذا قَصْرٌ مِثْلُ الرَّبَابَةِ البَيضاءِ، قالا لي: هذاكَ مَنْزِلُكَ؟ قلتُ لهما: بارَكَ اللهُ فيكُما، فذَرانِي فأدخُلَه. قالا لي: أَمَّا الآنَ فَلاَ، وأنتَ دَاخِلُهُ، قُلْتُ لَهُمَا: فَإِنِّي رَأيتُ مُنْذُ اللَّيْلَةِ عَجَباً؟ فما هَذَا الَّذِي رأيتُ؟ قالا لي: أَمَا إِنَّا سَنُخْبِرُكَ: أَمَّا الرَّجُلُ الأَوَّلُ الَّذِي أَتَيْتَ عَلَيْهِ يُثْلَغُ رَأْسُهُ بالحَجَرِ، فإنَّهُ الرَّجُلُ يَأْخُذُ القُرآنَ فَيَرفُضُهُ، ويَنَامُ عَنِ الصَّلاةِ المَكْتُوبَةِ. وأَمَّا الرَّجُلُ الَّذِي أَتَيْتَ عَلَيْهِ يُشَرْشَرُ شِدْقُهُ إِلَى قَفَاهُ، ومِنْخَرُهُ إِلَى قَفَاهُ، وَعَيْنُهُ إِلَى قَفَاهُ، فإنَّهُ الرَّجُلُ يَغْدُو مِنْ بَيْتِهِ فَيَكْذِبُ الكِذْبَةَ تَبْلُغُ الآفاقَ. وأَمَّا الرِّجَالُ والنِّسَاءُ العُراةُ الَّذِينَ هُمْ في مثْلِ بناءِ التَّنُّورِ، فَإِنَّهُمُ الزُّنَاةُ والزَّوانِي، وأما الرجلُ الذي أتيتَ عليهِ يَسْبَحُ في النهرِ، ويلقمُ الحجارةَ، فإنَّهُ آكلُ الربا،

وأمَّا الرَّجُلُ الكَرِيهُ المرآةِ الَّذِي عِنْدَ النَّارِ يَحُشُّهَا وَيَسْعَى حَوْلَهَا، فإنَّهُ مالكٌ خازِنُ جَهَنَّمَ، وأمَّا الرَّجُلُ الطَّوِيلُ الَّذِي فِي الرَّوْضَةِ، فإنَّهُ إبراهيم ﷺ، وأمَّا الولدان الَّذِينَ حَوْلَهُ، فكلُّ مَوْلُودٍ مات عَلَى الفِطْرَةِ)) وفي رواية البَرْقَانِيِّ: ((وُلِدَ عَلَى الفِطْرَةِ)) فَقَالَ بعض المُسلمين: يَا رسولَ الله! وأولادُ المُشركين. فقالَ رسولُ اللهِ ﷺ: ((وأولادُ المشركين، وأما القومُ الذين كانُوا شَطْرٌ مِنْهُمْ حَسَنٌ، وشَطْرٌ مِنْهُمْ قَبِيحٌ، فإنَّهُمْ قومٌ خَلَطُوا عَمَلاً صَالِحاً وآخَرَ سَيِّئاً، تَجَاوَزَ اللهُ عنهم)). رواه البخاري.

وفي روايةٍ لَهُ: ((رَأَيْتُ اللَّيْلَةَ رَجُلَيْنِ أتيانِي فأخْرَجَانِي إلَى أرْضٍ مُقَدَّسَةٍ)) ثُمَّ ذَكَرَهُ وقال: ((فَانْطَلَقْنَا إلَى نَقْبٍ مثلِ التَّنُّورِ، أعْلاهُ ضَيِّقٌ وَأسْفَلُهُ واسِعٌ؛ يَتَوَقَّدُ تَحْتَهُ ناراً، فإذا ارْتَفَعَتِ ارْتَفَعُوا حَتَّى كَادُوا أنْ يَخْرُجُوا، وَإذَا خَمَدَتْ! رَجَعُوا فِيهَا، وفيها رِجالٌ ونِساءٌ عُراةٌ)). وفيها: ((حَتَّى أتَيْنَا عَلَى نَهْرٍ مِنْ دَمٍ)) ولم يشكَّ ((فِيهِ رَجُلٌ قائِمٌ عَلَى وَسَطِ النَّهْرِ وعلى شَطِّ النَّهرِ رجلٌ، وبينَ يديهِ حِجارةٌ، فأقبلَ الرجلُ الذي في النَّهرِ، فَإذَا أرادَ أنْ يَخْرُجَ رَمَى الرَّجُلُ بِحَجَرٍ في فِيهِ، فَرَدَّهُ حيثُ كَانَ، فَجَعَلَ كُلَّمَا جاءَ لِيَخْرُجَ جَعَلَ يَرْمِي فِي فِيهِ بِحَجَرٍ، فَيَرْجِعُ كما كَانَ)). وفيها: ((فَصَعِدَا بي الشَّجَرَةَ، فَأدْخَلانِي دَاراً لَمْ أرَ قَطُّ أحْسَنَ مِنْهَا، فيهَا رِجَالٌ شُيُوخٌ وَشَبَابٌ)). وفيها: ((الَّذِي رَأيْتَهُ يُشَقُّ شِدْقُهُ فَكَذَّابٌ، يُحَدِّثُ بِالكِذْبَةِ فَتُحْمَلُ عَنْهُ حَتَّى تَبْلُغَ الآفَاقَ، فَيُصْنَعُ بِهِ مَا رَأَيْتَ إلَى يومِ القِيَامَةِ))، وَفِيهَا: ((الَّذِي رَأيْتَهُ يُشْدَخُ رَأسُهُ فَرَجُلٌ عَلَّمَهُ اللهُ القُرْآنَ، فَنَامَ عَنْهُ بِاللَّيْلِ، وَلَمْ يَعْمَلْ فِيهِ بالنَّهارِ، فَيُفْعَلُ بِهِ إلَى يَوْمِ القِيَامَةِ

،والـدَّارُ الأولَى الَّتِي دَخَلْتَ دَارُ عَامَّةِ الْمُؤْمِنِينَ، وأمَّا هذهِ الدَّارُ فَدَارُ الشُّهَدَاءِ، وأنا جِبْرِيلُ، وهذا مِيكائِيلُ، فَارْفَعْ رَأْسَكَ، فَرَفَعْتُ رَأْسِي، فإذَا فَوْقِي مِثْلُ السَّحابِ، قالا: ذاكَ مَنْزِلُكَ، قُلْتُ: دَعَانِي أَدْخُلْ مَنْزِلِي، قالا: إنَّهُ بَقِيَ لَكَ عُمُرٌ لَمْ تَسْتَكْمِلْهُ، فَلَوِ اسْتَكْمَلْتَهُ أَتَيْتَ مَنْزِلَكَ)). (رواہ البخاری)

قَوْله: ((يَثْلَغ رَأسَهُ)) هُوَ بالثاءِ المثلثةِ والغينِ المعجمة، أيْ: يَشدَخُهُ وَيَشُقُّهُ. قولهُ: ((يَتَدَهْدَهُ)) أيْ: يَتَدَحرجُ. و((الكَلُّوبُ)) بفتح الكاف وضم اللام المشددة، وَهُوَ معروف. قَوْله: ((فَيُشَرْشِرُ)): أيْ: يُقَطِّعُ. قَوْله: ((ضَوْضَوا)) وَهُوَ بضادين معجمتين: أيْ صاحوا. قَوْله: ((فَيَفْغَرُ)) هُوَ بالفاءِ والغين المعجمة، أيْ: يفتح. قَوْله ((المَرآة)) هُوَ بفتح الميم، أيْ: المنظر. قَوْله: ((يَحُشُّها)) هُوَ بفتح الياءِ وضم الحاء المهملة والشين المعجمة، أيْ: يوقِدُها. قَوْله: ((رَوْضَةٍ مُعْتَمَّةٍ)) هُوَ بضم الميم وإسكان العين وفتح التاء وتشديد الميم، أيْ: وافية النَّباتِ طَويلَته. قَوْلُهُ: ((دَوْحَةٌ)) وهي بفتحِ الدال وإسكان الواو وبالحاءِ المهملة: وهي الشَّجَرَةُ الكَبيرةُ. قَوْلُهُ: ((المَحْضُ)) هُوَ بفتح الميم وإسكان الحاء المهملة وبالضَّادِ المعجمة، وَهُوَ: اللَّبَنُ. قَوْلهُ ((فَسَمَا بَصَرِي)) أيْ: ارْتَفَعَ. و((صُعُداً)) بضم الصاد والعين، أيْ: مُرْتَفعاً. وَ((الربَابَةُ)) بفتح الراءِ وبالباء الموحدة مكررةً، وهي: السَّحابَة.

ترجمہ مع تشریح: ۔ حضرت سمرہ بن جندب ؓ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ اپنے صحابہ سے کثرت سے یہ سوال فرماتے تھے کہ تم میں سے کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے؟ چناں چہ اللہ تعالیٰ جس کے متعلق چاہتے وہ اپنا خواب حضور اکرم ﷺ کے سامنے پیش کرتا (اور نبیٔ کریم ﷺ اس کی تعبیر بتلاتے ۔ روزانہ آپ کا یہی معمول تھا) ایک روز نبیٔ کریم ﷺ نے فجر کی نماز کے بعد اپنا خواب بیان فرمایا (یہ بھی آپ ﷺ کی عادتِ شریفہ تھی کہ آپ

نے خود بھی اگر کوئی خواب دیکھا ہوتا تو فجر کی نماز کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کے سامنے اس کو پیش فرماتے تھے۔ عوام میں جو مشہور ہے کہ کسی نے خواب دیکھا ہو تو جب تک کہ سورج نکل نہ جائے اس وقت تک بیان نہ کرے؛ یہ بالکل غلط ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہاں پر دیکھئے! نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فجر کی نماز کے بعد فوراً دریافت فرماتے تھے اس وقت سورج طلوع نہیں ہوا ہوتا تھا۔ بلکہ صبح کا وقت خواب دیکھنے کے زمانہ کے قریب ہوتا ہے اس لئے وہ زیادہ اچھی طرح یاد رہتا ہے۔ اس لیے جس سے تعبیر لینی ہے اس کے سامنے اسی وقت بیان کر لینا چاہئے اور اگر وہ اس وقت سامنے موجود نہیں ہے اور بعد میں اس سے ملاقات کی توقع ہے تو اسی وقت کم از کم لکھ تو لینا ہی چاہئے، تا کہ خواب کے کچھ اجزاء چھوٹنے نہ پاویں۔ چوں کہ جوں جوں وقت گزرتا ہے آدمی بھولتا جاتا ہے۔ اس لیے کہ عموماً آج کا دیکھا ہوا خواب آج جتنا یاد ہے اسی کو جب کل آپ بیان کریں گے تو اس میں سے تھوڑا بہت تو چھوٹ ہی جائے گا، اس لیے مناسب طریقہ یہی ہے کہ اگر تعبیر معلوم کرنی ہو تو اسی وقت لکھ تو لیا ہی جائے، باقی جب موقع ملے جس سے تعبیر لینی ہو وہ ملے تو اس وقت اس سے معلوم کیا جا سکتا ہے)۔

پتھر سے سر کچلا جانا

(بہر حال! نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک صبح کو اپنا خواب صحابہؓ کے سامنے بیان کیا) کہ آج رات میرے پاس دو آنے والے آئے (وہ دونوں فرشتے تھے جیسا کہ اخیر میں ایک روایت کے الفاظ پیش کریں گے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دونوں حضرت جبرئیل اور حضرت میکائیل علیہما السلام تھے۔ اور ویسے بھی انبیاء کا خواب وحی کے حکم میں ہوتا ہے، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خواب بھی وحی ہی ہے اس میں دوسری کوئی بات نہیں ہے۔ خیر!)

ان دونوں نے مجھ سے کہا: چلئے! وہ مجھے اپنے ساتھ لے چلے، میں ان کے ساتھ چلا تو ہمارا گزر ایک لیٹے ہوئے آدمی کے پاس سے ہوا، اس کے پاس ایک دوسرا آدمی ایک بڑا پتھر لیے ہوئے کھڑا تھا، اور وہ اس پتھر سے اس کی طرف مارنے کے ارادے سے آگے بڑھتا اور اس کے سر پر مار کر اس کا سر کچل ڈالتا، اور وہ پتھر اس کا سر کچلنے کے بعد لڑھک کر دور چلا جاتا، چنانچہ وہ کھڑا ہوا آدمی اس پتھر کو لینے کے لئے جاتا، اور جب پتھر لے کر واپس لوٹتا اس درمیان اس کا سر اپنی اصلی حالت پر آجاتا، پھر وہ آکر دوبارہ اس پتھر کو اس کے سر پر پھینکتا تو اس کا سر کچل جاتا، پھر وہ لینے جاتا، یہی سلسلہ جاری رہتا۔ نبیٔ کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ منظر دیکھ کر ان دونوں آدمیوں سے پوچھا: سبحان اللہ! یہ کیا منظر ہے؟ (میری سمجھ میں نہیں آیا) ان دونوں نے کچھ بتانے کی بجائے مجھ سے کہا: آگے چلئے۔ چناں چہ ہم آگے چل پڑے۔

آنکس سے منھ، ناک، آنکھوں کو چیرا جانا

اب ہمارا گزر ایک اور آدمی کے پاس سے ہوا جو چت لیٹا ہوا تھا اور دوسرا آدمی لوہے کا آنکس (آنکڑا) لیے ہوئے اس کے پاس کھڑا تھا اور لیٹے ہوئے آدمی کے منھ کی ایک باچھ میں داخل کر کے چیر کر گُدی تک لے آتا (گویا گردن تک کا حصہ چِرا جاتا) پھر اس آنکس کو ناک کے سوراخ میں دائیں طرف داخل کرتا اور کھینچ کر گدی تک لے آتا، پھر آنکھ کے اندر داخل کرتا یہاں تک کہ اس کو بھی چیر کر پیچھے گدی تک لے جاتا، اس کے بعد دوسری (بائیں) طرف جاتا۔ وہاں بھی منھ میں داخل کرتا اور گدی تک چیر دیتا، پھر (بائیں) نتھنے میں داخل کرتا اس کو بھی گُدی تک چیر دیتا، پھر آنکھ میں داخل کرتا اور اس کو بھی گُدی تک چیر دیتا، ابھی دوسری جانب سے فارغ نہیں ہوتا کہ پہلے والی جانب اصلی حالت پر آجاتی ہے، اور یہی سلسلہ جاری رہتا۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس منظر کو دیکھ کر میں نے ان دونوں سے پوچھا: سبحان اللہ! یہ دونوں کون ہیں؟ ان

دونوں نے مجھ سے کہا: آگے چلئے۔ چناں چہ ہم آگے چلے۔

تنور میں شور مچاتے ننگے مرد و عورتیں

یہاں تک کہ ہمارا گزر تنور جیسی چیز کے پاس سے ہوا (''تنور'' ایک چولہا ہوتا ہے جس میں روٹی پکتی ہے، کنویں کی طرح ہوتا ہے جس کے اوپر کا منہ تنگ ہوتا ہے اور نیچے اندر چوڑا ہوتا ہے، اس میں آگ جلی ہوئی ہوتی ہے) دور سے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تنور ہے، لیکن اس میں سے شور کی آوازیں آرہی تھیں، ان آوازوں کو سن کر ہم نے اندر جھانکا تو دیکھا اندر ننگے مرد اور ننگی عورتیں تھیں اور نیچے کی طرف سے آگ کا شعلہ اوپر بلند ہوتا، تو اس کی لپٹ کو اوپر آتا دیکھ کر وہ لوگ شور مچاتے اور چیختے (جیسے کوئی آدمی آگ کی لپٹ کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھے اور اس سے بچنے کا اس کے پاس کوئی علاج نہ ہو، نہ وہاں سے ہٹ سکتا ہو، تو شور مچانے کے علاوہ اور کیا کرے گا؟) میں نے ان دونوں آدمیوں سے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں؟ ان دونوں نے مجھ سے کہا: آگے چلئے۔ چناں چہ ہم آگے چلے۔

خون کی نہر میں تیرتا ہوا آدمی

پھر ہمارا گزر ایک نہر پر سے ہوا۔ حضرت سمرہؓ جو اس روایت کے نقل کرنے والے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ: میرا خیال یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمایا کہ: وہ نہر ایک دم لال خون کی طرح تھی، اس نہر میں ایک آدمی تیر رہا تھا اور اس نہر کے کنارے پر ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا جس نے اپنے پاس بہت سارے پتھر جمع کر رکھے تھے، وہ تیرنے والا تیرتے ہوئے جس نے پتھر جمع کر رکھے تھے اس کے پاس پہنچتا تو وہ بیٹھا ہوا آدمی اس کا منہ اپنے ہاتھ سے کھولتا اور اس کے منہ میں ایک پتھر رکھ دیتا۔ پھر وہ واپس چلا جاتا، اور دوبارہ اسی طرح تیرتے ہوئے آتا تو وہ اس کے منہ میں

پتھر رکھ دیتا، جب بھی وہ واپس آتا ہے یہ اس کا منہ کھول کر ایک پتھر اس میں رکھ دیتا ہے۔ یہی سلسلہ جاری رہتا۔ میں نے ان دونوں سے پوچھا: یہ دونوں کون ہیں؟ تو ان دونوں نے مجھ سے کہا: آگے چلئے۔ چناں چہ ہم آگے بڑھے۔

بھیانک شکل والا آدمی

اس کے بعد ہمارا گزر ایک آدمی کے پاس سے ہوا جس کی شکل وصورت ایسی بھیانک تھی جیسی کہ تم بھیانک سے بھیانک آدمی کا تصور کر سکتے ہو۔ اور اس کے پاس آگ تھی جس کو وہ اور زیادہ بھڑکا رہا تھا اور اس کے چاروں طرف چکر کاٹ رہا تھا۔ میں نے ان دونوں سے پوچھا: یہ کون ہے؟ تو انہوں نے کہا: آگے چلئے۔ چناں چہ ہم آگے بڑھے۔

گھنا پھول دار باغ اور بچے

پھر ہم ایک باغ کے پاس پہنچے جو بڑا گھنا اور گنجان تھا، اس میں ہر طرح کے پھول تھے جیسے موسم بہار میں مختلف قسم کے پھول ہوتے ہیں۔ اور اس باغ کے بیچ میں ایک اتنے لمبے آدمی بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کے لمبے پن کی وجہ سے مجھے ان کا سر نظر نہیں آرہا تھا۔ اور ان کے آس پاس بہت سارے ایسے بچے تھے جو کبھی مجھے نظر نہیں پڑے۔ میں نے پوچھا: یہ کون شخص ہیں اور ان کے آس پاس جو بچے ہیں وہ کون ہیں؟ تو ان دونوں نے کہا: آگے چلئے، چناں چہ ہم آگے چل دیے۔

جنتِ عدن

اس کے بعد ہم ایک بڑے درخت کے پاس پہنچے، اتنا بڑا اور اس سے زیادہ خوبصورت درخت میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا، ان دونوں نے مجھ سے کہا: اس پر چڑھئے۔ چناں چہ ہم اس پر چڑھے تو ہم ایک ایسی آبادی اور بستی میں پہنچے جس کے مکانات کی ایک اینٹ سونے کی اور ایک

اینٹ چاندی کی تھی۔ ہم اس بستی کے دروازے پر آئے اور اس کو کھلوایا تو ہمارے لئے کھولا گیا، چناں چہ ہم اندر داخل ہو گئے۔ تو ہماری ملاقات بہت سارے ایسے آدمیوں سے ہوئی جن کے جسم کا آدھا حصہ تو بڑا ہی بہترین اور ایسا خوبصورت تھا جس کی خوبصورتی آپ تصور کر سکتے ہو۔ اور دوسرا آدھا حصہ ایسا بدصورت تھا جس کی بدصورتی کا آپ تصور کر سکتے ہو۔ تو میرے ساتھ جو دو آدمی تھے انہوں نے ان سب آدمیوں سے ایک نہر کی طرف اشارہ کر کے کہا: اس میں کود جاؤ۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ وہاں ایک نہر بہہ رہی تھی اور اس کا پانی دودھ کی طرح ایک دم سفید تھا۔ چناں چہ وہ لوگ اس میں کود گئے۔ پھر جب وہاں سے نکل کر ہمارے پاس واپس آئے تو ان کی وہ بدصورتی ختم ہو چکی تھی۔ اور ان کا پورا جسم ایک دم خوبصورت بن چکا تھا اور وہ سب بہترین شکل وصورت میں آ چکے تھے۔ ان دونوں نے بتلایا کہ اس وقت ہم جہاں ہیں یہ جنتِ عدن ہے۔

حضور کا گھر

اور اوپر اشارہ کر کے بتلایا کہ وہ آپ کا گھر ہے۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ جب ان دونوں نے اوپر اشارہ کیا تو میری نگاہیں آسمان کی طرف اوپر اٹھیں تو میں نے دیکھا کہ سفید بادل جیسا ایک محل ہے،۔ دونوں نے کہا: یہ آپ کا مکان ہے (حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں) میں نے ان سے کہا: اللہ آپ کو برکت دے، مجھے چھوڑ یئے تا کہ میں چلا جاؤں۔ انہوں نے کہا: آپ تشریف ضرور لے جائیں گے؛ مگر ابھی نہیں۔

عجیب وغریب مناظر کی تعبیر

پھر میں نے ان سے کہا کہ: میں نے آج رات عجیب وغریب مناظر اور عجیب عجیب چیزیں جو دیکھیں؛ یہ سب کیا ہے؟ ذرا بتاؤ تو سہی۔ تو ان دونوں نے کہا: اب ہم آپ کو بتلاتے ہیں:

غیر عامل حافظِ قرآن

وہ پہلا آدمی جس کے پاس سے آپ گزرے تھے اور جس کا سر پتھر کے ذریعہ سے کچلا جارہا تھا؛ وہ وہ آدمی ہے جس نے قرآنِ پاک حفظ کیا، قرآن پاک کے مسائل سے واقف ہے، پھر بھی سو یا رہتا ہے اور اور فجر کے لئے نہیں آتا، قرآن پاک کا علم حاصل کیا پھر اس پر عمل کرنا چھوڑ دیا؛ اس کو عالمِ برزخ میں ہمیشہ یہی سزا دی جاتی رہے گی۔

جھوٹے پروپیگنڈے کرنے والا

وہ دوسرا جو منظر آپ نے دیکھا تھا کہ ایک آدمی چت لیٹا ہوا ہے اور دوسرے کے ہاتھ میں آنکس (آنکڑا) ہے، اور وہ اس کے منھ کو، نتھنے کو اور آنکھ کو دائیں طرف سے چیرتا ہے، پھر بائیں طرف جاتا ہے اور اس کو چیرتا ہے اتنی دیر میں دائیں طرف والا ٹھیک ہو جاتا ہے؛ وہ وہ آدمی ہے جو صبح کے وقت اپنے گھر سے نکلتا ہے اور جھوٹی باتیں لوگوں میں چلاتا ہے اور وہ پھیل جاتی ہیں اس کو عالم برزخ میں قیامت قائم ہونے تک یہی سزا دی جاتی رہے گی۔

بس! یہاں اس روایت کو جھوٹ کی برائی بیان کرنے کے لئے لائے ہیں۔

زانی اور زانیہ

اور وہ تنور میں بہت سارے ننگے مرد اور ننگی عورتیں جو دیکھیں، وہ زنا کرنے والے مرد اور زنا کرنے والی عورتیں ہیں؛ ان کو عالم برزخ میں یہی عذاب دیا جاتا رہے گا۔

سود کھانے والا

اور ایک آدمی آپ نے دیکھا تھا جو خون جیسی لال نہر میں تیرتا ہوا کنارے پر آتا تھا اور

وہاں ایک آدمی بہت سارے پتھر لیے ہوئے بیٹھا تھا جو اس کا منھ کھول کر اس میں پتھر رکھ دیتا تھا؛ وہ سود کھانے والا ہے؛ اس کو عالم برزخ میں قیامت تک یہی عذاب دیا جاتا رہے گا۔

جہنم کا داروغہ ''مالک''

اور وہ ایک بدشکل آدمی جو آپ نے دیکھا تھا جس کے پاس آگ تھی اور وہ اس کو بھڑکا رہا تھا اور اس کے چاروں طرف گھومتا تھا؛ وہ جہنم کا داروغہ ''مالک'' فرشتہ ہے۔

حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اور بچپن میں فوت شدہ بچے

اور باغ میں جو ایک لمبے آدمی دیکھے تھے جن کا سر بھی ان کے لمبے پن کی وجہ سے نظر نہیں آتا تھا وہ حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام تھے۔ اور ان کے پاس جو بہت سارے بچے تھے وہ وہ بچے ہیں جن کی موت فطرت پر واقع ہوئی۔

فطرت کا مطلب

کسی آدمی کے یہاں جب بھی کوئی بچہ ہوتا ہے وہ چاہے مسلمان ہو، غیر مسلم ہو یہودی ہو، نصرانی ہو، مجوسی یا اور کوئی بھی ہو؛ ہر ایک کے گھر جب بھی کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو پیدائشی طور پر اللہ تعالیٰ نے اس بچے کے دل میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور رسولوں کی رسالت کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھی ہوتی ہے۔ اگر اس کو اپنی اسی حالت پر باقی رکھا جائے اور غلط تربیت کے ذریعہ سے اس کی صلاحیت کو ختم نہ کیا جائے تو وہ مسلمان اور مؤمن ہی باقی رہے گا، لیکن پھر یہ ہوتا ہے کہ اس بچے کی تربیت جس ماحول میں ہوتی ہے اسی ماحول کا اثر دل میں قبول کر لیتا ہے، اب وہ جس چیز کو لے کر آیا تھا وہ باقی نہیں رہتی۔ اگر اس کی غلط تربیت نہ کی جائے، اور وہ جس حالت میں پیدا ہوا ہے

اسی کیفیت پر باقی رکھا جائے تو اللہ تعالیٰ نے اس میں ایسی صلاحیت رکھی ہے کہ بڑے ہونے کے بعد خود ہی وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرے گا اور اسلام قبول کرے گا۔ چناں چہ جو بچے اسی حالت میں انتقال کر گئے کہ ان کی اس صلاحیت کو ضائع نہیں کیا گیا تھا، اور ان کی موت بچپن میں آ گئی تھی ایسے سب بچے جنت میں حضرت ابراہیمؑ کے پاس ہیں۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا، تو صحابہ میں سے کسی نے پوچھا: یارسول اللہ! کافروں کے بچے بھی جو فطرت پر مرے (جنت میں ہوں گے؟) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مشرکین کی اولاد بھی (جو اپنی فطرت پر انتقال کر گئے؛ جنت میں جائیں گے)۔

گنہگار مؤمنین

اور وہ باغ جس میں آپ داخل ہوئے تھے اور وہاں بہت سارے مرد نظر آئے تھے، جن کے جسم کا آدھا حصہ خوبصورت اور آدھا بدصورت تھا؛ وہ وہ اہلِ ایمان تھے جنہوں نے اپنی زندگی میں اچھے اعمال بھی کیے تھے اور برے اعمال بھی کئے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان سے درگزر کا معاملہ کر کے ان کو جنت میں داخل کرے گا۔ اور ان کی بدعملی کی وجہ سے جسم کا آدھا حصہ جو بدصورت تھا، جنت میں جانے کے بعد اس کی بدصورتی دور ہو جائے گی۔ یہ بخاری شریف کی روایت ہے۔

اسی روایت کی مزید تفصیل

اور بخاری شریف ہی کی دوسری روایت میں یہ ہے:- حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: آج رات میں نے دو آدمیوں کو دیکھا جو میرے پاس آئے، اور مجھے ایک مقدس سرزمین کی طرف لے گئے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا وہی خواب بیان کیا جو اوپر گزرا، لیکن اس میں آپ نے فرمایا کہ: ہم ایک سرنگ یا غار کے پاس سے گزرے، جو کھائی اور تنور کی طرح تھا جس کے اوپر کا حصہ تنگ اور

نیچے کا حصہ چوڑا تھا، نیچے آگ جل رہی تھی، جب آگ کے شعلے بلند ہوتے تھے تو جو لوگ اندر تھے وہ شعلوں کے ساتھ ساتھ اوپر تک آجاتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی باہر نکل آئیں گے، لیکن وہ نکل نہیں پاتے تھے۔ اور جب وہ شعلہ ٹھنڈا پڑتا اور نیچے ہوجاتا تو وہ پھر اندر بیٹھ جاتے تھے ۔اس میں بہت سارے ننگے مرد اور ننگی عورتیں تھیں۔

اسی راویت میں یہ بھی ہے: پھر ہمارا گزر خون کی ایک نہر پر سے ہوا۔ (اوپر والی روایت میں صرف رنگ بتلایا تھا کہ اس کا رنگ لال خون جیسا تھا، لیکن صاف طور پر یہ نہیں بتلایا تھا کہ وہ خون کی نہر تھی، اور اس روایت میں بلاتردد بتلادیا کہ وہ خون کی نہر تھی) اور نہر کے بیچ میں ایک آدمی کھڑا تھا اور دوسرا آدمی نہر کے کنارے پر تھا، جو نہر کے کنارے پر تھا اس کے پاس پتھر تھے، وہ نہر کے بیچ والا آدمی جب آگے بڑھتا اور باہر نکلنا چاہتا تو یہ پتھر مار کر اس کو واپس اندر ہی ڈھکیل دیتا اور وہ جہاں تھا دوبارہ وہیں پہنچ جاتا۔

اور اس روایت میں یہ بھی ہے کہ: وہ دونوں آدمی مجھے لے کر ایک درخت پر چڑھے، اور مجھے ایک بڑی جگہ میں داخل کیا، جس سے خوبصورت جگہ میں نے پہلے نہیں دیکھی، اس میں بوڑھے بھی تھے، جوان بھی تھے۔

اور اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ: وہ جس کی باچھوں کو چیرا جاتا تھا وہ جھوٹا آدمی ہے جو خوب جھوٹ بولتا تھا، اور وہ جھوٹ دوسرے لوگ اس سے لیتے تھے، یہاں تک وہ دنیا میں پھیل جاتا تھا، اس کو یہ سزا قیامت تک دی جاتی رہے گی۔

اسی روایت میں یہ بھی ہے: وہ جس کا سر پتھر کے ذریعہ سے کچلا جارہا تھا، وہ آدمی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک سکھایا، جس کا تقاضا یہ تھا کہ راتوں کو کھڑا ہو کر نماز کے اندر قرآنِ پاک کی تلاوت کرتا، اس کے بجائے وہ پڑا سوتا رہا۔ اور دن میں بھی قرآنِ پاک کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا اور شریعت پر عمل نہیں کیا، اس کے ساتھ بھی قیامت تک یہی معاملہ کیا جائے گا۔

اور وہ پہلی جگہ جہاں آپ داخل ہوئے تھے وہ عام مؤمنین کی جنت تھی، اور یہ دوسرا شہداء کا مکان ہے، اور میں جبرئیل اور یہ میکائیل ہیں۔ اور آپ ذرا اپنا سر اٹھائیے۔ تو میں نے سر اٹھایا تو میرے اوپر بہت اونچائی پر ایک بادل کی طرح تھا انہوں نے کہا: وہ آپ کا مکان ہے۔ میں نے کہا: مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنے مکان میں داخل ہوجاؤں، تو انہوں نے کہا: ابھی آپ کی عمر باقی ہے، جو آپ نے پوری نہیں کی ہے، جب آپ اپنی عمر پوری کرلیں گے تو اس میں داخل ہوں گے۔

اس کے بعد علامہ نوویؒ نے روایت کے بہت سارے الفاظ کی تشریح فرمائی ہے۔

باب بیان مایجوز من الکذب

کن مواقع پر جھوٹ کی اجازت ہے؟

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ویسے جھوٹ تو حرام ہے لیکن بعض مواقع ایسے ہیں جس میں شریعت کی طرف سے جھوٹ کی اجازت دی گئی ہے۔ اب وہ کون سے مواقع ہیں؟ علامہ نوویؒ اسی کو بتلاتے ہیں:۔

إعلَمْ أنَّ الكَذِبَ وإنْ كَانَ أصلُهُ مُحَرَّماً، فَيَجُوزُ فى بَعْضِ الأحوَالِ بِشُروطٍ قَدْ أوضَحتُهَا فى كتاب: "الأذْكَارِ" ومُختَصَرُ ذَلِكَ: أنَّ الكلامَ وسيلَةٌ إلَى المَقَاصِدِ، فَكُلُّ مَقْصُودٍ مَحْمُودٍ يُمْكِنُ تَحْصِيلُهُ بِغَيْرِ الكَذِبِ يَحْرُمُ الكَذِبُ فِيهِ، وإنْ لَمْ يُمْكِنْ تَحْصِيلُهُ إلاَّ بالكَذِبِ، جازَ الكَذِبُ.

ثُمَّ إنْ كَانَ تَحْصِيلُ ذَلِكَ المَقْصُودِ مُبَاحاً كَانَ الكَذِبُ مُبَاحاً، وإنْ كَانَ وَاجِباً، كَانَ الكَذِبُ وَاجِباً. فإذا اختَفَى مُسلِمٌ مِنْ ظَالِمٍ يُرِيدُ قَتْلَهُ، أَوْ أَخذَ مَالِهِ وأخفى مالَه وَسُئِلَ إنْسَانٌ عَنْهُ، وَجَبَ الكَذِبُ بإخْفَائِه.

وكذا لو كانَ عِندَهُ وديعَةٌ، وأراد ظالمٌ أخذها، وجبَ الكذبُ بإخفاءها. وَالأحوَطُ فى هَذَا كُلِّهِ أن يُوَرِّىَ.

ومعْنَى التَّوْرِيَةِ: أنْ يَقْصِدَ بِعِبَارَتِهِ مَقْصُوداً صَحيحاً لَيْسَ هُوَ كَاذِباً بالنِّسبَةِ إلَيْهِ، وإنْ كَانَ كَاذِباً فى ظَاهِرِ اللَّفظِ، وبالنِّسبَةِ إلَى مَا يَفْهَمُهُ المُخَاطَبُ.

وَلَوْ تَرَكَ التَّوْرِيَةَ وَأَطْلَقَ عِبَارَةَ الْكَذِبِ، فَلَيْسَ بِحَرَامٍ فِي هَذَا الْحَالِ.

وَاسْتَدَلَّ الْعُلَمَاءُ بِجَوَازِ الْكَذِبِ فِي هَذَا الْحَالِ بِحَدِيثِ أُمِّ كُلْثُومٍ رضی اللہ عنہا أنها سمعت رسولَ الله ﷺ يقول: ((لَيْسَ الْكَذَّابُ الَّذِي يُصْلِحُ بَيْنَ النَّاسِ، فَيَنْمِي خَيْراً أَوْ يَقُولُ خَيْراً)) (متفق عَلَيْهِ)

زاد مسلم في رواية: قالت أُمُّ كُلْثُومٍ: وَلَمْ أَسْمَعْهُ يُرَخِّصُ فِي شَيْءٍ مِمَّا يَقُولُ النَّاسُ إِلاَّ فِي ثَلاَثٍ، تَعْنِي: الْحَرْبَ، وَالإِصْلاَحَ بَيْنَ النَّاسِ، وَحَدِيثَ الرَّجُلِ امْرَأَتَهُ، وَحَدِيثَ الْمَرْأَةِ زَوْجَهَا.

ویسے تو جھوٹ حرام ہے لیکن بعض حالات میں کچھ شرطوں کے ساتھ اس کی اجازت دی گئی ہے جس کو میں نے کتاب الاذکار میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہاں مختصراً بیان کرتا ہوں۔ گفتگو، کلام اور بات یہ تو آدمی کے اپنے مقاصد حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے، ہر اچھا مقصد جس کو آپ جھوٹ کے بغیر حاصل کر سکتے ہوں، وہاں شریعت نے جھوٹ بولنے کی اجازت نہیں دی، اور اگر اس کو جھوٹ کے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا؛ تو وہاں گنجائش نکل سکتی ہے۔ اب یہاں علامہ نوویؒ نے جھوٹ کے جواز کی کچھ تفصیل بتائی ہے، لیکن چوں کہ امام نوویؒ شافعی المسلک ہیں لہٰذا شافعی مسلک کے اعتبار سے بتلاتے ہیں۔ احناف کے نزدیک جھوٹ کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے، امام ابوحنیفہؒ نے جھوٹ کی کسی حال میں بھی اجازت نہیں دی، یہاں تک کہ اگر کسی آدمی کو جان کا خطرہ ہو اور اس کو یقین ہو کہ اگر میں جھوٹ بولوں گا تب ہی جان بچا سکوں گا، یا اپنے بھائی کی جان بچا سکوں گا؛ تو اس صورت میں بھی اگر توریہ اور تعریض سے کام چل سکتا ہو تو توریہ اور تعریض ہی کرنا چاہئے، جھوٹ بولنے کی اجازت نہیں ہے

تعریض کا ایک نمونہ

توریہ اور تعریض کا مطلب یہ ہے کہ ایسی گول مول بات جس کو سنتے ہی سننے والے کے ذہن میں اس کا ایک ظاہری مطلب آجاتا ہے، مگر آپ وہ ظاہری مطلب مراد نہیں لیتے بلکہ آپ اس کا دور کا کوئی مطلب مراد لیتے ہیں۔

جیسا کہ سیرت کی کتابوں میں ایک قصہ آتا ہے کہ جب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سفر ہجرت میں مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہوئے تو آپ کے ساتھ اس سفر میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی تھے، اُن حضرات کے روانہ ہو چکنے کے بعد مکہ والوں نے ان کو تلاش کیا، یہ حضرات مکہ مکرمہ سے نکلنے کے بعد غار ثور ہی میں ٹھہر گئے تھے جو مکہ مکرمہ کے بالکل قریب ہی ہے، کیوں کہ انہیں یقین تھا کہ جب مکہ والوں کو پتہ چلے گا کہ یہ حضرات روانہ ہو گئے ہیں تو وہ ضرور تلاش کریں گے، لہٰذا پکڑے نہ جائیں اس لیے تین روز تک غار ثور میں پناہ لی تا کہ جب تلاش و جستجو کا سلسلہ ختم ہو جائے اور لوگ مایوس ہو جائیں اس کے بعد اپنا سفر شروع کیا جائے گا۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا، تین روز کے بعد پھر سفر شروع کیا لیکن چوں کہ مکہ والوں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق اعلان کیا تھا کہ جو ان کو زندہ یا مردہ گرفتار کر کے لائے گا اس کو ایک سو اونٹ انعام میں دیئے جائیں گے۔ یہ بہت بڑا انعام تھا جیسے: آج کل لاکھوں ڈالروں کے انعام کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اس انعام کے لالچ میں بعض لوگ تلاش میں نکلے تھے، ایک آدمی ان حضرات کو راستے میں مل گیا جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پہچانتا تھا لیکن نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہیں پہچانتا تھا۔ جب اس نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ ان کے ساتھ ایک اور آدمی بھی ہیں تو اس نے پوچھا: یہ کون ہیں؟ اب اگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بتا دیتے کہ

حضورا کرم ﷺ ہیں تو بات کھل جانے کا اندیشہ تھا، اور اس کے نتیجہ میں آپ ﷺ کی جان کو خطرہ تھا، اور اگر کچھ اور کہتے تو جھوٹ ہو جاتا۔ اس وقت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا: ''هٰذَا رَجُلٌ يَهْدِيْنِي الطَّرِيْقَ'' یہ آدمی مجھے راستہ بتلاتا ہے۔ اور چوں کہ عام طور پر عرب میں جب کسی آدمی کو لمبا سفر کرنا ہوتا تو راستہ بتلانے والے کو بھی ساتھ لے جاتا تھا۔ اب سننے والا تو یہی سمجھا کہ یہ رہبر (Guide) ہے، اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا اشارہ اس طرف تھا کہ یہ آدمی مجھے جنت کا اور اللہ کی طرف جانے کا اور آخرت کا راستہ بتلاتا ہے۔ گویا دونوں باتیں ہو گئیں؛ اسی کو توریہ اور تعریض کہتے ہیں۔

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کا توریہ

۱۸۵۷ء میں جب جنگِ آزادی چل رہی تھی اور ہمارے اکابر کا شاملی کے میدان میں انگریزوں کے ساتھ مقابلہ ہوا تو ان کے خلاف وارنٹ جاری کیے گئے، حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے متعلق بھی شکایتیں پہنچیں کہ ان کے پاس ہتھیار ہیں، لہٰذا ان کو بھی گرفتار کر کے میرٹھ لے گئے، اور جن کے متعلق بھی ان کو شکایت پہنچتی تو فوراً اسی جگہ پر مجسٹریٹ کی مجلس قائم کی جاتی اور فیصلہ کر کے پھانسی پر چڑھا دیا جاتا تھا۔ جب حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کو گرفتار کر کے لے گئے اور حضرت سے پوچھا: کیا آپ کے پاس ہتھیار ہیں؟ اس وقت حضرت کے ہاتھ میں تسبیح تھی اس کو بتلاتے ہوئے فرمایا: ہمارا ہتھیار تو یہ ہے۔ یہ نہیں کہا کہ ہتھیار نہیں ہیں، بلکہ کہا کہ ہمارا ہتھیار تو یہ ہے۔ ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ اتنے میں ایک دیہاتی آیا اور دیکھا کہ ان لوگوں نے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کو پکڑ رکھا ہے تو اس نے کہا: اس کو کہاں پکڑا ہے؛ یہ تو ہماری مسجد کا مؤذن ہے، یہ سن کر ان لوگوں نے حضرت کو چھوڑ دیا۔

حضرت نانوتویؒ کا توریہ

حضرت نانوتویؒ کے خلاف بھی وارنٹ جاری ہوا تھا، حضرت چھتہ مسجد میں رہتے تھے، لہٰذا سرکاری آدمی وارنٹ لے کر حضرت کو گرفتار کرنے کے لئے جب پہنچے تو دیکھا ایک آدمی وہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اب چوں کہ حضرت نانوتویؒ اپنے زمانے کے بڑے زبردست عالم تھے، اس لیے وہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اتنا مشہور اور بڑا آدمی ہے تو جبہ و دستار، شیروانی اور عمامہ پہنے ہوئے ہوگا، حالاں کہ حضرت تو بہت سادہ رہتے تھے، نیلی لنگی اور گاڑھے کا کرتہ ہوتا تھا۔ خیر! ان لوگوں نے حضرت ہی سے پوچھا کہ: مولانا قاسم نانوتویؒ کہاں ہیں؟ حضرت جہاں تھے وہاں سے کچھ ہٹ گئے اور فرمایا: تھوڑی دیر پہلے یہیں تھے۔ وہ یوں سمجھے کہ تھوڑی دیر پہلے یہاں ہوں گے اب یہاں نہیں ہیں کہیں اور چلے گئے۔ اس کے بعد حضرت وہاں سے نکل گئے۔ اسی کو تعریض و توریہ کہتے ہیں اور اس کی اجازت ہے۔

جان بچانے کے لیے جھوٹ کی اجازت

ویسے علماء نے لکھا ہے کہ اگر تعریض اور توریہ ممکن نہ ہو اور جان کا خطرہ ہے، یا ناقابلِ برداشت ظلم کا اندیشہ ہے؛ تو اس صورت میں احناف کے یہاں بھی جھوٹ کی اجازت دی گئی ہے۔ جیسے: ایک آدمی کے دشمن اس کی جان کے درپے ہیں، اور وہ آپ سے پوچھیں کہ فلاں آدمی کہاں ہے؟ اور آپ کو معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے، لیکن آپ کو یقین ہے کہ اگر میں بتادوں گا تو یہ لوگ بلا وجہ اس کی جان لے لیں گے؛ تو اس صورت میں اگر توریہ نہ کر سکتے ہو تو جھوٹ بول کر بھی اس کی جان بچانے کی اجازت ہے؛

اگر چہ احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ توریہ یعنی گول مول بات کردی جائے۔

تین چیزوں میں جھوٹ کی اجازت

حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی روایت پیش کی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جوآدمی لوگوں کے درمیان صلح کرانے کے لئے خلافِ واقعہ بات بولتا ہے؛ تو وہ جھوٹا نہیں ہے۔

مثلاً: دو مسلمان بھائیوں میں یا سگے بھائیوں میں لڑائی ہے، اور آپ ان دونوں میں صلح کرانا چاہتے ہیں، اس لیے آپ ایک سے دوسرے کے متعلق یوں کہیں کہ میں نے خود سنا کہ وہ تو آپ کے لیے دعا کررہا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ عام طور پر ہر آدمی تمام مسلمانوں کے لئے عمومی دعا کرتا ہی ہے، اور آپ کی مراد بھی یہی ہے کہ عام مسلمانوں میں یہ بھی ہے، اس اعتبار سے یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ آپ کے لیے دعا کر رہا تھا۔ اگر چہ سننے والا سمجھے کہ میرا نام لے کر کوئی مخصوص دعا کررہا تھا۔ تو اب اس کے دل میں جو میل ہے وہ نکل جائے گا کہ میرا مخالف ہو کر میرے لیے دعا کا اہتمام کرتا ہے، اور یہی چیز آئندہ صلح کے لئے پلیٹ فارم تیار کردے گی اور آسانی سے صلح ہو جائے گی۔

مسلم شریف کی روایت میں یہ زیادتی ہے، حضرت ام کلثومؓ فرماتی ہیں: میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کبھی جھوٹ کی اجازت دیتے ہوئے نہیں سنا، مگر تین چیزوں میں: جنگ کے موقعہ پر دشمن کے مقابلے میں۔ اور لوگوں کے درمیان صلح کرانے کے لئے۔ اور شوہر اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لئے، یا بیوی اپنے شوہر کو خوش کرنے کے لئے۔ (لیکن اس میں یہ شرط ہے کہ کسی کی حق تلفی نہ ہوتی ہو، یا کوئی واجب حق ساقط نہ کرنا پڑتا ہو؛ تب ہی گنجائش دی گئی ہے)۔

باب الحث علی الثبت فیما یقولہ ویحکیہ

زبان کی حفاظت اور زبان سے جو جو گناہ سرزد ہوتے ہیں اسی سلسلے کا بیان چل رہا تھا، آج عنوان قائم کیا ہے: ''آدمی جو بھی بات کہے، یا نقل کرے اس میں پختگی کا اہتمام کرنے کی ترغیب''۔ شریعت نے اسی کی تاکید فرمائی ہے۔ اور جیسا کہ علامہ نوویؒ کا معمول ہے شروع میں قرآنِ پاک کی آیتیں پیش کرتے ہیں، یہاں جو آیتیں پیش کی ہیں وہ پہلے بھی کئی ابواب میں آچکی ہیں۔

''وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ. (الاسرأ:۳۶) ''جس چیز کا آپ کو علم نہ ہو اس کے درپے نہ ہوؤ۔

''مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ.(ق:۱۸) ''جو بات بھی آدمی اپنی زبان سے نکالتا ہے؛ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے اوپر ایک محافظ نگراں مقرر رہے جو بالکل چوکس ہے، گویا اس کی ہر چیز نوٹ اور ریکارڈ کی جارہی ہے۔

جھوٹا ہونے کے لئے اتنی بات کافی ہے

۱۵۴۷:-وعن ابی ھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان النبی ﷺ قال: كَفَى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ)). (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے اتنی ہی بات کافی ہے کہ جو چیز بھی سنے اس کو نقل کردے۔

افادات:- صبح سے شام تک ہمارے کانوں میں بے شمار باتیں پڑتی ہیں

اور کان میں پڑنے والی ساری ہی باتیں سچی نہیں ہوا کرتیں، ان میں کچھ باتیں سچی بھی ہوتی ہیں اور کچھ جھوٹی ہوتی ہیں۔ کچھ باتیں ایسی گھڑی ہوئی ہوتی ہیں جن میں جھوٹ کی ملاوٹ ہوتی ہے، لہٰذا کوئی آدمی اگر ایسی عادت ڈال لے کہ جو بھی سنے اس کو لوگوں کے سامنے بیان کردے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ خود بھی اس جھوٹ کو پھیلانے میں مدد کررہا ہے۔ جو احتیاط برتنی چاہئے تھی اور جس حزم واحتیاط اور پختگی سے کام لینا چاہئے تھا؛ وہ اس نے نہیں لیا۔ اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو آدمی اپنی سنی ہوئی ہر چیز لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہو؛ یہی اس کے جھوٹا ہونے کے لئے کافی ہے۔ اس لئے آدمی کے لئے ضروری ہے کہ جو باتیں بھی سنے، پہلے ان کی تحقیق کرے اور جب تک کسی بات کے متعلق سچائی کا یقین نہ ہوجائے، تب تک بیان نہ کرے۔ اور اس میں بھی پھر یہ حکم ہے کہ سچائی کا یقین ہونے کے بعد اگر اس کا بیان کرنا کسی ضرورت یا مصلحت پر مبنی ہو تب تو ٹھیک ہے، اس کو کسی کے سامنے نقل کرے۔ اور اگر کوئی بات چاہے سچی ہو لیکن اگر اس کو نقل کرنے میں غیبت کا ارتکاب ہورہا ہو، یا چغل خوری پائی جاتی ہو؛ تو اس صورت میں بھی اس سے بچنا ضروری ہے۔ اس لیے کہ چغل خوری اور غیبت میں بھی آدمی سچی بات ہی نقل کرتا ہے۔

بہر حال! پہلا مرحلہ یہ ہے کہ جو بھی چیز سنے اس کو نقل کرنے کی کوشش نہ کرے، بلکہ اس سلسلے میں پوری احتیاط پر عمل کرتے ہوئے تحقیق ہونی چاہئے، اور تحقیق ہونے کے بعد جس بات کی صداقت اور سچائی کا یقین ہوجائے تو پھر اس کے بیان کی بھی شریعت کی جانب سے اجازت ہونی چاہئے، یا کسی مصلحت کی بناء پر اس کا بیان کرنا ضروری ہو؛ تب ہی اس کو بیان کرے، ورنہ پھر اس کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں

ہے۔ باقی اگر کوئی آدمی ایسا ہے جس نے اپنی عادت ہی ایسی بنالی ہے کہ جو بھی سنتا ہے اس کو لوگوں کے سامنے نقل کر دیتا ہے؛ تو یہی اس کے جھوٹا ہونے کے لئے کافی ہے۔

جھوٹوں میں سے ایک

۱۵۴۸:- وعن سَمُرَةَ - رضی الله عنه - قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((مَنْ حَدَّثَ عَنِّي بِحَدِيثٍ يَرَى أَنَّهُ كَذِبٌ فَهُوَ أَحَدُ الكَاذِبِيْنَ.)) (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت سمرہ بن جندبؓ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی میری طرف سے کوئی ایسی بات نقل کرے کہ جس کے متعلق وہ خود بھی جانتا ہو کہ جھوٹ ہے؛ تو وہ دو جھوٹوں میں سے ایک ہے۔

افادات:- بعض روایتوں میں "أَحَدُ الكَاذِبِيْنَ" آیا ہے کہ، جھوٹوں میں کا ایک جھوٹا ہے، ویسے بھی کوئی جھوٹ بات نقل کرنا کبیرہ گناہ ہے اور خود نبیٔ کریم ﷺ کی طرف نسبت کرتے ہوئے کسی جھوٹ بات کو پھیلانے کا گناہ تو اور زیادہ ہے۔ بلکہ بعض حضراتِ علماء نے تو ایسے آدمی کے اوپر کفر تک کا فتویٰ لگایا ہے۔ اسی لیے نبیٔ کریم ﷺ کے ارشادات کو نقل کرنے کے معاملے میں بھی بہت احتیاط کی ضرورت ہے، جب تک کسی روایت کا صحیح سندوں سے ثبوت نہ ہو، یا کسی معتبر اور قابلِ وثوق کتاب میں اس کا تذکرہ نہ ہو؛ وہاں تک حضور ﷺ کی طرف نسبت کر کے بیان نہیں کیا جائے گا۔ ہمارے پاس دارالافتاء میں تو کثرت سے ایسے سوالات آتے ہیں کہ فلاں مقرر صاحب نے تقریر کی، اس میں انہوں نے کہا کہ حدیث میں یوں آیا ہے، حالاں کہ وہ چیز حدیث میں نہیں ہوتی۔ لہٰذا حدیث کے نام سے اور حضور اکرم ﷺ کے حوالے سے اور آپ کے نام سے کسی چیز کو بیان کرنا بہت بڑی ذمہ داری کی چیز ہے۔

حضراتِ صحابہؓ کی احتیاط

حضراتِ صحابۂ کرامؓ جو نبیٔ کریم ﷺ کے صحبت یافتہ تھے، اور حضورِ اکرم ﷺ کی باتیں اور آپ کے ارشادات براہِ راست اپنے کانوں سے سننے والے تھے، اس کے باوجود اس کے نقل کرنے میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لیتے تھے۔

حضرت زبیرؓ نبیٔ کریم ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں، ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ ان کے والد کی پھوپھی ہوتی ہیں۔ ان کی اہلیہ حضرت اسماءؓ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی بہن ہوتی ہیں، اس اعتبار سے وہ حضورِ اکرم ﷺ کے ہم زلف (સાઢુભાઈ) بھی ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی حضورِ اکرم ﷺ کے ساتھ کئی رشتہ داریاں ہیں، اور وہ عشرۂ مبشرہ میں سے بھی ہیں۔ حضورِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ''لِكُلِّ نَبِيٍّ حَوَارِيٌّ وَحَوَارِيَّ الزُّبَيْرُ'' ہر نبی کا ایک خصوصی معاون و مددگار ہوا کرتا ہے، اور میرے خصوصی مددگار حضرت زبیرؓ ہیں۔ اور حضورِ اکرم ﷺ نے جن دو صحابی کے متعلق یہ جملہ ارشاد فرمایا تھا: ''فِدَاكَ أَبِيْ وَأُمِّيْ'' میرے ماں باپ تم پر قربان۔ ان میں ایک یہی حضرت زبیر ہیں، اور دوسرے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ ہیں۔ بہر حال! یہ بہت سارے فضائل کے حامل تھے، اس کے باوجود حدیث بیان کرنے کے معاملہ میں بہت زیادہ احتیاط کرتے تھے۔

حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ جو صحابی ہیں انہوں نے ایک مرتبہ اپنے ابا حضرت زبیرؓ سے پوچھا کہ: فلاں فلاں (دو آدمیوں کے نام لیے) نبیٔ کریم ﷺ کے حوالے سے کثرت سے باتیں بیان کرتے ہیں، لیکن میں نے آپ کو نہیں دیکھا کہ کبھی بھی آپ حضور ﷺ کے حوالے سے اور حضور ﷺ کا نام لے کوئی بات بیان کرتے ہوں؛ ایسا

کیوں؟اس کے جواب میں حضرت زبیرؓ نے ارشاد فرمایا: مجھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو قرب اور نزدیکی تھی وہ تمہیں معلوم ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہؓ میری والدہ ہیں، اور ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ میرے ابّا کی پھوپھی ہیں، اور میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بڑی صحبت اٹھائی ہے، لیکن چوں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد سنا ہے: ''مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ'' جو آدمی میرے اوپر قصداً جھوٹ باندھے؛ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنالے۔ اس ارشاد کی وجہ سے میں بہت زیادہ احتیاط کرتا ہوں۔

بہت سارے صحابہ کا معمول یہی تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنے ہوئے ارشادات کو نقل کرنے کے بعد بھی وہ یوں نہیں کہتے تھے کہ یہ حضور کا ارشاد ہے۔ بعض حضرات نقل کرنے کے بعد احتیاط کے طور پر یوں کہا کرتے تھے کہ: اسی جیسا، یا اس سے ملتا جلتا، یا اس کے قریب قریب ارشاد فرمایا، حالاں کہ جو الفاظ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک زبان سے سنے ہوتے وہ انہیں کو نقل کرتے تھے، اس کے باوجود بھی بعد میں یوں کہا کرتے تھے، تاکہ اگر نقل کرنے میں ذرا انیس بیس فرق ہو بھی جائے تو اس تعبیر کے اندر آجائے۔ یہ بہت اہم چیز ہے۔

روایت بالمعنٰی کی اجازت ہے یا نہیں؟

یہاں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کو بجائے آپ کے الفاظ میں نقل کرنے کے اس کا مفہوم نقل کرنا- جس کو روایت بالمعنٰی کہتے ہیں- اس کی اجازت ہے یا نہیں؟ بعض حضراتِ محدثین تو اس سے بالکل ہی منع کرتے ہیں کہ اس کی اجازت ہی نہیں ہے۔ یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہی الفاظ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی

زبانِ مبارک سے ارشاد فرمائے تھے اگر آپ کو یاد ہیں؛ تب تو اس کو نقل کیجئے، اس صورت میں اگر آپ اس کا مفہوم و مطلب اپنی زبان اور الفاظ میں بیان کریں گے؛ تو اس کی اجازت نہیں ہے۔

لیکن جمہور علماء نے روایت بالمعنیٰ کی اجازت اس شرط کے ساتھ دی ہے کہ اس حدیث کو پوری طرح سمجھ کر نقل کرے، تاکہ جو مفہوم نقل کرے اس کے مطلب میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ معلوم ہوا کہ مفہوم نقل کرنے کے اندر بھی بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی جو چیز سنتا ہے اس کے سمجھنے میں اس سے غلطی ہو جاتی ہے، جیسے میں ایک بات کہہ رہا ہوں جس کو آپ اپنے کانوں سے سن رہے ہیں، لیکن میں اپنی بات کا جو مطلب لینا چاہتا ہوں آپ وہ مطلب نہیں سمجھے، بلکہ اس کے بجائے کوئی دوسرا مطلب سمجھے۔ اب وہ دوسرا مطلب جو آپ سمجھے ہیں اس کو آپ اپنے الفاظ میں بیان کریں گے کہ فلاں صاحب نے یوں کہا؛ تو ظاہر ہے کہ میں نے تو وہ نہیں کہا تھا جو آپ بیان کر رہے ہیں، لیکن آپ اس بات کو یہی سمجھ کر نقل کر رہے ہیں کہ میں نے جو بات کہی ہے اس کا مطلب اور مفہوم یہی ہے، حالاں کہ میرے کہنے کا وہ مفہوم تھا ہی نہیں، میری بات کا مفہوم سمجھنے میں آپ سے غلطی ہوئی۔ اب آپ جب اس بات کو میرے نام سے بیان کریں گے تو میری طرف جھوٹی نسبت ہو جائے گی۔ اسی طرح کوئی آدمی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات کو اگر مفہوم کی شکل میں پیش کرنا چاہتا ہو تو وہاں پر بھی ضروری ہے کہ اس کو وہ صحیح طور پر سمجھے، اور اپنے الفاظ میں اس کو صحیح طور سے ادا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو، یعنی اس کو مفہوم کی تعبیر کی اتنی صلاحیت ہو کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات اور آپ کے ارشادات کے مضمون کو کما حقہٗ صحیح طریقے سے ادا کر سکے؛ تب تو اس کو مفہوم کے انداز میں حدیث پیش کرنے کی اجازت دی گئی ہے؛ ورنہ نہیں۔

حدیث بیان کرنے میں بے احتیاطیاں

آج کل لوگ احادیث کو نقل کرنے کے معاملہ میں بڑی بے احتیاطیاں کرتے ہیں، اور پھر مشکل یہ ہے کہ اگر اس سلسلے میں ان سے پوچھا جائے کہ آپ نے بیان میں فلاں بات کہی؛ ذرا بتلا دیجئے؟ کسی کتاب کا حوالے دے دیجئے؟ تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ وہ تو میں نے کسی سے سنی ہے۔ لوگ ہمارے پاس دارالافتاء میں سوالات بھیجتے ہیں کہ ایک صاحب نے اپنی تقریر میں یوں کہا؛ آپ اس کا حوالہ دیجئے۔ کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ اس کی تحقیق میں کئی کئی دن نکل جاتے ہیں، لیکن تلاشِ بسیار کے بعد بھی جب کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ تو ہم لکھتے ہیں کہ جنہوں نے یہ بیان کیا ہے انہی سے حوالہ پوچھ لیجئے، اور پھر ہمارے پاس بھی بھیج دیجئے، تاکہ تحقیق کر کے آپ کو بتلائیں کہ جو حوالہ انہوں نے دیا ہے؛ وہ درست ہے یا نہیں؟ تو جواب آتا ہے کہ جنہوں نے یہ بات کہی ہے جب ہم ان سے حوالہ مانگتے ہیں تو وہ صاحب سخت ناراض ہو جاتے ہیں۔ حالاں کہ کسی بڑے سے بڑے آدمی کو بھی اس بات کی اجازت نہیں دی گئی ہے کہ بغیر حوالے کے حضور ﷺ کی طرف کوئی بھی چیز منسوب کرے۔

آج کل کے وضاعین

لہٰذا جو لوگ تقریروں میں بے احتیاطیاں کرتے ہیں؛ درحقیقت وہ اپنے آپ کو اس وعید کا مستحق بناتے ہیں، اس لیے ایسی باتوں سے بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ آپ نے کسی بڑے سے بڑے عالم سے کوئی بات سن لی ہو تب بھی اگر آپ کو حوالہ معلوم نہیں ہے، تو اس صورت میں آپ ایک دینی بات کے نام سے اس کو پیش

کر سکتے ہیں، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے اس کو بیان نہ کیا جائے۔ اب کمال تو یہ ہے کہ کسی سے پوچھا جائے کہ آپ نے کس سے سنا؟ تو وہ ان کا نام لینے کے لئے تیار نہیں ہوتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ درحقیقت وہ گھڑی ہوئی بات ہی ہوتی ہے۔ پہلے زمانے میں جیسے وضاعینِ حدیث تھے کہ حدیثیں گھڑ گھڑ کر بیان کیا کرتے تھے، ویسے ہی آج کل بھی حدیث گھڑ کر پیش کرنے والوں کا مستقل ایک سلسلہ چل پڑا ہے۔ اس سے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ یہ بڑی نادانی اور جہالت کی بات ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف نسبت کر کے کسی چیز کو بیان کرنا کتنا اہم ہے وہ ان کو معلوم ہی نہیں۔ اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس طرح بیان کر کے میں ثواب کما رہا ہوں، حالاں کہ اس طرح کر کے وہ حضور کی وعید اور ارشاد کے مطابق اپنے آپ کو جہنم کا حقدار بنا رہا ہے:-

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے  حاصلِ خواجہ بجز پندار نیست

جیسا معاملہ ہے۔ وہ یوں سمجھتا ہے کہ میں نیکی کر رہا ہوں، حالاں کہ وہ نیکی ہے ہی نہیں، صرف اس کی سمجھ ہے۔

بہر حال! امام نوویؒ نے یہ باب اسی لئے قائم کیا ہے کہ جو بات بھی آپ سنیں اس کو نقل کرنے کے معاملہ میں بہت زیادہ احتیاط اور پختگی کی ضرورت ہے، جب تک کسی حدیث کے متعلق پوری تحقیق نہ ہو جائے وہاں تک تو اس کو بیان نہ کیا جائے۔ حضراتِ محدثین تو اتنی زیادہ احتیاط برتتے ہیں کہ کسی حدیث کی سند اگر کمزور اور ضعیف ہو اور اس کو آپ بیان کریں تو یوں کہہ کر بیان کرنے کی اجازت ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے، ورنہ اس کی اجازت نہیں ہے۔

جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والا

۱۵۴۹:-وعن أسماء رَضِيَ اللهُ عنها: أَنَّ امْرأَةً قالت: يَا رسولَ الله، إِنَّ لِي ضَرَّةً فهل عَلَيَّ جُنَاحٌ إِنْ تَشَبَّعْتُ مِنْ زَوْجِي غَيْرَ الَّذِي يُعْطِينِي؟ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: ((المُتَشَبِّعُ بِمَا لَمْ يُعْطَ كَلاَبِسِ ثَوْبَيْ زُورٍ)). (متفق عَلَيْهِ)

((المُتَشَبِّعُ)): هُوَ الَّذِي يُظْهِرُ الشَّبَعَ وَلَيْسَ بِشَبْعَان. ومعناهُ هُنَا: أَنْ يُظْهِرَ أَنَّهُ حَصَلَ لَهُ فَضِيلَةٌ وَلَيْسَتْ حَاصِلَةً.

((وَلابِسُ ثَوْبَيْ زُورٍ)) أيْ: ذِي زُورٍ، وَهُوَ الَّذِي يُزَوِّرُ عَلَى النَّاسِ، بِأَنْ يَتَزَيَّى بِزِيِّ أَهْلِ الزُّهْدِ أَو العِلْمِ أَو الثَّرْوَةِ، لِيَغْتَرَّ بِهِ النَّاسُ وَلَيْسَ هُوَ بِتِلْكَ الصِّفَةِ. وَقِيلَ غَيرُ ذَلِكَ. واللهُ أَعْلَمُ.

ترجمہ:-حضرت اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک عورت نے نبیٔ کریم ﷺ سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! میری ایک سوکن ہے؛ تو کیا میرے اوپر اس بات میں کوئی گناہ ہے کہ میں اپنے شوہر کی طرف سے کسی ایسی چیز کے ملنے کا اظہار کروں جو مجھے اس کی طرف سے نہیں دی گئی ہے؟ نبیٔ کریم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: جس کو کوئی چیز کسی کی طرف سے نہ دی گئی ہو اور وہ یہ ظاہر کرے کہ یہ چیز مجھے فلاں کی طرف سے ملی ہے؛ تو وہ جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والے کی طرح ہے (یعنی جھوٹا ہے)

افادات:-''ضَرَّةٌ'' یعنی سوکن۔''ضَرَّ، يَضُرُّ'' کے معنیٰ نقصان پہنچانا۔ چوں کہ دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے ہی کی فکر میں لگی رہتی ہیں؛ اس لیے اس کو عربی زبان میں ''ضَرَّةٌ'' کہتے ہیں۔

مثلاً: اس نے کوئی سوٹ پہنا ہوا ہے جو وہ اپنے باپ کے گھر سے لائی ہے، لیکن اپنی سوکن کو کہتی ہے کہ یہ سوٹ ہمارے میاں صاحب نے ہم کو خرید کر دیا ہے۔ یا

بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کوئی زیور اس کو میکے سے ملا ہے، لیکن وہ اپنی سوکن کے سامنے یوں ظاہر کرتی ہے کہ یہ زیور مجھے سسرال والوں نے، یا شوہر نے بنا کر دیا ہے۔ اور ایسا اس لیے کہتی ہے تاکہ وہ یوں سمجھے کہ اس کو لا کر دیا اور مجھے نہیں دیا! اور اس کی وجہ سے وہ جل بھن کر تکلیف میں پڑ جائے اور پریشان ہو۔

''جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والے کی طرح ہے'' مطلب یہ کہ آدمی عام طور پر دو ہی کپڑے پہنتا ہے؛ کرتہ یا قمیص اور پائجامہ یا لنگی، اور دو کپڑوں ہی سے آدمی کا پورا بدن ڈھنپا ہوا ہوتا ہے۔ تو گویا ایسا کہنے والا سر سے لے کر پاؤں تک جھوٹ میں ڈھنپا ہوا اور ڈوبا ہوا ہے۔

جو وصف اپنے اندر نہ ہو؛ اس کی بناوٹ نہ کرے

''اَلْمُتَشَبِّعُ'' عربی زبان کا لفظ ہے، جس کا مطلب یہ ہے ایک آدمی کا پیٹ بھرا ہوا نہیں ہے، اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو شکم سیر ظاہر کر رہا ہے۔ یعنی مونچھ پر تیل لگا کر آیا اور کہتا کہ ابھی بریانی کھا کر آرہا ہوں، حالاں کہ گھر میں فاقے ہو رہے ہیں اور پیٹ کے اندر تو چوہے قلابازیاں کھا رہے ہیں۔ یہاں مطلب یہ ہے کہ کسی کو مادّی چیزوں میں سے یا معنوی چیزوں میں سے کوئی چیز ملی نہیں ہے، کوئی وصف اور کمال و خوبی اس کے اندر نہیں ہے لیکن وہ اپنے آپ کو ایسا ظاہر کرتا ہے کہ میرے اندر یہ خوبی و کمال اور وصف ہے، مثلاً: کوئی آدمی صوفی اور زاہد نہیں ہے، پھر بھی صوفیوں اور زاہدوں جیسا لباس پہن کر لوگوں کو گویا یہ جتلانا چاہتا ہے کہ میں زاہد اور صوفی ہوں۔ یا کوئی آدمی عالم نہیں ہے لیکن علماء جیسا لباس پہن کر لوگوں میں چلتا ہے، گویا اپنے لباس سے یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ میں بھی صاحبِ علم ہوں۔ یہ سب اسی وعید کا مصداق ہیں۔

پہلے زمانہ میں عمامہ پہننے کا عمومی رواج تھا لیکن الگ الگ طبقہ کے لیے الگ الگ رنگ ہوا کرتے تھے، مثلاً: علماء فلاں رنگ کا عمامہ ہی پہنتے تھے، اور عوام فلاں رنگ کا عمامہ ہی پہنتے تھے، تو جس رنگ کا عمامہ اہلِ علم پہنتے، اسی رنگ کا عمامہ اگر کوئی عام آدمی - جو اہل علم میں سے نہیں - پہن لے؛ تو اس کو فتاویٰ عالمگیری میں منع لکھا ہے۔ اس لیے کہ گویا وہ اس رنگ کا عمامہ پہن کر اپنے آپ کو عالم ظاہر کر رہا ہے اور حقیقت میں وہ عالم نہیں ہے۔

جیسے کوئی آدمی فوجیوں جیسا لباس پہن کر آئے حالاں کہ وہ فوجی نہیں؛ تو حکومت کی نگاہ میں ایسا آدمی مجرم شمار ہوگا یا نہیں؟ اسی طرح کوئی آدمی پولس جیسی وردی پہن کر آئے، حالاں کہ وہ پولس کا آدمی نہیں ہے؛ تو اس کو دھوکہ دہی میں شمار کیا جاتا ہے، اگر چہ وہ زبان سے نہیں کہتا کہ میں پولس مین ہوں۔ اس لیے کہ گویا اس وردی کو پہن کر وہ لوگوں کے سامنے یوں ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ میں پولس کا آدمی ہوں اور پولس کے آدمی جو انداز اختیار کرتے ہیں وہی انداز اختیار کر کے لوگوں کو دھوکہ دے رہا ہے۔ اسی طرح کوئی آدمی مولوی نہیں ہے لیکن اپنے نام کے ساتھ مولانا لکھتا ہے۔ کوئی آدمی پروفیسر نہیں ہے، لیکن اپنے نام کے ساتھ پروفیسر لکھتا ہے۔ کوئی آدمی سید نہیں ہے لیکن اپنے نام کے ساتھ سید لکھتا ہے۔

ایک وضاحت

یہاں ایک بات کی وضاحت کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں جن کی ماں سادات میں سے ہوتی ہے، لیکن باپ سادات میں سے نہیں ہوتا؛ تو ایسے لوگ سید نہیں کہلائیں گے، اس لیے کہ نسب تو باپ کی طرف سے چلتا ہے۔

ہاں! جس کا باپ سادات میں سے ہو، چاہے ماں سادات میں سے نہ ہو؛ تو وہ سید کہلائے گا۔ اب بعض لوگ اس بنیاد پر اپنے آپ کو سید لکھتے ہیں کہ ماں سادات میں سے ہوتی ہے؛ تو یہ دُرست نہیں ہے۔

یا کوئی آدمی امراء جیسا لباس پہنتا ہے، گویا اپنے لباس سے یوں ظاہر کرتا ہے کہ میں بھی اہلِ ثروت کے طبقے سے تعلق رکھتا ہوں، حالاں کہ اس طبقہ میں سے نہیں ہے؛ تو یہ بھی دھوکہ ہے۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ جھوٹ صرف زبان سے ہی نہیں بولا جاتا، بلکہ اپنے عمل، اپنے لباس اور اپنے ظاہری رکھ رکھاؤ سے بھی بولا جاتا ہے جس کی یہ سب شکلیں ہیں اور اس کو بھی گناہ قرار دیا ہے اور اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سخت وعید ارشاد فرمائی ہے۔

باب بيان غلظ تحريم شهادة الزور

جھوٹی گواہی کی سخت حرمت کا بیان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَالَ اللہ تَعَالَى: ﴿وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ.﴾ (الحج: ٣٠)

وقال تَعَالَى: ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ.﴾ (الإسراء: ٣٦)

وقال تَعَالَى: ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ (ق: ١٨)

وقال تَعَالَى: ﴿إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ﴾ (الفجر: ١٦)

وقال تَعَالَى: ﴿وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ﴾ (الفرقان: ٧٢)

چوں کہ زبان سے ہونے والے گناہوں کا تذکرہ چل رہا ہے، اسی میں جھوٹ کا بیان آیا، تو ایک تو جھوٹ ہے اور دوسری جھوٹی گواہی ہے جو جھوٹ کے مقابلہ میں اور زیادہ خطرناک ہے۔ اس لئے علامہ نوویؒ نے اس کو مستقل عنوان قائم کر کے ذکر کیا ہے: ”جھوٹی گواہی کی سخت حرمت کا بیان“۔

ویسے جھوٹ خود بھی ایک کبیرہ گناہ ہے لیکن اگر گواہی کے اندر جھوٹ کا ارتکاب کیا جائے تو اور زیادہ سخت گناہ ہے۔ آج کل تو محاورہ ہے ”میاں! سچ سچ بولو؛ مگر کچہری میں نہیں“۔ کچہری میں بیان دے رہے ہیں تو جھوٹ بولنے کی اجازت ہے حالاں کہ گواہی میں جھوٹا بیان دینا عام حالات میں جھوٹ بولنے کے مقابلہ میں اور زیادہ خطرناک ہے۔

آیاتِ قرآنیہ

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَاجۡتَنِبوا قَوۡلَ الزُّورِ﴾ جھوٹی بات سے بچو۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَقۡفُ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهِۦ عِلۡمٌ﴾ اور اس چیز کے درپے نہ ہو (یا ایسی چیز نہ کہو) جس کا تمہیں علم نہ ہو۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿مَا يَلۡفِظُ مِن قَوۡلٍ إِلَّا لَدَيۡهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ یہ آیت اوپر بھی گذری کہ جو بات بھی تم کہتے ہو اس پر باری تعالیٰ کی طرف سے بڑا چوکس محافظ اور نگران مقرر ہے۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّ رَبَّكَ لَبِالۡمِرۡصَادِ﴾ اللہ تعالیٰ بندوں کے اعمال کی تاک میں لگے ہوئے ہیں۔ یعنی بندے جو اعمال کرتے ہیں اللہ تعالیٰ برابر اس کو دیکھتے ہیں۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَالَّذِينَ لَا يَشۡهَدُونَ الزُّورَ﴾ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کی خوبیاں اور اوصاف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں وہ ایسے لوگ ہیں جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔

بڑے گناہوں میں بھی بڑے گناہ

۱۵۵۰:۔وعن أَبِي بَكۡرَةَ رضی الله عنه قَالَ: قَالَ رسُولُ الله ﷺ: ((أَلَا أُنَبِّئُكُمۡ بِأَكۡبَرِ الكَبَائِرِ؟)) قُلۡنَا: بَلَى يَا رسولَ اللهِ. قَالَ: ((الإِشۡرَاكُ بِاللهِ، وعُقُوقُ الوَالِدَيۡنِ)) وكَانَ مُتَّكِئاً فَجَلَسَ، فَقَالَ: ((أَلَا وَقولُ الزُّورِ)) فَمَا زَالَ يُكَرِّرُهَا حَتَّى قلنا: لَيۡتَهُ سَكَتَ. (متفق عَلَيۡهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوبکرہؓ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں تم کو بڑے گناہوں میں بھی جو بڑے گناہ ہیں؛ وہ نہ بتاؤں؟ ہم نے عرض کیا: کیوں نہیں؛ اے اللہ کے رسول! آپ ضرور بتلائیے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، اور ماں باپ کی نافرمانی۔ حضرت ابوبکرہؓ فرماتے ہیں کہ پہلی دو باتیں جب آپ ﷺ نے ارشاد فرمائیں اس وقت آپ تکیہ سے ٹیک لگائے ہوئے تھے لیکن پھر آپ نے ٹیک چھوڑ دیا اور سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا: سنو! اور جھوٹی بات (جھوٹی گواہی، جھوٹ بات) آپ اپنے اس ارشاد کو بار بار دہراتے رہے یہاں تک کہ ہم لوگ اپنے جی میں یوں کہنے لگے: کاش! حضور خاموش ہو جائیں۔

افادات: -سب سے بڑا گناہ تو شرک ہے، قرآنِ پاک میں بھی کہا گیا ہے: ﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾ شرک بہت بڑا گناہ ہے، اور سارے گناہوں کو اللہ تعالیٰ اگر چاہیں گے تو معاف کر دیں گے، لیکن شرک کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں کریں گے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے اس کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں کریں گے، اس کے علاوہ دوسرے گناہوں کی معافی اللہ تعالیٰ کی مشیت پر ہے، اگر چاہیں تو معاف کر دیں اور اگر چاہیں تو سزا دیں۔

اولاد کو جائز کام کا حکم کیسے دیں؟

اگر ماں باپ کسی جائز کام کو کرنے کے لئے کہیں بشرطیکہ وہ شریعت کی حدود میں رہ کر ہی ہو، تو ماں باپ کے کہنے کی وجہ سے وہ جائز کام واجب کا درجہ اختیار کر لیتا ہے اور اس پر عمل کرنا ضروری ہو جاتا ہے (اس سلسلے میں پہلے بھی بیان آچکا ہے اور تفصیل بتا چکا ہوں) حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اسی لئے علماء نے لکھا

ہے کہ باپ جب بیٹے کو کوئی کام کرنے کے لئے کہے اور وہ کام جائز امور کے قبیل سے ہو تو یہ نہ کہے کہ ''یوں کرو''۔ اس لئے کہ اگر اس کے جواب میں وہ نہیں کرے گا تو گنہگار ہوگا اس لئے کہ اس صورت میں ایک واجب پر عمل نہیں کیا، بلکہ باپ کو چاہیے کہ یوں کہے کہ اگر ایسا کرلو تو اچھا ہے، اور بیٹے کو بھی چاہیے کہ سمجھ جائے کہ باپ کی تمنا اور خواہش یہ ہے کہ یہ کام کیا جائے، اور ان الفاظ کو اس لیے استعمال کر رہے ہیں تا کہ نہ کرنے کی صورت میں مَیں گنہگار نہ بنوں۔ علماء نے شریعت پر عمل کے معاملہ میں اتنی ساری احتیاطیں سکھلائی ہیں۔ آج کل تو حال یہ ہوگیا ہے کہ باپ کسی کام کے لیے تاکید کر کے کہتا ہے تب بھی بیٹا ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

محبت کا تقاضہ

''لَیْتَهُ سَکَتَ'' کاش! آپ خاموش ہوجائیں۔ اس میں جو تمنا کی گئی ہے وہ اس لئے کہ صحابۂ کرام کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جو محبت تھی اس کی وجہ سے صحابہ نے محسوس کیا کہ اس طرح بار بار اپنی بات کو دہرانے کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تکلیف ہورہی ہے، اور چوں کہ آپ کا مقصد اس گناہ کی شناعت وقباحت اور برائی ہمارے ذہنوں میں بٹھانا تھا، وہ مقصد تو حاصل ہو چکا ہے، اس لیے اب آپ خاموش ہوجائیں تو اچھا ہے۔ جیسے کوئی آدمی کسی کو دھمکا رہا ہو، کسی بات کی تاکید کر رہا ہو، تو وہ زور زور سے بول رہا ہو، اور آپ کو اس کے ساتھ محبت ہو اس کی وجہ سے آپ اس سے یوں کہیں کہ بھائی! آپ کا مقصد مجھے تاکید کرنا تھا اور وہ تو حاصل ہو چکا ہے، آپ کی اس تکلیف سے ہمیں تکلیف ہورہی ہے، اس لیے اب آپ خاموش ہوجائیں تا کہ آپ کو زحمت نہ ہو۔

باب تحریم لعن انسان بعینه اودابة

کسی متعین شخص یا جانور پر لعنت بھیجنا حرام ہے

بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ ہر وقت ان کی زبان سے لعنت، لعن طعن اور پھٹکار ہی کے الفاظ نکلتے ہیں کہ تیرا یوں ہو جائے اور تو اللہ کی رحمت سے دور رہے۔ لعنت کا مطلب ہے کسی کے لئے اللہ کی رحمت سے دور ہونے کی بددعا کرنا، چوں کہ یہ بھی زبان کے گناہوں میں سے ہے، اس لیے اس کو اس باب میں بتلانا چاہتے ہیں۔

کسی پر لعنت کرنا اس کو قتل کرنے جیسا ہی ہے

۱۵۵۱:- عن أَبی زیدٍ ثابت بن الضَّحَّاك الأنصاریّ- رضی الله عنه- وَهُوَ من أهلِ بَيْعَةِ الرِّضْوَانِ، قَالَ: قَالَ رسُولُ الله ﷺ: ((مَنْ حَلَفَ عَلَى يَمِينٍ بِمِلَّةٍ غَيْرِ الإِسْلاَمِ كاذِباً مُتَعَمِّداً، فَهُوَ كَما قَالَ. وَمَنْ قَتَلَ نَفْسَهُ بِشَيءٍ، عُذِّبَ بِهِ يَومَ القِيَامَةِ، وَلَيْسَ عَلَى رَجُلٍ نَذْرٌ فيما لا يَمْلِكُهُ، وَلَعْنُ المُؤْمِنِ كَقَتْلِهِ)).

(متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو زید ثابت بن ضحاک انصاریؓ نقل کرتے ہیں- جو بیعت رضوان والوں میں سے ہیں- کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس آدمی نے اسلام کے علاوہ دوسرے مذہب کے متعلق جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھائی؛ تو وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ اس نے کہا۔ اور جس آدمی نے اپنے آپ کو کسی چیز کے ذریعہ سے قتل کیا (یعنی خودکشی کی، جیسے: چاقو لے کر اپنے سینے میں گھونپ دیا، یا زہر پی لیا، یا اپنے آپ کو آگ میں ڈال دیا، یا اپنے آپ کو

کسی اونچی جگہ سے نیچے گرادیا) تو قیامت کے دن اس کو یہی عذاب دیا جائے گا (بلکہ عالمِ برزخ میں قبر کے اندر بھی اس کو یہی عذاب ہوگا کہ وہ چاقو ہاتھ میں لے گا اور گھونپے گا، پھر چاقو ہاتھ میں لے گا پھر گھونپے گا، اور اسی طرح کرتا رہے گا، ہمیشہ اس کو یہی عذاب دیا جاتا رہے گا) اور جو آدمی کسی چیز کا مالک نہ ہو، تو اس کی نذر اس کے اوپر نہیں ہے۔ اور کسی مؤمن پر لعنت کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ اس کو قتل کرنا۔

اہلِ بیعتِ رضوان کی وجہ تسمیہ

افادات:۔ پہلے بھی آچکا ہے کہ ۶ ھ میں صلح حدیبیہ کے موقعہ پر نبیٔ کریم ﷺ عمرہ کے ارادہ سے صحابۂ کرام کی جماعت کے ساتھ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے لیکن مکہ والوں نے آپ کو عمرہ کرنے نہیں دیا اور روک دیا، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اشارہ دیا گیا، اسی بنیاد پر حضور اکرم ﷺ نے مکہ والوں سے صلح کرلی، اس موقعہ پر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ نبیٔ کریم ﷺ نے اپنا پیغام مکہ والوں تک پہنچانے کے لئے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو مکہ بھیجا کہ ہم لڑنے کے واسطے نہیں آئے ہیں، ہم تو بیت اللہ کی زیارت کے لئے آئے ہیں، ہم کو بیت اللہ کی زیارت کرنے کا موقعہ دے دیا جائے، زیارت سے فارغ ہوکر ہم واپس چلے جائیں گے۔ جب آپ ﷺ کا یہ پیغام مکہ والوں تک پہنچانے کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تشریف لے گئے تو ان کے خاندان بنوامیہ کو معلوم ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کوئی خاص پیغام لے کر آرہے ہیں، اور چوں کہ یہ ان کے خاندان ہی کے آدمی تھے، اس لئے ان کی حمایت اور تائید کے لئے ان کے خاندان والے مکہ سے باہر ان کے استقبال کے لئے آئے اور ان سے کہا کہ آپ جس مشن کے لیے آئے ہیں، وہ پورا کیجئے، ہم سب آپ کی حفاظت کریں گے، کوئی شخص آپ کا بال

بھی بیکا نہیں کرسکتا۔ چناں چہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیغام مکہ کے سرداروں تک پہنچایا۔ اور چوں کہ ابھی تک وہ احرام کی حالت ہی میں تھے، اس لیے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ صحابۂ کرام کی جو جماعت آئی تھی ان میں یہ بھی تھے اور سبھی حضرات عمرہ کے لئے آئے تھے تو ان کے خاندان والوں نے ان سے کہا: اب آپ تو یہاں آ ہی گئے ہیں؛ لہٰذا آپ عمرہ کر لیجئے، آپ کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا: یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تو وہاں روکا گیا ہے، اور عثمان یہاں عمرہ کر لے؟ میں اکیلا عمرہ نہیں کروں گا۔ یہ جواب ان کے خاندان والوں کو بڑا گراں گزرا کہ ہم نے تو ان کی اتنی حمایت کی کہ جس کام اور مشن کو لے کر آئے تھے اس کو پورا کرنے کے لئے قربانی دی کہ ان کا استقبال کیا، ان کو اپنے ساتھ لے کر آئے، مکہ والوں کو بھی الٹی میٹم دے دیا کہ ان کا کوئی بال بیکا نہیں کرسکتا، اور اب ہم اپنی طرف سے یہ پیشکش کر رہے ہیں، اس پر بھی عمل کرنے کے لئے یہ تیار نہیں؟ اب بھی وہ اُنہیں کے گُن گا رہے ہیں؟ اور پھر ان کے خاندان والوں نے یہ کہہ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مکہ ہی میں روک لیا کہ ہم ابھی تم کو واپس جانے نہیں دیں گے۔ جب ان کی واپسی میں دیر ہوئی تو جہاں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیام پذیر تھے وہاں یہ مشہور ہوگیا کہ نعوذ باللہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قتل کر دیئے گئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب معلوم ہوا کہ حضرت عثمان قتل کر دیئے گئے تو حضور کو یہ بات بڑی ناگوار گزری کہ ہم نے اپنے ایک آدمی کو اپنا خصوصی پیغام لے کر وہاں بھیجا اور ان لوگوں نے ان کو قتل کر دیا۔ اس موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام صحابہ سے ایک بیعت لی کہ چاہے ہم جان دیدیں گے لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا بدلہ ضرور لیں گے۔ تمام ہی صحابہ نے اس بات پر بیعت کی۔

آپ ﷺ نے کیکر کے ایک درخت نیچے بیٹھ کر صحابہ کرامؓ سے یہ بیعت لی تھی اور اس بیعت پر قرآنِ پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ان صحابہ کو یہ بشارت سنائی گئی: ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ اللہ تعالیٰ ان ایمان والوں سے خوش اور راضی ہو گیا جب وہ آپ کے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیٹھ کر بیعت کر رہے تھے۔ گویا اس بیعت پر صحابۂ کرامؓ کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا سرٹیفکیٹ مل گیا (''رضوان'' یعنی خوشنودی) اس لیے اس بیعت کا نام ''بیعتِ رضوان'' ہے۔

صحابۂ کرام میں دو جماعتیں ہیں، ایک جماعت اصحابِ بدر کی ہے جن کا مقام سب سے اونچا ہے، ان کے بعد اصحابِ بیعتِ رضوان ہیں۔ اگر کوئی صحابی بدریین میں سے ہوتا ہے تو چوں کہ یہ فضیلت کی چیز ہے، اس لیے عام طور پر روایتوں میں ان کے نام کے ساتھ اہلِ بدر لکھا جاتا ہے، اور کوئی صحابی اگر اہلِ بیعتِ رضوان میں سے ہے تو روایتوں میں ان کا نام کے ساتھ ''اہلِ بیعتِ رضوان'' ضرور لگایا جاتا ہے؛ تاکہ ان کی فضیلت اور اہمیت کا اندازہ ہو۔ اس روایت کے راوی حضرت ابوزید ثابت بن ضحاک انصاریؓ ہیں ان کے نام کے ساتھ یہی آیا ہے کہ وہ بیعتِ رضوان والوں میں سے ہیں۔

جملہ کی تفصیل اور مسئلہ کا فرق

''تو وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ اس نے کہا'' اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ ایسا بول دیتے ہیں کہ اگر میں فلاں کام کرلوں؛ تو میں یہودی ہو جاؤں، یا نصرانی ہو جاؤں، یا ہندو بن جاؤں۔ یا کہہ دیتے ہیں کہ اگر میں نے ایسا کیا ہو، تو میں یہودی، یا نصرانی ہوں؛ تو اس کا مسئلہ کیا ہے؟ یعنی اگر وہ جانتا ہے کہ اُس نے وہ کام کیا ہے، اس کے

باوجود ایسا بول رہا ہے، تو ایسا کرنے کی وجہ سے وہ اسلام سے نکل جائے گا یا نہیں؟ اس روایت میں تو حضور اکرم ﷺ نے جو فرمایا کہ ''وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ اس نے کہا'' اس بارے میں علماء نے تفصیل لکھی ہے۔

دیکھو! آدمی اسلام سے اس وقت تک نہیں نکلتا جب تک اسلام اور ایمان کے خلاف اپنی زبان سے کوئی بات نہ نکالے، یا کوئی کام جو اسلام اور ایمان کے خلاف ہو؛ وہ نہ کرلے۔ صرف اتنا بول دینا کہ ''اگر میں نے یہ کام کیا ہو تو میں یہودی ہوں'' یہ چیز اسلام سے نکالنے والی نہیں ہے۔ اس لیے اگر وہ یہ جانتا ہے کہ محض ایسا بولنے کی وجہ سے آدمی یہودی یا نصرانی نہیں بن جاتا، اور پھر ایسا بول رہا ہے تو اس صورت میں وہ اسلام سے نہیں نکلے گا۔ لیکن اگر وہ یہ مسئلہ نہیں جانتا، بلکہ وہ یہی سمجھتا ہے کہ اگر میں ایسا بولوں گا تو اسلام سے نکل جاؤں گا اور پھر ایسا بول رہا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اسلام کو چھوڑ کر کفر پر راضی ہے، اور کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے۔ اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ اس صورت میں تو صرف ایسا بول دینے ہی سے وہ کافر ہو گیا۔ مثلاً: کوئی آدمی شراب کا عادی ہے، اور اس نے اپنے آپ کو شراب سے بچانے کے لئے بہت کوشش کی، لیکن نہیں چھوٹتی، تو وہ یوں کہتا ہے کہ اگر آئندہ میں شراب پیوں؛ تو میں یہودی یا نصرانی ہو جاؤں۔ اب ایسا کہنے کے بعد بھی اگر وہ یہ سمجھ کر شراب پی رہا ہے کہ شراب پینا کبیرہ گناہ تو ہے، لیکن شراب پینے کی وجہ سے آدمی یہودی نہیں بن جاتا، اور میرے ایسا کہنے کی وجہ سے کچھ نہیں ہوتا، تو وہ بڑے گناہ کا کام تو کر رہا ہے، لیکن ایسا کہنے کی وجہ سے وہ یہودی نہیں بنے گا۔

اور اگر وہ یہی سمجھتا ہے کہ میں نے چوں کہ ایسا کہہ دیا ہے، اس لیے اب اگر

میں شراب پیوں گا تو میں یہودی یا نصرانی بن جاؤں گا، اور یہ سمجھتے ہوئے بھی وہ شراب پیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنے آپ کے یہودی بننے پر راضی ہے؛ تو اس صورت میں وہ کفر پر راضی ہو گیا ہے، اور اس کی وجہ سے ایمان سے نکل گیا۔ دونوں کا فرق سمجھ میں آ گیا؟

میں نے یہ تفصیل اس لیے بیان کر دی تا کہ دونوں صورتوں میں جو فرق ہے اس کے سمجھنے میں کسی سے کوئی غلط فہمی نہ ہو جائے۔

جس چیز کا مالک نہیں، اس کی نذر لازم نہیں

''اور جو آدمی کسی چیز کا مالک نہ ہو تو اس کی نذر اس کے اوپر نہیں ہے'' مثلاً: زید کسی غلام کا مالک ہے، اب وہ یوں کہے کہ میرا بیٹا اگر تندرست ہو جائے تو میرا فلاں غلام آزاد ہے، یا میرا فلاں باغ صدقہ کر دوں گا۔ تو جب اس کا بیٹا تندرست ہو جائے گا تو وہ نذر پوری کرنا اس کے اوپر لازم ہے۔ لیکن اگر وہ غلام اس کی ملکیت نہیں ہے بلکہ کسی دوسرے کا ہے، یا وہ باغ تو محمد کا ہے، اور اس کے متعلق نذر مانتا ہے کہ اگر میرا بیٹا تندرست ہو جائے گا تو فلاں کا غلام آزاد ہے، یا محمد کا باغ صدقہ کروں گا؛ تو وہ نذر پوری کرنا اس پر لازم نہیں۔

''اور کسی مؤمن کے اوپر لعنت کرنا ایسا ہے جیسا اس کو قتل کرنا'' کسی خاص آدمی کے اوپر لعنت بھیجنا، اور اس کے لئے اللہ کی رحمت سے دور ہونے کی بددعا کرنا قتل سے کیا کم ہے؟ اور کسی مؤمن کو قتل کرنا حرام ہے اسی طرح لعنت بھیجنا بھی حرام ہے۔ بس! یہاں یہ روایت اسی حصہ کی وجہ سے لائے ہیں۔

کثرت سے لعنت کرنے والا صدیق نہیں ہوسکتا

۱۵۵۲:-وعن أَبي هريرة- رضي الله عنه- : أَنَّ رسُولَ الله ﷺ قَالَ : ((لاَيَنْبَغِي لِصِدِّيقٍ أنْ يَكُونَ لَعَّاناً)). (رواه مسلم)

ترجمہ:-حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ کا ارشاد ہے: صدیق کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ بہت زیادہ لعنت کرنے والا ہو۔

افادات:-دراصل ہوا یہ تھا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کا ایک غلام تھا اس سے حضرت ابو بکر صدیقؓ کسی وجہ سے ناراض ہو گئے، اور اس پر لعنت کے الفاظ کہے، اس پر حضور اکرم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ صدیق کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ لعنت کرنے والا ہو۔ (''لَعَّان'' یعنی کثرت سے لعنت کرنے والا) جب حضرت ابو بکرؓ نے یہ سنا تو فوراً اس غلام کو آزاد کر دیا اور حضور اکرم ﷺ کے پاس آ کر یہ عہد کیا کہ اب میں ایسا نہیں کروں گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس آدمی کی زبان پر کثرت سے لعنت کے الفاظ رہتے ہوں؛ تو یہ بات تو طے ہے کہ وہ صدیقیت کے مقام پر فائز نہیں ہوسکتا۔

نہ شفیع ہوں گے، نہ گواہ

۱۵۵۳:-وعن أَبي الدرداءِ-رضي الله عنه-قَالَ: قَالَ رسُولُ الله ﷺ: ((لاَيَكُونُ اللَّعَانُونَ شُفَعَاءَ، وَلاَ شُهَدَاءَ يَوْمَ القِيَامَةِ)). رواه مسلم.

ترجمہ:-حضرت ابو الدرداءؓ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: لعنت بھیجنے والے شفیع نہیں بنیں گے، اور نہ قیامت میں وہ گواہ ہوں گے۔

افادات:۔ ''شُفَعَآءَ'' کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کل قیامت میں ایمان والوں کو ان کے اعمالِ صالحہ کی وجہ سے دوسرے گنہگار ایمان والوں کے لئے شفاعت کی اجازت دیں گے۔ جیسے: ایک حافظ کو اس کے خاندان کے دس آدمیوں کے بارے میں اللہ تعالی کی طرف سے سفارش کی اجازت دی جائے گی۔ اسی طرح ایک نیک آدمی کو بھی اعمالِ صالحہ کی وجہ سے اس کے خاندان کے ماتحت اہل ایمان گنہگاروں کے حق میں شفاعت کرنے کی اجازت دی جائے گی۔ لیکن جو لوگ لعنت کرنے والے ہیں وہ قیامت کے روز شفعاء نہیں بن سکتے۔ اور بھلا اجازت کیسے دی جائے جب کہ دوسروں کے لئے وہ خود ہی اللہ کی رحمت سے دوری کی بددعا کرتا ہے؟ اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ جو اس طرح کے لوگ ہوتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے شہادت کی سعادت ہی نصیب نہیں ہوتی۔

اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ شہید بمعنٰی گواہ۔ یعنی قیامت کے روز ان کو گواہ نہیں بنایا جائے گا، اس لیے کہ لعنت کرنا بڑا گناہ ہے، اور لعنت کی وجہ سے وہ فاسق بن گیا، کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرنے سے آدمی فاسق بن جاتا ہے، اور فاسق کی گواہی قبول نہیں ہوتی۔ اس لیے ایسا آدمی جب دنیا کے اندر کسی کی گواہی دینے کے قابل نہیں رہتا، تو قیامت کے روز کیسے بن سکے گا!

اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ قیامت کے روز امتِ محمدیہ کے لوگ اگلی امتوں کے حق میں شہادت دیں گے، نبیوں کے حق میں شہادت دیں گے کہ ان نبیوں نے اللہ کا پیغام اپنے امتیوں تک پہنچایا۔ لیکن ان شہادت دینے والوں میں یہ لوگ نہیں ہوں گے جو دوسروں پر لعنت کرنے والے ہوں۔

ایک دوسرے پر لعنت نہ بھیجا کرو

۱۵۵۴:- وعن سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ رضی اللہ عنہ قال: قَالَ رسُولُ اللهِ ﷺ: ((لاَ تَلاَعَنُوا بِلَعْنَةِ اللهِ، وَلاَ بِغَضَبِهِ، وَلاَ بِالنَّارِ))

(رواہ أبو داود والترمذی، وقال: ((حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:- حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آپس میں ایک دوسرے پر اللہ کی لعنت نہ بھیجا کرو، اور نہ اللہ کے غضب اور پھٹکار کی، اور نہ جہنم کی بددعا کرو۔

افادات:- بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ بات بات میں کہتے رہتے ہیں کہ تم پر اللہ کی لعنت ہو، یا فلاں پر لعنت برسے، اور اللہ کی پھٹکار ہو، جہنم میں جائے وغیرہ وغیرہ؛ تو ان تینوں قسم کی بددعاؤں سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس طرح کسی کے لئے اللہ کی رحمت سے دور ہونے کی بددعا نہ کیا کرو۔

مؤمن ایسا نہیں ہوتا

۱۵۵۵:- وعن ابن مسعود- رضی اللہ عنہ- قَالَ: قَالَ رسُولُ الله ﷺ: ((لَيْسَ المُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ، وَلاَ اللَّعَّانِ، وَلاَ الفَاحِشِ، وَلاَ البَذِيِّ))

(رواہ الترمذی، وقال: ((حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مؤمن طعن وتشنیع کرنے اور عیب جوئی کرنے والا نہیں ہوتا، اور نہ ہی لعنت کرنے والا ہوتا ہے، اور نہ ہی فحش گو ہوا کرتا ہے، اور نہ ہی منھ پھٹ ہوتا ہے۔

افادات:- یعنی مؤمن کی شان یہ نہیں ہے کہ وہ کسی پر طعن وتشنیع کرے،

یہ طریقہ ایمان والوں کی شان کے منافی ہے، جو آدمی ایسا کرتا ہے وہ کامل ایمان والا نہیں ہے۔

یہ طرز زیادہ بگاڑنے کا ذریعہ

طعن وتشنیع بڑی خطرناک چیز ہے، اور اس کی وجہ سے سامنے والے کا دل بالکل ٹوٹ جاتا ہے، بلکہ آج کے زمانہ میں تو تجربہ یہ ہے کہ نئی نسل کے ساتھ اگر ایسا معاملہ کیا جاتا ہے تو وہ اپنے آپ کو سدھارنے کی بجائے ضد میں آ کر برائیوں پر اور زیادہ اڑ جاتے ہیں، اسی لیے اگر کوئی بچہ کسی برائی میں مبتلا ہو تو محبت وشفقت اور دل سوزی و ہمدردی سے اس کو سمجھایا جائے، لیکن طعن وتشنیع اور (Tonting) بالکل نہ کی جائے، یہ طرز اس کو سدھارنے کے بجائے اور زیادہ بگاڑنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے، اور قرآنِ پاک میں بھی ہے: ''وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ'' طعن وتشنیع کرنے والوں کے لئے ہلاکت ہے۔

بخاری شریف میں روایت ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر کسی کی باندی زنا کا ارتکاب کرے تو اس پر حد جاری کی جائے یعنی شریعت کی طرف سے جو سزا مقرر کی گئی ہے وہ سزا دی جائے، ''وَلَا يُثَرِّبْهَا'' لیکن اس کو عار نہ دلائی جائے۔ جب باندی تک کو اور وہ بھی ایسی باندی جو زنا جیسے شنیع وقبیح فعل اور حرکت کا ارتکاب کر رہی ہے، اس کے لئے بھی نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شریعت کی مقرر کی ہوئی سزا جاری کرنے کا حکم دے رہے ہیں، لیکن عار دلانے اور طعن وتشنیع کی اجازت نہیں دیتے؛ تو پھر اپنی اولاد اور اپنے ماتحتوں کو اس طرح طعن وتشنیع کرنا کتنا سخت ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، یہ طرز شریعت کی نگاہوں میں پسندیدہ نہیں ہے، اور اس کی اجازت بھی نہیں ہے۔ گویا

کامل ایمان کی شان یہ نہیں ہے۔ جو آدمی ایسا کرتا ہے وہ حقیقی معنیٰ میں مؤمن کہلانے کا حقدار نہیں ہے۔

پھر لعنت کی اجازت کی کیونکر دی جاسکتی ہے؟

''مؤمن لعنت کرنے والا نہیں ہوتا'' کسی کے بھی اوپر لعنت بھیجنا ایمان والے کی شان نہیں ہے۔ اب کس کس پر لعنت بھیجی جاسکتی ہے وہ آگے ایک باب قائم کر کے اس میں بیان کریں گے۔ لیکن کسی معین آدمی کے لئے لعنت کی اجازت نہیں ہے، یہاں تک اگر وہ کافر بھی ہو اور وہ سامنے ہو تب بھی اس کو معین کر کے نہ کہا جائے کہ تجھ پر اللہ کی لعنت ہے، اس لیے کہ اس کی موت کفر پر ہی آنے والی ہے اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی۔ ہوسکتا ہے کہ کل کو اللہ تعالیٰ اس کو ایمان کی توفیق نصیب فرمائے، ہاں! یوں کہا جاسکتا ہے کہ کافروں پر اللہ کی لعنت ہے۔

کسی بھی آدمی کے متعلق تحقیر کا جذبہ رکھنے اور اس کے مقابلہ میں اپنے آپ کو اچھا سمجھنے کی بھی شریعت اجازت نہیں دیتی، یہاں تک کہ کافر کے مقابلہ میں بھی تحقیر کا جذبہ رکھنے کی ممانعت ہے۔ یعنی فی الحال تو مؤمن اپنے آپ کو اچھا سمجھ سکتا ہے کہ اس وقت میں ایمان کی حالت میں ہوں اور یہ کفر کی حالت میں ہے، اور اس نعمت پر اللہ کا شکر بجالائے، لیکن آئندہ کیا حالات پیش آتے ہیں اور کیا تبدیلی پیش آسکتی ہے؛ اس کی کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی، اور ہم بھی اپنے خاتمہ کے متعلق گارنٹی سے کوئی بات نہیں کہہ سکتے، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ایمان کی توفیق عطا فرمائے۔ جب کسی کے مقابلہ میں اپنے آپ کو اچھا سمجھنے کی شریعت اجازت دیتی نہیں ہے، تو پھر لعنت کی اجازت کی کہاں دی جاسکتی ہے؟ اور بددعا بھی ایک طرح کی لعنت ہی ہے، لہٰذا اس سے بھی اپنے

آپ کو بچایا جائے۔

فحش گو اور منھ پھٹ نہیں ہوتا

فحش گو کا مطلب یہ ہے کہ اپنی زبان سے بے حیائی کی بات نکالنا۔ ایسی باتیں جو اپنی زبان سے نکالنے کو آدمی برا سمجھتا ہے، یہاں تک کہ اگر وہ بات سچی بھی ہے تب بھی اگر وہ بے حیائی کے بول ہیں تو اس کا اپنی زبان سے اظہار نہ کیا جائے۔ اور نہ ایمان والا منھ پھٹ ہوتا ہے۔ یہ ساری چیزیں جو بتلائی گئیں ہیں، ایمان والا ان چیزوں کا حامل نہیں ہوا کرتا، گویا مؤمن ان اوصاف اور برائیوں سے اپنے آپ کو بچاتا ہے۔

لعنت کے متعلق نہایت اہم مضمون

۱۵۵٦: -وعن أَبي الدرداء- رضي الله عنه- قَالَ: قَالَ رسُولُ الله ﷺ: ((إِنَّ العَبْدَ إِذَا لَعَنَ شَيْئاً، صَعدَتِ اللَّعْنَةُ إِلَى السَّماءِ، فَتُغْلَقُ أَبْوابُ السَّماءِ دُونَهَا، ثُمَّ تَهْبِطُ إِلَى الأَرْضِ، فَتُغْلَقُ أَبْوابُهَا دُونَها، ثُمَّ تَأْخُذُ يَميناً وَشِمالاً، فَإِذا لَمْ تَجِدْ مَسَاغاً رَجَعَتْ إِلَى الَّذِي لُعِنَ، فإِنْ كَانَ أَهلاً لِذلِكَ، وإِلاَّ رَجَعَتْ إِلَى قَائِلِهَا.)) (رواه أبو داود)

لعنت کے سلسلہ میں بڑی اہم روایت ہے جس کو امام ابوداؤدؒ نے اپنی سنن میں ذکر کیا ہے۔

ترجمہ: -حضرت ابوالدرداءؓ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بندہ جب کسی چیز پر لعنت بھیجتا ہے (چاہے وہ جاندار ہو، یا بے جان) تو وہ لعنت آسمان کی طرف چڑھتی ہے، آسمان کے دروازے اس کے لئے بند کر دیئے جاتے ہیں، پھر وہ لعنت زمین کی طرف واپس

اترتی ہے تو اب زمین کے دروازے بھی اس کے لئے بند کردیئے جاتے ہیں، اس کے بعد پھر وہ دائیں بائیں گھومتی پھرتی ہے (اِدھر اُدھر جاتی ہے، گویا اپنے لیے جگہ اور ٹھکانہ تلاش کرتی ہے) جب اس کو اپنے لیے کوئی ٹھکانہ نہیں ملتا تو جس چیز پر لعنت کی گئی تھی اس کی طرف جاتی ہے، اگر وہ (اپنی حرکتوں، گناہوں اور بدکاریوں کی وجہ سے) اس لعنت کا حقدار ہوتا ہے (جیسا کہ آگے ایک باب میں بتائیں گے کہ بعض گناہ ایسے ہیں جن پر حدیث پاک کے اندر لعنت آئی ہے تو اس نے بھی کوئی ایسا گناہ کیا ہے کہ جس کی وجہ سے قرآن وحدیث میں اس کے اوپر لعنت بھیجی گئی ہے) تب تو ٹھیک ہے، وہ لعنت اسی پر پڑ جاتی ہے، ورنہ وہ لعنت کہنے والے کی طرف لوٹ جاتی ہے۔

افادات:۔ کتنا خطرناک معاملہ ہے! اور بددعا بھی لعنت ہی کی ایک قسم ہے، اس لیے بددعا کے معاملہ میں بھی بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ بعض لوگ بہت زیادہ زودرنج ہوتے ہیں، ذرا ذرا سی اور معمولی معمولی باتوں پر لوگوں سے ناراض ہوجاتے ہیں، اور ان کے لئے اپنی زبان سے بددعا کے الفاظ نکال دیتے ہیں۔ اور بددعا کا بھی یہی حکم ہے کہ وہ آسمان کی طرف جاتی ہے تو آسمان کے دروازے بند کردیے جاتے ہیں، زمین پر اترتی ہے تو اس کے دروزے بھی بند کردیئے جاتے ہیں، دائیں بائیں جگہ تلاش کرتی ہے، جب جگہ نہیں ملتی تو جس کے لئے کی گئی ہے اس کے پاس جاتی ہے، اگر وہ واقعتاً حقدار ہوتا ہے تب تو ٹھیک ہے، ورنہ وہ لوٹ کر بددعا دینے والے کی طرف ہی واپس آتی ہے۔ لہٰذا بددعا کے معاملہ میں بھی بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

مثلاً: کسی کے ساتھ کوئی معاملہ پیش آیا، کسی نے تکلیف کی کوئی بات کہہ دی، کوئی آدمی غائبانہ آپ کو کوئی نقصان پہنچا گیا، کسی نے آپ کے خلاف کہیں کوئی شکایت

کردی جس سے آپ کو ضرر پہنچ سکتا ہے، اب آپ کسی کو متعین کر کے بددعا کے کلمات کہیں کہ فلاں کو ایسا ہو جائے؛ تو اس سے منع کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی یقین کے ساتھ یوں سمجھتا ہے کہ یہ شکایت فلاں نے ہی کی ہے، اب ساری دنیا اس سے کہتی ہے کہ اس نے تیری شکایت نہیں کی، لیکن وہ نہیں مانتا، اور اس کا نام لے کر اس کے لیے بددعا کرتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اس نے نہیں کی ہے۔ تو وہاں پر بھی یہی صورت پیش آئے گی۔

خود ہی بھگتنا پڑتا ہے

اسی لیے ہمارے حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے ''آپ بیتی'' میں لکھا ہے کہ اگر کسی نے آپ کے ساتھ واقعتاً حد سے زیادہ کوئی معاملہ کیا ہے تب بھی پہلی بات تو یہ ہے کہ بددعا مت کرو، اور کرنی ہی ہے تو کسی کا نام لے کر مت کرو۔ ہاں! یوں کہہ سکتے ہو کہ جس نے بھی میرے ساتھ ایسا کیا ہے اس کے ساتھ اللہ ایسا کرے۔ اس لیے کہ اگر وہی ہے جس کے متعلق آپ کا گمان ہے تب تو ٹھیک بات ہوگئی، ورنہ جو بھی ہوگا اس کو لگے گی۔ لیکن اگر آپ اپنے طور پر متعین کر دیں گے، اور حقیقت میں اس نے نہیں کیا ہوگا تو اس صورت میں یہ چیز خود اپنے آپ پر ہی پڑے گی۔

اسی لیے عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ ایسے لوگ جو اپنی زبانوں سے بددعا کے الفاظ نکالتے رہتے ہیں وہ ہمیشہ پریشان، ٹینشن اور تکلیفوں میں ہی پڑے رہتے ہیں، ان کی مصیبتوں کا کبھی خاتمہ ہی نہیں ہوتا، کیوں کہ جب بددعا دینے کی عادت ڈال رکھی ہے تو عام طور پر ان کی زبان سے دوسروں کے لئے ایسی ہی چیزیں نکلتی رہتی ہیں جو اس کے اہل نہیں ہوتے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود ہی اس کو بھگتنا پڑتا ہے۔

لعنت کی مثال گیند جیسی ہے

اس کو ہمارے حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ ایک مثال دے کر سمجھایا کرتے تھے اور یہ مثال دراصل علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی دی ہوئی ہے جو فیض الباری تقریر بخاری کے اندر موجود ہے۔ لعنت کی مثال تو گینداور بال جیسی ہے، اگر گیند کو آپ سامنے کسی چیز پر پھینکیں اور وہ جگہ نرم ہے یعنی اس لائق ہے کہ وہ اس گیند کو اپنے پاس کیچ کر سکتی ہے تب تو ٹھیک ہے، اور اگر وہ جگہ سخت ہے تو اس صورت میں وہ گیند جتنی قوت سے اس کی طرف پھینکی گئی تھی اتنی ہی قوت سے لوٹ کر پھینکنے والے کی طرف آئے گی۔ جیسے: آپ نے گیند سامنے پھینکی اور وہاں جالی ہے تو وہ اس گیند کو اپنے اندر کیچ کرلے گی اور گینداس میں پھنس کر رہ جائے گی، اسی طرح جس کے اوپر بددعا اور لعنت کی گئی ہے وہ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے اگر اس کا حق دار ہے تب تو اس پر پڑے گی۔ ورنہ اگر سامنے دیوار ہے تو دیوار میں تو اس گیند کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، تو اب جتنی قوت سے پھینکی گئی تھی اتنی ہی قوت سے پھینکنے والے کی طرف لوٹ کر آتی ہے۔ اسی طرح جس کے لئے بددعا یا لعنت کی گئی ہے، اگر وہ اپنی بدکرداری کی وجہ سے اس کا حق دار نہیں ہے، تو پھر وہ اس لعنت کرنے والے کی طرف اتنی ہی قوت کے ساتھ لوٹ کر آتی ہے۔ اس حدیثِ پاک کے اندر اس کی صراحت موجود ہے، اس لیے اصل تو یہی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو ایسی چیزوں سے بچائے۔

لعنت کی ہوئی چیز سے بچنے کا اہتمام

۱۵۵۷:-وعن عمران بن الحُصَينِ رضی اللہ عنہما، قَالَ: بَيْنَمَا رَسُولُ

اللهِ ﷺ فِی بَعْضِ أَسْفَارِهٖ، وَامْرَأَةٌ مِنَ الأَنْصَارِ عَلَى نَاقَةٍ، فَضَجِرَتْ فَلَعَنَتْهَا، فَسَمِعَ ذٰلِكَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فَقَالَ: ((خُذُوا مَا عَلَيْهَا، وَدَعُوهَا، فَإِنَّهَا مَلْعُونَةٌ)) قَالَ عِمْرَانُ: فَكَأَنِّي أَرَاهَا الآنَ تَمْشِي فِی النَّاسِ مَا يَعْرِضُ لَهَا أَحَدٌ. (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح: حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنے کسی سفر میں تھے، اس میں ایک انصاری عورت بھی اپنی ایک اونٹنی پر سوار تھی جس سے وہ تنگ آگئی تھی (کبھی سواری کا جانور اَڑ جاتا ہے، شرارت پر اتر آتا ہے، اور اس کو ٹھیک کرنے سے مالک عاجز اور بے بس ہو جاتا ہے، اس کو ٹھیک کرنے کی ساری تدبیریں کر گزرتا ہے لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوتی، تو تنگ آجاتا ہے اور اس کی زبان سے گالیاں اور بد دعائیں نکلتی ہیں۔ یہاں پر بھی یہی ہوا کہ وہ اونٹنی اَڑ گئی ہوگی اور ساری تدبیر کرنے کے باوجود بھی قابو میں آئی نہیں ہوگی تو وہ عورت تنگ آگئی) اور اس عورت نے اس کے لئے لعنت کے الفاظ کہے (اب وہ تو ایک جانور تھا) جب حضور ﷺ نے اس کے یہ الفاظ سنے کہ اس اونٹنی پر لعنت کی گئی ہے تو ارشاد فرمایا: اس اونٹنی پر جو سامان (کجاوہ وغیرہ لادا ہوا ہے) وہ سب اُتار لو، اور اس اونٹنی کو چھوڑ دو، اس لیے کہ وہ لعنت کی گئی ہے (گویا حضور اکرم ﷺ نے اس بات کو پسند نہیں کیا کہ ایسی اونٹنی قافلہ میں آپ کے ساتھ رہے) حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بعد میں مَیں نے دیکھا کہ وہ اونٹنی لوگوں کے درمیان چلتی تھی، لیکن کوئی اس کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔

۱۵۵۸:- وعن أَبِي بَرْزَةَ نَضْلَةَ بْنِ عُبَيْدٍ الأَسْلَمِيِّ - رضی اللہ عنہ - قَالَ: بَيْنَمَا جَارِيَةٌ عَلَى نَاقَةٍ عَلَيْهَا بَعْضُ مَتَاعِ الْقَوْمِ، إِذْ بَصُرَتْ بِالنَّبِيِّ ﷺ وَتَضَايَقَ بِهِمُ الْجَبَلُ فَقَالَتْ: حَلْ! اللَّهُمَّ الْعَنْهَا. فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ:

((لَا تُصَاحِبْنَا نَاقَةٌ، عَلَيْهَا لَعْنَةٌ.)) (رواہ مسلم)

قَوْله: ((حَلْ)) بفتح الحاء المهملة وَإسكانِ اللاَّم: وَهِيَ كَلِمَةٌ لِزَجْرِ الإِبِلِ.

ترجمہ:- یہی واقعہ دوسرے ایک صحابی حضرت ابو برزہ اسلمیؓ سے بھی منقول ہے کہ ایک نوجوان عورت اپنی اونٹنی کے اوپر سوار تھی، اور اس اونٹنی پر لوگوں کا کچھ سامان بھی تھا اچانک اس عورت کی نگاہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پڑی اور پہاڑی راستہ ان کے لئے تنگ پڑ گیا۔ تو اس عورت نے اونٹنی کو بھگانے کے لئے کہا: ''حَلْ''! اے اللہ! اس پر لعنت بھیج۔ یہ سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہمارے ساتھ قافلہ میں ایسی اونٹنی نہیں رہنی چاہئے جس پر لعنت کی گئی ہو۔

افادات:- سفر کے دوران کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پورا لشکر اور قافلہ میدان میں چل رہا ہوتا ہے تب تو ہر ایک کے لئے چلنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے، ہر آدمی اپنے اپنے طور پر سہولت کے ساتھ چلتا ہے، لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میدان ختم ہو کر پہاڑی یا کوئی تنگ راستہ آجاتا ہے، اور تنگ راستہ جب کھلی جگہ کے بعد آتا ہے تو مجمع میں سے ہر آدمی یہ کوشش کرتا ہے کہ میں پہلے وہاں سے نکلوں۔ یہاں بھی یہی صورت پیش آئی کہ ایک پہاڑی تنگ راستہ سامنے آگیا، اور اس تنگ راستہ پر سے گزرنے کے لئے جلدی میں اس عورت نے اپنی اونٹنی کو وہاں ڈالنے کی کوشش کی، لیکن وہ اونٹنی جلدی سے اُدھر نہیں گئی، اس کی وجہ سے وہاں تنگی پیدا ہوگئی، تو اس عورت نے اونٹنی کو بھگانے کے لئے ''حَلْ'' کہا۔ عرب میں اونٹنی کو تیز چلانے کے لئے لفظ ''حَلْ'' کہا جاتا ہے، جیسا جانوروں کو تیز چلانے کے لئے، جانوروں کو بٹھانے کے لئے، جانوروں کو کھڑا کرنے کے لئے کچھ مخصوص آوازیں نکالی جاتی ہیں۔ تو اس عورت نے بھی ''حَلْ، حَلْ'' کہا، لیکن وہ اونٹنی اس کی مرضی کے مطابق نہیں چلی، جس کی وجہ سے اس عورت نے تنگ آکر لعنت کا جملہ کہا۔ اوپر والی روایت میں گزر چکا ہے کہ اس اونٹنی پر سے سامان اتروا کر اس اونٹنی کو

چھوڑ دیا گیا۔

ایک بحث

وَاعْلَمْ أَنَّ هٰذَا الْحَدِيثَ قَدْ يُسْتَشْكَلُ مَعْنَاهُ، وَلَا إِشْكَالَ فِيهِ، بَلِ الْمُرَادُ النَّهْيُ أَنْ تُصَاحِبَهُمْ تِلْكَ النَّاقَةُ، وَلَيْسَ فِيهِ نَهْيٌ عَنْ بَيْعِهَا وَذَبْحِهَا وَرُكُوبِهَا فِي غَيْرِ صُحْبَةِ النَّبِيِّ ﷺ، بَلْ كُلُّ ذٰلِكَ وَمَا سِوَاهُ مِنَ التَّصَرُّفَاتِ جَائِزٌ لَا مَنْعَ مِنْهُ، إِلَّا مِنْ مُصَاحَبَةِ النَّبِيِّ ﷺ بِهَا؛ لِأَنَّ هٰذِهِ التَّصَرُّفَاتِ كُلَّهَا كَانَتْ جَائِزَةً فَمُنِعَ بَعْضٌ مِنْهَا، فَبَقِيَ الْبَاقِي عَلَى مَا كَانَ، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ.

اب یہاں یہ بحث ہے کہ ایسا کرنے کی وجہ سے کیا یہ اونٹنی مالک کی ملکیت سے نکل گئی؟ اور کوئی آدمی یہ بھی سوال کرسکتا ہے کہ لعنت کرنے والی عورت نے لعنت کی، اس میں بے چاری اونٹنی کا کیا قصور تھا کہ اس کو قافلہ سے الگ کردیا؟۔

علامہ نوویؒ اس حدیث کے مطلب کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اس حدیث کے مطلب میں ذرا اشکالات ہیں، لیکن حقیقت میں کوئی دشواری نہیں ہے، بلکہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ارشاد کا حاصل اور خلاصہ صرف اتنا ہی تھا کہ وہ اونٹنی اب آپ کے قافلہ میں نہیں رہنی چاہئے، باقی اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ایسا کرنے کی وجہ سے وہ اونٹنی مالک کی ملکیت سے نکل گئی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے منع فرمانے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہمارے اس قافلہ کے علاوہ اس پر سوار ہونا، یا اس کو ذبح کرکے اس کا گوشت کھانا، یا کسی کے ہاتھ فروخت کرنا بھی ممنوع ہے، بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تو صرف یہی فرمایا تھا کہ اب یہ ہمارے ساتھ نہیں چاہئے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی چیز کو کوئی آدمی اپنے ساتھ رکھنا گوارا نہیں کرتا تو کہتا ہے کہ اب یہ ہمارے ساتھ نہیں ہونی چاہیے، اس کا مطلب یہ نہیں

ہوتا ہے کہ یہ کوئی غلط چیز ہے، یہاں پر بھی ایسا ہی ہے کہ صرف حضور ﷺ کے ساتھ قافلے میں اس کو نہیں رکھا جائے گا، اس کے علاوہ اس میں تمام طرح کے تصرفات درست اور جائز تھے، اس لیے کہ یہ سارے تصرفات پہلے بھی درست تھے، یہاں تک کہ حضور ﷺ کے ساتھ قافلے میں رکھنا بھی پہلے درست تھا، لیکن جس وقت اس پر لعنت بھیجی گئی تو حضور ﷺ نے صرف اپنے ساتھ رکھنے سے منع فرمادیا، لہٰذا صرف وہی ممانعت رہے گی، باقی ساری چیزیں اپنی جگہ پر جائز درست رہیں گی۔

باب جواز لعن بعض

أصحاب المعاصی غیر المعیّنین

نام لئے بغیر کسی گناہ کا ارتکاب کرنے والے پورے گروہ اور جماعت پر لعنت کرنے کی اجازت ہے، مثلاً: کوئی جماعت کسی بڑے گناہ کا ارتکاب کرتی ہو، تو ان پر لعنت بھیجنے کے نمونے قرآن وحدیث میں موجود ہیں۔

نام لئے بغیر لعنت بھیجنے کے نمونے

چناں چہ قرآنِ پاک میں ہے: ﴿أَلَا لَعْنَةُ اللهِ عَلَى الظّٰلِمِينَ﴾ (هود :۱۸) سنو! ظالموں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔ لہٰذا جو بھی ظالم ہوگا وہ اس کا مصداق ہے۔ آپ کسی کا نام لے کر نہیں کہہ سکتے کہ فلاں پر اللہ کی لعنت ہو، لیکن یوں کہہ سکتے ہیں کہ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے، لہٰذا اب جو بھی لعنت سے بچنا چاہتا ہو وہ اپنے آپ کو ظلم کرنے سے بچائے۔

﴿فَأَذَّنَ مُؤَذِّنٌ بَيْنَهُمْ أَنْ لَعْنَةُ اللهِ عَلَى الظّٰلِمِينَ﴾ (الأعراف:۴۴) حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ایک اعلان کرنے والے نے اعلان کیا کہ ظلم کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔

''وَثَبَتَ فِي الصَّحِيحِ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: ((لَعَنَ اللهُ الْوَاصِلَةَ وَالْمُسْتَوْصِلَةَ'' صحیح روایتوں میں آیا ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسی عورت کے اوپر

لعنت فرمائی جس کے بال چھوٹے ہوں تو وہ اپنے بالوں کو لمبا کرنے کے لئے دوسری عورتوں کے نکلے ہوئے بالوں کو اپنے بالوں میں جوڑ دے۔ یا کسی دوسری عورت کو اپنے بالوں کے ساتھ بال جوڑنے کے لئے کہے۔ یعنی یا تو خود ہی یہ کام کرے، یا پھر کسی دوسرے سے کروائے؛ دونوں پر اللہ کی لعنت ہے اور حضور ﷺ نے بھی لعنت فرمائی ہے۔ کیوں کہ اس طرح بالوں کو جوڑ کر گویا یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ میرے بال اتنے لمبے ہیں، اس میں ایک طرح کا دھوکہ ہے۔ ہاں! کوئی ایسی چیز لگائی گئی جس سے دھوکے کا شبہ نہیں ہوتا، بلکہ محض زینت مقصود ہے، جیسے: مصنوعی بال لگائے اور لوگ دیکھنے سے پر محسوس کر لیتے ہیں کہ یہ مصنوعی ہیں، تو اس صورت میں فقہاء نے اجازت دی ہے، لیکن محدثین کرام اس سے بھی منع فرماتے ہیں۔

سود کھانے والے پر اللہ کی لعنت

''وَأَنَّهُ قَالَ: ''لَعَنَ اللهُ آكِلَ الرِّبَا'' اسی طرح حدیثِ پاک میں نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: سود کھانے والے پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔ دینے والے پر، سود کی گواہی دینے والے پر، اور اس معاملہ کی چٹھی اور ایگریمنٹ لکھنے والے پر۔ اس حدیث میں حضور ﷺ نے مخصوص گناہ کا ارتکاب کرنے والے لوگوں پر لعنت فرمائی ہے۔

''وَأَنَّهُ لَعَنَ الْمُصَوِّرِينَ'' کسی بھی جاندار کی تصویر بنانے والے پر بھی نبیٔ کریم ﷺ نے لعنت فرمائی ہے۔

زمین کے نشانات بدل دینے والوں پر لعنت

''وَأَنَّهُ قَالَ: ((لَعَنَ اللهُ مَنْ غَيَّرَ مَنَارَ الْأَرْضِ)) أَيْ حُدُودَهَا'' اور

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آدمی پر بھی لعنت فرمائی جو زمین کے نشانات کو بدل دے۔

لوگوں کی مملوکہ زمینیں اور کھیت کی حد متعین کرنے کے لئے باقاعدہ پتھر وغیرہ کے نشان لگائے جاتے ہیں، جس کو عربی میں ''مَنَارُ الأَرْضِ'' کہتے ہیں۔ جو لوگ دوسروں کی زمین ہڑپ کرنے والے ہوتے ہیں، وہ ان نشانات کو ہٹا کر اِدھر اُدھر کر دیتے ہیں، ان نشانات کو دیکھ کر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ اس پتھر تک میری زمین ہے، اور اس کے بعد سے دوسرے کی ہے۔ جب اس نشان کو ذرا ہٹا دیا تو ایسا کر کے گویا اس نے دوسرے کی زمین ہڑپ کرنے کی کوشش کی، اور کسی کی زمین ہڑپ کرنا بہت بڑا گناہ ہے، اور اس پر لعنت فرمائی گئی ہے۔ زمین ہڑپ کرنے پر اور بھی وعیدیں آئی ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو آدمی کسی کی زمین ہڑپ کر لے، تو قیامت کے دن سات زمینوں کا طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈالا جائے گا۔

چوروں پر اللہ کی لعنت ہو

وأَنَّهُ قَالَ: ((لَعَنَ اللهُ السَّارِقَ يَسْرِقُ الْبَيْضَةَ)) اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چور پر لعنت فرمائی ہے۔ ارشاد فرمایا: چور پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو جو انڈا چراتا ہے (بعض روایتوں میں آتا ہے) کہ اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔

اب اشکال ہوتا ہے کہ ہاتھ کاٹنے کے لئے تو باقاعدہ نصاب مقرر کیا ہے کہ دس درہم جتنی مقدار یا اس سے زیادہ کی چوری کرے تب ہی ہاتھ کاٹا جائے گا، اور انڈا تو بہت کم قیمت چیز ہے؟ تو اس بارے میں علماء نے بتلایا ہے کہ دراصل چور کے اندر چوری کی جو عادت پڑتی ہے، تو شروعات میں وہ بڑے ہاتھ نہیں مارا کرتا، بلکہ بچپن میں پہلے پہل وہ چھوٹی چھوٹی چوریاں کرتا ہے، جیسے: کسی کا قلم چرا لیا، کسی کی تسبیح یا رومال

چرالیا، کسی کی پنسل اور ربر چرالیا، اس وقت اس کے مربی کی طرف سے اگر ان چیزوں سے روکا نہیں جاتا، اور اس کے مربی ان چیزوں سے واقف ہونے کے باوجود جب منع نہیں کرتے تو پھر معاملہ آگے بڑھتا ہے، اور پھر دھیرے دھیرے وہ چوری کی لائن میں بڑا نام کماتا ہے۔ بہرحال! چور پر بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے، اس لیے یوں کہا جاسکتا ہے کہ چوروں پر اللہ کی لعنت ہو۔

ماں باپ کو گالی دینے والے پر لعنت

''وأَنَّهُ قَالَ: ((لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ لَعَنَ وَالِدَيهِ))'' جو آدمی اپنے ماں باپ پر لعنت بھیجے یا ان کو گالی دے اس پر بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے۔

بعض احادیث میں آیا ہے کہ جب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ماں باپ کو گالی دینے کا تذکرہ کیا تو صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! اپنے ماں باپ کو گالی کون دے گا؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کسی نے دوسرے کو اس کے ماں باپ کی گالی دی، جواب میں اُس نے اِس کے ماں باپ کو گالی دی، تو اپنے ماں باپ پر گالی پڑنے کا ذریعہ اِس کی گالی ہی تو بنی۔ اسی طرح لعنت میں ہوسکتا ہے کہ کسی نے دوسرے کے ماں باپ پر لعنت بھیجی، اس کے جواب میں اُس نے اِس کے ماں باپ پر لعنت بھیجی، تو بتلایا گیا کہ ایسا کرنے والا بھی اللہ کی لعنت کا حقدار ہوتا ہے۔ ہمارے زمانہ میں تو بعض لوگ اپنے ماں باپ کے ساتھ براہِ راست گالی گلوچ اور لعنت و پھٹکار کا معاملہ کرتے ہیں۔

غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کرنے والے پر لعنت

وَ((لَعَنَ اللّٰهُ من ذَبَحَ لِغَيْرِ اللّٰهِ)) غیر اللہ کے نام پر جو آدمی جانور ذبح کرے

اس پر بھی نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے، اس لیے کوئی بھی حلال جانور ذبح کیا جائے تو وہ اللہ کے نام پر ہی ذبح ہونا چاہیے۔ زمانۂ جاہلیت میں بتوں کے نام پر جانور ذبح کیے جاتے تھے، جو ایک طرح کا شرک ہے جس پر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے۔

بدعتی پر لعنت

وَأَنَّهُ قَالَ: ((مَنْ أَحْدَثَ فِيهَا حَدَثًا أَوْ آوَى مُحْدِثًا فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ)) حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ جس نے مدینہ منورہ میں کوئی بدعت ایجاد کی، یا کسی بدعتی کو پناہ دی؛ تو اس پر اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔ گویا بدعت ایجاد کرنے والے پر، یا بدعتی کو پناہ دینے والے پر اور خاص طور پر مدینہ منورہ میں بدعت ایجاد کرنے والے پر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے۔

واقعۂ بیرِ معونہ اور واقعۂ رجیع

وأنّه قَالَ: ((اللَّهُمَّ الْعَنْ رِعْلاً، وَذَكْوَانَ، وعُصَيَّةَ: عَصَوُا اللهَ وَرَسُولَهُ)) وهٰذِهِ ثَلَاثُ قَبَائِلَ مِنَ الْعَرَبِ)) اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بددعا کی تھی کہ اے اللہ! رِعْل، ذَکْوَان اور عُصَیَّہ (یہ تینوں عرب قبائل ہیں) پر لعنت بھیج؛ جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی اور ان کا مقابلہ کیا۔

واقعۂ بیرِ معونہ اور واقعۂ رجیع یہ دو واقعے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں پیش آئے تھے جن کا پہلے بھی کہیں حوالہ آچکا۔ ایک موقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دس صحابۂ کرام کو اور بیرِ معونہ والے واقعہ میں ستّر صحابۂ کرام کو- جو سب کے سب قرآنِ پاک کے حافظ

تھے- خاص مشن کے لئے ایک جگہ پر بھیجا تھا۔ جن لوگوں نے حضور اکرم ﷺ سے درخواست کر کے ان کو بلوایا تھا انہوں نے ہی غداری کر کے بعض مشرک قبائل کو ان کے خلاف بھڑکایا، وہ سب ان کے پیچھے پڑ گئے اور انہوں نے سب صحابہ کو شہید کر دیا، اللہ تعالیٰ نے بذریعۂ وحی حضور اکرم ﷺ کو اس کی اطلاع دی، تو نبیٔ کریم ﷺ فجر کی نماز میں دو مہینے تک قنوتِ نازلہ پڑھتے رہے اور ان کے لئے بددعا فرمائی۔ یہاں تو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ پوری جماعت اور پورے قبیلے پر نبیٔ کریم ﷺ نے لعنت فرمائی۔

مرض الوفات میں قبروں کو سجدہ گاہ بنانے سے روکا

''وأنَّه قَالَ: لَعَنَ اللهُ اليَهُودَا تَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَاءِهِمْ مَسَاجِدَ'' حضور ﷺ نے وفات کے وقت یہ ارشاد فرمایا تھا۔ روایتوں میں آتا ہے کہ جب نبیٔ کریم ﷺ مرض الوفات میں مبتلا تھے اور آپ کی آخری گھڑیاں چل رہی تھیں، اس وقت آپ کی جو کملی اور چادر تھی اس کو آپ کبھی اپنے منہ پر اوڑھ لیتے تھے، پھر جب دم گھٹنے لگتا تو چہرۂ انور کھول دیتے، اس موقعہ پر حضرت عائشہؓ نے سنا کہ آپ اپنی زبانِ مبارک سے فرما رہے تھے کہ یہودیوں پر اللہ کی لعنت جنھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا دیا یعنی اپنے نبیوں کی قبروں پر سجدہ کرنے لگے اور اس کی پوجا اور عبادت کرنے لگے۔

بخاری شریف کی روایت میں ہے: ''يُحَذِّرُ مَا صَنَعُوا''(۱) ان کے لئے بددعا کر کے آپ ﷺ اپنی امت کو اس حرکت سے بچانا چاہتے تھے جو یہودیوں نے کی۔

---

(۱) أَنَّ عَائِشَةَ وَعَبْدَ اللهِ بْنَ عَبَّاسٍ قَالَا: لَمَّا نَزَلَ بِرَسُولِ اللهِ ﷺ طَفِقَ يَطْرَحُ خَمِيصَةً لَهُ عَلَى وَجْهِهِ فَإِذَا اغْتَمَّ بِهَا كَشَفَهَا عَنْ وَجْهِهِ فَقَالَ وَهُوَ كَذَلِكَ: لَعْنَةُ اللهِ عَلَى الْيَهُودِ وَالنَّصَارَى اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَاءِهِمْ مَسَاجِدَ يُحَذِّرُ مَا صَنَعُوا.

گویا دنیا سے تشریف لے جاتے ہوئے حضور اکرم ﷺ کا یہودیوں کی ان حرکت پر بددعا کرنا اپنی امت کو وارننگ اور تنبیہ تھی کہ تم لوگ ایسی حرکت مت کریو۔

زنانے مرد اور مردانی عورتوں پر لعنت

''وأنهُ ((لَعَنَ الْمُتَشَبِّهِينَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَاءِ وَالْمُتَشَبِّهَاتِ مِنَ النِّسَاءِ بِالرِّجَالِ))'' اور حضور اکرم ﷺ نے ایسے مردوں پر لعنت فرمائی جو عورتوں کے ساتھ مشابہت اختیار کریں، اور ایسی عورتوں پر بھی لعنت فرمائی جو مردوں کی مشابہت اختیار کریں۔ یعنی جو مرد عورتوں جیسی وضع قطع، عورتوں جیسی شکل وصورت اور عورتوں جیسی چال ڈھال اور انداز اختیار کریں، جو صفات عورتوں کی شمار ہوتی ہیں ان صفات کو اپنائیں، مثلاً: بالوں میں ایسا طرز اختیار کرلیا جائے جیسا کہ عورتوں کا ہوتا ہے، یا لباس عورتوں جیسا پہن لیا جائے۔ یا جو عورتیں مردوں کی مشابہت اختیار کریں، مثلاً: مردوں جیسا لباس، مردوں جیسا طور وطریق، مردوں جیسے بال، مردوں جیسا انداز اختیار کرنے والی عورتوں پر حضور اکرم ﷺ نے لعنت فرمائی ہے۔ میں اس کا ترجمہ یوں کرتا ہوں: زنانے مرد اور مردانی عورتوں پر حضور اکرم ﷺ نے لعنت فرمائی ہے۔

خلاصۂ کلام

''وَجَمِيعُ هٰذِهِ الأَلْفَاظِ فِي الصَّحِيحِ؛ بَعْضُهَا فِي صَحِيحَيِ البُخَارِي وَمُسْلِمٍ، وَبَعْضُهَا فِي أَحَدِهِمَا، وَإِنَّمَا قَصَدْتُ الاخْتِصَارَ بِالإِشَارَةِ إِلَيْهِمَا، وَسَأَذْكُرُ مُعْظَمَهَا فِي أَبْوَابِهَا مِنْ هٰذَا الْكِتَابِ، إِنْ شَاءَ اللهُ تَعَالٰى''

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ: یہ سارے کلمات جو ہم نے نقل کیے ان کے

باقاعدہ حوالے نہیں دیئے، اور پوری پوری حدیثیں بھی پیش نہیں کیں، لیکن یہ سب روایتیں صحیح ہیں، اور بعض تو ایسی روایتیں ہیں جو بخاری و مسلم دونوں میں موجود ہیں، اور بعض ایسی ہیں جو ان میں سے کسی ایک میں ہیں۔ اور میں نے تو صرف ایک ایک جملہ پیش کر کے مختصر طور پر اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے، اور یہ روایتیں اسی کتاب کے دوسرے عنوانات کے ماتحت پہلے بھی آچکی ہیں، یا آئندہ ان شاء اللہ آئیں گی۔

باب تحریم سب المسلم بغیر حقٍ

کسی مسلمان کو ناحق گالی دینا حرام ہے

قَالَ اللہ تَعَالَیٰ: والَّذِینَ یُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِینَ والْمُؤْمِنَاتِ بِغَیْرِ مَا اکْتَسَبُوا، فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَاناً وإِثْماً مُبِیناً (الأحزاب:۵۸)

زبان کی حفاظت کا سلسلہ چل رہا تھا اور زبان سے جو گناہ سرزد ہوتے ہیں، ان سے بچنے کے سلسلے میں نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات پچھلی کئی مجلسوں سے پیش کرتے چلے آئے ہیں۔ آج نیا عنوان قائم کیا ہے کہ: کسی مسلمان کو ناحق گالی دینا حرام ہے۔ کسی مسلمان کو برا بھلا کہنا، یا کوئی ایسی بات کہنا جس سے اس کی عزت پر آنچ آتی ہو؛ یہ بھی گالی کے حکم ہی میں ہے اور یہ بھی حرام ہے۔ چوں کہ یہ گناہ بھی زبان ہی سے سرزد ہوتا ہے، اس لیے یہاں اسی زبان کی حفاظت کے ماتحت جو چیزیں لا رہے تھے اسی ذیل میں اس کو بھی لائے ہیں۔

پہلے قرآنِ پاک کی آیت پیش کی: اور وہ لوگ جو ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو ایذاء و تکلیف پہنچاتے ہیں بغیر اس کے کہ انہوں نے کوئی ایسا کام کیا ہو جو ان کو ایذاء و تکلیف کا حقدار ٹھہراتا ہو- جس کو ناحق کہتے ہیں- ایسے لوگوں نے اپنے سر پر جھوٹ کا بوجھ اٹھایا ہے (اگر وہ ایذاء قولی اور زبانی ہے) اور (اگر وہ ایذاء فعلی اور ہاتھ سے پہنچی ہو) تو انہوں نے کھلم کھلا گناہ کا بوجھ اپنے سر لیا ہے۔

اس آیت کو لا کر بتلانا چاہتے ہیں کہ کسی مؤمن مرد یا عورت کو تکلیف پہنچانا- چاہے زبان سے ہو، یا ہاتھ سے ہو، یا کسی اور عضو سے- حرام ہے۔ اور چوں کہ گالی دینا

اور بُرا بھلا کہنا زبان ہی سے ہوتا ہے اسی مناسبت سے لائے ہیں۔

مسلمان کو گالی دینا گناہ ہے

۱۵۵۹:-وعن ابن مسعود-رضی اللہ عنہ-قَالَ: قَالَ رسُولُ اللہ ﷺ :((سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوقٌ، وَقِتَالُهُ كُفْرٌ)).(متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:-حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی مسلمان کو گالی دینا (برا بھلا کہنا، سبّ وشتم کرنا) گناہ ہے، اور اس کے ساتھ لڑنا اور جنگ کرنا کفر ہے۔

افادات:-فسوق یعنی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اس کی اطاعت سے اپنے آپ کو نکالنا۔ جیسے کفر ایک بڑا گناہ ہے ویسے ہی مسلمان کے ساتھ جنگ کرنا بھی ایک بڑا گناہ ہے، اور اگر اس کو حلال سمجھ کر کرے گا تو واقعۃً اس کی وجہ سے کافر ہوجائے گا۔

جملہ خود پر ہی لوٹتا ہے

۱۵۶۰:-وعن أَبي ذرٍ رضی اللہ عنہ: أنهُ سَمِعَ رسُولَ اللہِ ﷺ يقول: ((لاَيَرْمِي رَجُلٌ رَجُلاً بِالفِسْقِ أَوِ الكُفْرِ، إلاَّ ارْتَدَّتْ عَلَيْهِ، إنْ لَمْ يَكُنْ صَاحِبُهُ كَذَلِكَ)) (رواه البخاری)

ترجمہ:-حضرت ابوذر غفاریؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے نبیٔ کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: کوئی آدمی کسی دوسرے آدمی پر فسق یا کفر کا الزام لگاتا ہے (اور اس کو فسق وکفر سے متہم کرتا ہے) اگر وہ اس کا اہل نہیں ہے تو اس کا کہا ہوا جملہ اسی کی طرف لوٹتا ہے۔

افادات:-یعنی کسی سے یوں کہا: او فاسق، اے کافر؛ تو یہ بھی ایک طرح کی گالی اور سبّ وشتم ہی ہے، اور گذشتہ باب میں یہ بات آچکی تھی اور اس کی تفصیل بھی

بتلادی تھی کہ کسی کے متعلق اگر اس طرح کی بات کی گئی ہے اور وہ اپنے کرتوت یا بدعملی کی وجہ سے اس کا حقدار نہیں ہے تو اس صورت میں کہنے والا اپنی اس بات کے بُرے نتیجہ سے محفوظ نہیں رہ سکتا، گویا اس کے اثرات اور نتائج اسی کو بھگتنے ہوں گے۔

ذمہ داری شروع کرنے والے کی ہے؛ اگر

۱۵۶۱:-وعن أبي هريرة رضي الله عنه أنَّ رسولَ اللهِ ﷺ قَالَ: ((المُتَسَابَّانِ مَا قَالاَ، فَعَلَى البَادِي منهُما حَتَّى يَعْتَدِي المَظْلُومُ)) (رواہ مسلم)

ترجمہ:-حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: آپس میں ایک دوسرے کو گالی دینے والے جو بات بھی کہیں گے اس کی ذمہ داری شروع کرنے والے پر ہوگی، یہاں تک کہ جس کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے وہ حد سے آگے بڑھ جائے۔

افادات:-یعنی ایک نے پہلے گالی دی، تو اس کے جواب میں سامنے والے نے بھی گالی دی۔حالاں کہ اگر کوئی آدمی گالی دے اور بُرا سلوک کرے؛ تو اس کو چاہیے تھا کہ عفو و درگزر سے کام لیتا جیسا کہ قرآنِ پاک میں اس کی ترغیب دی گئی ہے: ﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ﴾ دوسری جگہ ہے: ﴿وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ﴾ تمہارے ساتھ اگر کوئی برا سلوک کیا گیا، یا زیادتی کی گئی اور آپ بدلہ لینا چاہتے ہیں تو جتنی زیادتی آپ کے ساتھ کی گئی ہو، اتنا ہی آپ بدلہ لیجئے، اس سے ذرّہ برابر بھی زیادتی اور اضافہ نہیں ہونا چاہیے۔ اور اگر آپ معاف کر دیں اور صبر سے کام لیں تو بہت اچھا ہے۔تو اس کا اصل جواب یہی ہے کہ ہم جواب میں خاموشی اختیار کرلیں، لیکن اس کے باوجود اگر بدلہ لینا چاہتے ہیں تو اتنی ہی بُری بات جو اس نے کہی ہے؛ ہم بھی کہہ سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ تہمت کے قبیل سے

نہ ہو۔ یعنی کسی نے آپ کو ماں کی ایسی گالی دی جس میں ماں پر تہمت کا کوئی جملہ استعمال کیا؛ تو آپ کو اس کے جواب میں تہمت کا جملہ کہنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی، لیکن اگر کسی نے آپ کو منافق یا زندیق یا حمار گدھا اور بے وقوف کہا، تو اس کے جواب میں آپ بھی اس کو بے وقوف کہہ سکتے ہیں، یہاں تک کہ جس کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے وہی حد سے آگے بڑھ جائے، یعنی اگر کسی نے آپ کو بے وقوف کہا، تو جواب میں آپ بھی اس کو بے وقوف کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ جواب میں یوں کہیں کہ: تو بے وقوف، تیرا باپ بے وقوف، تیرا بیٹا بے وقوف؛ تو اس صورت میں ظاہر ہے کہ آپ زیادتی کرنے والے ہوں گے، اور زیادتی بہر حال زیادتی ہے، اس صورت میں آپ کو گنہگار قرار دیا جائے گا۔

اس کے خلاف شیطان کی مددمت کرو

۱۵۶۲:- وعنہ، قَالَ: أُتِيَ النَّبِيُّ ﷺ بِرَجُلٍ قَدْ شَرِبَ قَالَ: ((اضربوہُ)) قَالَ أَبُو هريرةَ: فَمِنَّا الضارِبُ بيَدِهِ، والضَّارِبُ بِنَعْلِهِ، والضَّارِبُ بِثَوْبِهِ. فَلَمَّا انْصَرَفَ، قَالَ بَعْضُ القَوْمِ: أَخْزَاكَ اللهُ! قَالَ: ((لا تَقُولُوا هَذَا، لا تُعِينُوا عَلَيْهِ الشَّيْطَانَ)). (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ کے پاس ایک آدمی کو لایا گیا جنہوں نے شراب پی تھی، نبیٔ کریم ﷺ نے حد جاری کرنے کے طور پر فرمایا: ان کو مارو۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں: ہم میں سے کسی نے اپنے ہاتھ سے، کسی نے اپنے جوتے سے، کسی نے اپنے کپڑے سے ان کی پٹائی کی۔ جب وہ لوٹنے لگے تو ایک آدمی نے کہا: اللہ تعالیٰ تجھے رسوا کرے۔ اس پر حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایسامت کہو اور اس کے خلاف شیطان کی مددمت کرو۔

افادات:- شراب پینے پر شروع میں نبیٔ کریم ﷺ مطلقاً پٹائی کا حکم دیا

کرتے تھے، بعد میں شریعت کی طرف سے شربِ خمر کی سزا اور حد اسّی کوڑے مقرر کی گئی۔

''اس کے خلاف شیطان کی مددمت کرو''یعنی شیطان تو چاہتا ہے کہ مؤمن کو گناہ اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا کر کے اس کی رسوائی کے مواقع فراہم کرے۔ اور جب تم اس کو یہ بددعا دے رہے ہو اور یوں کہہ رہے ہو کہ اللہ رسوا کرے، تو گویا تم اپنے بھائی کے مقابلہ میں شیطان کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہو اور اس کی مدد کر رہے ہو؛ ایسا مت کرو بلکہ اپنے بھائی کی اس سے حفاظت کی دعا کرنی چاہیے۔

تہمت لگانے والے آقا کی سزا

۱۵۶۳:-وعنہ، قَالَ: سَمِعْتُ رسولَ اللہِ ﷺ یقول:((مَنْ قَذَفَ مَمْلُوكَهُ بِالزِّنَا يُقَامُ عَلَيْهِ الحَدُّ يَومَ القِيَامَةِ، إِلاَّ أَنْ يَكُونَ كما قَالَ)).(متفق عَلَیْہِ)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جس آدمی نے اپنے غلام پر زنا کی تہمت لگائی تو قیامت کے دن اس پر حد جاری کی جائے گی؛ الّا یہ کہ وہ غلام ایسا ہی ہو جیسا کہ کہا ہے۔

افادات:- اگر کسی آدمی نے کسی پاکدامن عورت، یا مرد -جس نے زنا کا ارتکاب نہیں کیا ہے، اس- پر زنا کی تہمت لگائی؛ تو تہمت لگانے والے کو سزا کے طور پر اسّی کوڑے لگائے جاتے ہیں، اور اگر غلام پر تہمت لگائی تو چالیس کوڑے لگائے جاتے ہیں۔ اور آقا نے اگر اپنے غلام پر تہمت لگائی اور یہ معاملہ حاکم کے پاس پہنچ بھی جائے، تو اسی کا غلام ہونے کی وجہ سے آقا کو دنیا میں سزا نہیں دی جاتی، لیکن قیامت میں اللہ تعالیٰ اس پر سزا جاری کریں گے، الّا یہ کہ وہ غلام ایسا ہی ہو۔ یعنی اس پر جو تہمت لگائی گئی ہے وہ درست تھی، تو قیامت میں آقا کو یہ سزا نہیں ملے گی۔

باب تحریم سبّ الأموات بغیرحق ومصلحةٍ شرعیة

وَهِيَ التَّحْذِيرُ مِنَ الاقْتِدَاء بِهِ فِي بِدْعَتِهِ وَفِسْقِهِ ، وَنَحْوِ ذَلِكَ وَفِيهِ الآيَةُ والأَحاديثُ السَّابِقَةُ في البَابِ قَبْلَهُ .

مُردوں کو بُرا بھلا مت کہو

جو لوگ انتقال کر چکے ہیں ان کو ناحق اور کسی شرعی مصلحت کے بغیر بُرا بھلا کہنا، ان کی شان میں کوئی ایسی بات کہنا جو ان کے لیے تنقیص کا ذریعہ ہو؛ اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ ہاں! اگر شرعی مصلحت کا تقاضا ہو کہ اس کی کسی بات کو ظاہر کیا جائے جیسے: اس مرنے والے نے کوئی ایسا مضمون لکھا تھا جو بدعت کی ترویج اور بدعت کو پھیلانے کا ذریعہ بن رہا تھا، اب اگر اس کے اس مضمون کا جواب لکھا جائے، اس نے جو باتیں لکھی ہیں ان کی تردید دلائل کے ذریعہ کی جائے، تو اس کی اجازت ہے، ہاں! اس کی ذات پر کچھ نہ لکھا جائے۔ اس لیے کہ اگر اس کا جواب نہیں دیا جائے گا تو دوسرے لوگ بدعت کے معاملہ میں اس کی پیروی کریں گے۔ یہاں کوئی آدمی اگر یوں کہے کہ وہ تو انتقال کر چکا ہے، اب آپ اس کے متعلق ایسی بات کیوں لکھتے ہیں؟ تو کہا جائے گا کہ شرعی مصلحت کا تقاضہ ہے کہ لکھا جائے، اور اس کی شریعت نے اجازت بھی دی ہے۔

یا کوئی آدمی فاسق و فاجر تھا اور غلط نظریے لوگوں میں پھیلا رہا تھا اور اس کے

غلط نظریے کی ترویج ہورہی ہے، لوگ اس کی ان غلط چیزوں کو مان رہے ہیں، جیسے: غلام احمد قادیانی جھوٹا مدعی نبوت تھا، تو اس کی تردید لازم اور ضروری ہے۔ اب اگر کوئی کہے کہ وہ تو مر چکا ہے، اس کی برائی کیوں کی جائے؟ تو ظاہر ہے کہ اس کی برائی اس لیے کی جاتی ہے کہ لوگ اس کی اقتداء سے بچ جائیں، اس لیے اگر اس کی ان برائیوں کو ظاہر کیا جائے؛ تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

وہ اپنے اعمال تک پہنچ چکے ہیں

۱۵۶۴:-وعن عائشة رَضِيَ اللهُ عنها قالت: قَالَ رسُولُ الله ﷺ:

((لاتَسُبُّوا الأَمْوَاتَ، فَإِنَّهُمْ قَدْ أَفْضَوْا إِلَى مَا قَدَّمُوا.)) (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو لوگ انتقال کر چکے ہیں انہیں برا بھلا مت کہو، اس لیے کہ انہوں نے جو اعمال آگے بھیج دیئے، وہ اپنے ان اعمال تک پہنچ چکے ہیں۔

افادات:- یعنی وہ اس عالم میں پہنچ چکے ہیں جہاں ان کے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا، اب آپ اپنی زبان کو ان کے ان کرتوتوں کا تذکرہ کر کے ملوث نہ کریں۔ اب وہ اللہ تعالیٰ کے حضور جا چکے ہیں، اور انہوں نے بھلا یا برا جو کچھ بھی کیا ہے اس کا بدلہ ان کو وہاں مل جائے گا؛ اب ان کے لئے ہم اپنی زبان کو کیوں خراب کریں؟ اس لیے اس سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔

مُردوں کی برائی سے زندوں کو تکلیف ہوتی ہے

اور مردوں کی برائی کی وجہ سے زندوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔

سیرت کی کتابوں میں واقعہ لکھا ہے کہ فتح مکہ کے موقعہ پر نبیٔ کریم ﷺ نے اہل مکہ کے متعلق عام معافی کا اعلان کیا تھا، البتہ گیارہ مرد اور چار عورتیں ایسی تھیں جن کے متعلق نبیٔ کریم ﷺ نے یہ حکم جاری کیا تھا کہ ان کو قتل کردیا جائے، ان کے لئے امان نہیں تھی، ان گیارہ مردوں میں حضرت عکرمہؓ (ابوجہل کے بیٹے) بھی تھے، چوں کہ وہ بھی اپنے باپ کی طرح نبیٔ کریم ﷺ کے بڑے دشمن تھے۔ فتحِ مکہ کے موقعہ پر جن لوگوں کو امان نہیں دی گئی تھی ان میں یہ بھی تھے، جب ان کو پتہ چلا تو وہ وہاں سے یمن کی طرف بھاگ گئے اور یمن جاکر ایک کشتی میں سوار ہوئے، ان کا ارادہ یہ تھا کہ یہاں سے حبشہ یا کسی دوسرے ملک چلے جائیں تاکہ جان بچ جائے۔ کشتی ابھی تھوڑی دور ہی چلی تھی کہ طوفان میں گھر گئی، یہ مدد کے واسطے لات اور عزّیٰ کو پکارنے لگے تو کشتی چلانے والے نے کہا: لات اور عزّیٰ کو پکاروگے تو کچھ کام نہیں بنے گا، ایک اللہ کو پکارو؛ تب ہی مسئلہ کچھ حل ہوسکتا ہے۔ انہوں نے اپنے دل میں سوچا کہ جب یہاں سمندر میں ایک اللہ ہی نجات دے سکتا ہے اور اسی کو پکارا جاسکتا ہے؛ تو خشکی میں بھی اسی کو پکارنا چاہئے اور انہوں نے دل ہی دل میں عہد کرلیا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس مخمصہ ومصیبت سے نجات دیدی تو میں نبیٔ کریم ﷺ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دوں گا اور اپنے شرک وکفر سے توبہ کرلوں گا اور ایمان لے آؤں گا، چناں چہ کشتی طوفان سے بچ گئی اور ساحل پر پہنچ گئی۔

اُدھر ان کی بیوی امّ حکیمؓ بنت حارث بن ہشام جو ان کی چچازاد بہن تھی، اس لیے کہ ابوجہل کا نام عمرو بن ہشام ہے، اور اس کے بھائی حارث بن ہشام کی یہ بیٹی تھی، جب یہ ایمان لے آئیں اس کے بعد انہوں نے نبیٔ کریم ﷺ کی خدمت میں درخواست کی کہ آپ میرے شوہر عکرمہ کو امان دیدیں۔ چناں چہ نبیٔ کریم ﷺ نے ان

کی درخواست قبول فرمالی اور حضرت عکرمہؓ کو امان دیدی۔ اور ان کو معلوم تھا کہ میرے شوہر بھاگ کر یمن جا چکے ہیں، چناں چہ یہ اس امان کی اطلاع لے کر ان کی تلاش میں یمن کی طرف نکلیں، جب وہاں پہنچیں اور اپنے شوہر سے کہا کہ: میں ایک ایسی شخصیت کے پاس سے آرہی ہوں جو ''أَبَرُّ النَّاسِ وَأَوْصَلُ النَّاسَ وَخَيْرُ النَّاسِ'' ہیں، یعنی لوگوں میں سب سے زیادہ نیکوکار، اور سب سے زیادہ صلہ رحمی کرنے والے اور سب سے زیادہ بھلائی کرنے والے ہیں، اور میں نے ان سے آپ کے لیے امان حاصل کرلی ہے؛ اس لیے آپ واپس چلیئے اور اپنے گناہوں اور قصوروں سے توبہ کیجئے۔ چنانچہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ واپس ہوئے۔ راستہ میں ان سے صحبت کرنے کا ارادہ کیا تو بیوی نے ان کو روک دیا کہ تم کافر ہو اور میں مسلمان ہوں، تم مجھے ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ انہوں نے کہا: کوئی بہت بڑی چیز ہے جو تم کو میرے ساتھ صحبت کرنے سے روک رہی ہے۔

خیر! میں جو بات بتلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معلوم ہوا کہ وہ آرہے ہیں تو حضور کی مجلس میں پہنچنے سے پہلے ہی آپ نے صحابہ کو بتلایا: ''سَيَأْتِيكُمْ عِكْرِمَةُ مُؤْمِناً؛ فَلَا تَسُبُّوا أَبَاهُ، فَإِنَّ سَبَّ الْمَيِّتِ يُؤْذِي الْحَيَّ'' عکرمہ مؤمن ہو کر آرہے ہیں، لہٰذا تم ان کے باپ کو گالی مت دینا اور بُرا بھلا مت کہنا؛ اس لیے کہ مُردوں کو برا بھلا کہنا زندوں کو تکلیف پہنچاتا ہے۔ یہاں بتلانا یہ ہے کہ جس کو گالی دینے سے منع کیا جارہا ہے وہ ابوجہل تھا۔ جس کو ''فِرْعَوْنُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ'' کہا گیا ہے، اور جو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے بڑا دشمن تھا، اس کے باوجود جب وہ مر چکا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف اس لیے اس کو برا بھلا کہنے سے منع فرمادیا کہ جب اس کو بُرا بھلا کہا جائے گا تو اس کا اثر زندوں پر پڑے گا۔

مناقبِ عکرمہ

پھر حضرت عکرمہ ؓ حضور اکرم ﷺ کے قریب آئے تو ان کی بیوی امّ حکیم ؓ نقاب ڈال کر برابر میں کھڑی ہوگئی، اور حضرت عکرمہ ؓ نے حضور ﷺ سے سوال کیا کہ: انہوں نے مجھے بتلایا ہے کہ آپ نے مجھے پناہ دی ہے؛ کیا یہ بات صحیح ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: جی ہاں! میں نے تم کو امان دی ہے۔ پھر انہوں نے عرض کیا: آپ کس چیز کی دعوت دیتے ہیں؟ نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا: میں اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ اس بات کی گواہی دو کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے، اور میں اللہ کا رسول ہوں، اور نماز قائم کرو، روزے رکھو، زکوٰۃ ادا کرو۔ حضرت عکرمہ ؓ نے اسی وقت کلمہ پڑھ لیا اور ساتھ ہی ساتھ نبیٔ کریم ﷺ کے سامنے فرمایا کہ: میں ان سب لوگوں کی موجودگی میں آپ سے اس بات کا عہد کرتا ہوں کہ آج تک میں نے لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکنے کے لئے جتنا مال خرچ کیا ہے؛ آئندہ اس سے دوہرا مال لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے کے لئے اللہ کے راستہ میں خرچ کروں گا۔ اور اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جتنی جنگیں کی ہیں؛ آئندہ اُس سے ڈبل جنگیں میں اللہ اور اس کے رسول کے راستہ میں کروں گا۔ اور جہاں جہاں جا کر میں نے لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کے دین سے روکا تھا؛ وہاں وہاں جا کر میں لوگوں کو اس کی دعوت دوں گا۔ چناں چہ اخیر تک وہ برابر اس پر عمل پیرا رہے۔

نبیٔ کریم ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے دورِ خلافت میں مرتدین کے فتنہ کو دفع کرنے کے لئے حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے لشکر کی جو مختلف ٹکڑیاں تیار کی تھیں، ان میں ایک لشکر کا امیر حضرت عکرمہ بن ابی جہل کو بنایا تھا۔ ان کی حالت

بڑی عجیب تھی کہ جب بھی قرآنِ پاک ہاتھ میں لیتے تھے تو یہ کہتے ہوئے ''ھٰذَا کِتَابُ رَبِّیْ، ھٰذَا کِتَابُ رَبِّیْ'' بے ہوش ہوجاتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ ہی کے دورِ خلافت میں واقعۂ اجنادین میں شہید ہوئے۔

حاصل کلام

میں تو یہ عرض کررہا تھا کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابوجہل جیسے آدمی کی برائی کرنے کی اجازت نہیں دیتے؛ تو پھر دوسرے مسلمان جو دنیا سے جاچکے ہیں ان کی برائی کرنے کی کیسے اجازت ہوگی؟ آج کل ہمارے معاشرہ میں یہ عادت بہت عام ہوچکی ہے کہ جو دنیا سے جاچکے ہیں ان پر بھی زبان درازیاں کی جاتی ہیں، جس کے نتیجہ میں آپس میں شدید اختلافات، سخت پھوٹ پھاٹ اور شقاق ونفاق پیدا ہوتا ہے۔ حالاں کہ شرعاً اس کی بالکل اجازت نہیں ہے۔

باب النهي عن الايذاء

کسی کو تکلیف پہنچانے کی ممانعت

قَالَ اللہ تَعَالَیٰ: وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَاناً وَإِثْماً مُبِيناً (الأحزاب:۵۸)

نیا باب قائم کیا جس کا عنوان ہے: ''کسی کو تکلیف پہنچانے کی ممانعت''۔

کسی کو تکلیف پہنچانا، چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم ہو، بلکہ جانوروں تک کو تکلیف پہنچانے سے منع کیا گیا ہے۔ اگر کوئی جانور ہمیں ایذاء پہنچاتا ہے تب تو اس کی ایذا سے بچنے کے لئے کوئی مناسب تدبیر اختیار کرنے کی اجازت دی گئی ہے، ورنہ اس کے بغیر کسی جانور کو بھی بلا وجہ تکلیف دینا جائز نہیں ہے، چہ جائیکہ انسان کو پہنچائی جائے۔

پہلا شعبہ: عبادات

دیکھئے! شریعت نے جو احکامات دیئے ہیں اصولی طور پر ان کو چار شعبوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ ایک شعبہ عبادات کا ہے، جس میں بندہ کا تعلق اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ رہتا ہے، اس کو مدنظر رکھ کر بندہ کے اس رشتہ اور تعلق کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مضبوط کرنے کے لئے مختلف طریقے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی شکل میں بتلائے گئے ہیں؛ یہ عبادات کا شعبہ کہلاتا ہے۔ اور دین صرف عبادات ہی تک محدود نہیں، ہم لوگوں نے اپنی کم علمی اور ناسمجھی کی وجہ سے دین کو صرف عبادات تک محدود سمجھا ہوا ہے، ایک آدمی اگر نماز پڑھتا ہے، روزے رکھتا ہے، نوافل، تسبیحات، تلاوت کا اہتمام کرتا ہے، تو وہ

بھی سمجھتا ہے کہ مَیں پورے دین پر عامل ہوں، حالاں کہ دین صرف عبادات کا نام نہیں ہے، عبادات تو دین کے چار حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔ اب اگر کوئی آدمی پابندی سے نماز پڑھتا ہے تو عبادات کے اندر بھی جو چار قسمیں نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ تھیں ان میں سے ایک کو اس نے لیا ہے، گویا دین کا چوتھائی حصہ عبادات ہے، پھر اس کا بھی چوتھائی حصہ، یعنی سولھواں حصہ، اور وہ بھی صرف نماز کی پابندی کر کے سمجھنا کہ میں پورے دین پر عمل کرتا ہوں؛ اس سے بڑی غلط فہمی کیا ہو سکتی ہے؟ اور دین کی اس سے زیادہ غلط تعبیر اور کیا کی جا سکتی ہے؟۔

بہر حال! ایک شعبہ عبادات کا ہے جو اپنی جگہ پر بڑا اہم ہے۔ اور میں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ دین کے تمام شعبے ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں، کسی بھی ایک شعبے کی کمی دوسرے پر اثر انداز ہوگی۔ اس لیے آدمی کسی ایک شعبہ کو اختیار کر کے اگر یوں سمجھے کہ میں پورے دین کو اختیار کئے ہوئے ہوں؛ تو یہ اس کی نادانی اور جہالت کی بات ہے۔

دوسرا شعبہ: اخلاق

دوسرا شعبہ اخلاق کا ہے یعنی آدمی کے دل میں مال کی محبت نہ ہو، دنیا کی محبت نہ ہو، کبر نہ ہو، غرور نہ ہو اور حسد نہ ہو، کینہ نہ ہو، اچھے اخلاق اس کے اندر ہوں، زہد اور دنیا سے بے رغبتی ہو، تواضع وانکساری ہو، یہ سارے دل کے اوصاف ہیں، ان کو اخلاق سے تعبیر کیا جاتا ہے؛ یہ بھی دین کا ایک شعبہ ہے۔ آج کل تو کوئی آدمی کسی سے ہنس مکھ بات کر لے تو اسی کو اخلاق سے تعبیر کیا جاتا ہے حالانکہ اخلاق سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔

تیسرا شعبہ: معاملات

تیسری چیز معاملات ہے۔کوئی چیز کسی سے خریدی یا کسی کو بیچی، کسی سے کرایہ داری کا کوئی معاملہ کیا، گروی رکھنے کا کوئی معاملہ کیا اور بھی جتنے معاملات ہیں، ان میں اگر کوئی آدمی کمزور ہے تو اس کا اثر بھی پورے دین کے اوپر پڑتا ہے۔اگر حلال وحرام کے اندر کوئی تمیز نہیں کی جاتی، کوئی آدمی اگر حرام استعمال کرتا ہے تو اس کی کوئی عبادت اور دعا قبول نہیں ہوگی۔

عبداللہ بن عمرؓ کی روایت میں تو یہاں تک ہے کہ کسی آدمی نے دس درہم کا کوئی کپڑا خریدا، اور اس میں نو درہم حلال کے ہیں اور ایک درہم حرام کا ہے، تو جب تک وہ کپڑا اس کے بدن پر رہے گا تب تک اس کی کوئی عبادت نفل یا فرض قبول نہیں ہوگی۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ معاملات کی کتنی اہمیت ہے۔جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم عبادات کا اہتمام کرتے ہیں اور پھر معاملات کی طرف سے غفلت برتتے ہیں تو جیسا کہ میں نے اوپر کہا کہ دین کے تمام شعبے ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں، اس لیے معاملات کی کمی کوتاہی اس کی عبادات کو بیکار کردے گی۔

چوتھا شعبہ: معاشرت

چوتھا شعبہ معاشرت کا ہے۔آدمی کو اللہ تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ وہ تنہا زندگی نہیں گزار سکتا، جب پیدا ہوتا ہے تو ماں باپ ہوتے ہیں، بھائی بہن ہوتے ہیں، پھر بڑا ہونے کے بعد شادی ہوتی ہے تو بیوی بچے وغیرہ دوسرے رشتہ داروں سے، پاس پڑوس میں رہنے والوں سے۔اور کاروباری نسبت سے جب باہر نکلتا ہے تو دوسرے

لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، تو ان تمام لوگوں کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے؟ اس میں بنیادی تعلیم یہ ہے کہ ایسا انداز اختیار کیا جائے کہ اس کی ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے؛ یہی معاشرت کی بنیاد ہے۔

معاشرت کا مطلب یہی ہے کہ زندگی میں جن لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، چاہے وہ ماں باپ ہوں، بیوی بچے ہوں، دوست احباب ہوں، یا کاروباری لائن کے دوست احباب ہوں؛ غرض یہ کہ جن جن لوگوں کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے، آدمی ان سبھی کے ساتھ ایسا رویہ اور انداز اختیار کرے کہ اس کی ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ اور اس سلسلہ میں شریعتِ مطہرہ نے قرآن واحادیث کے اندر بے شمار تعلیمات کے ذریعہ ایسی ہدایتیں دی ہیں کہ آدمی اگر ان ہدایتوں کو اختیار کرے تو ان شاء اللہ اس کی معاشرت کامیاب ہوسکتی ہے۔

اور یہ معاشرت کا شعبہ بھی بڑا اہم ہے۔ ہمارے اکابر میں حضرت حکیم الامت تھانویؒ اس کی طرف بڑی توجہ دلایا کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ مجھ سے بیعت کا تعلق رکھنے والوں میں سے کسی نے اگر معمولات میں کوتاہی کی ہے تو اس سے دل کو تکلیف تو ہوتی ہے کیوں کہ اس کی وجہ سے اس کا نقصان ہوتا ہے، لیکن اگر کوئی آدمی کسی دوسرے کو تکلیف پہنچاتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کے متعلق دل میں ایک نفرت سی پیدا ہوجاتی ہے کہ اس نے دوسرے کو تکلیف پہنچائی!

دوسروں کو تکلیف پہنچنے کے کچھ نمونے

یہاں علامہ نوویؒ نے یہی باب قائم کیا ہے: ایذاء اور تکلیف پہنچانے کی ممانعت کا بیان۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے قرآنِ پاک کی آیت پیش کی ہے۔ ہم

لوگ اعمال وافعال اور اپنے اقوال اور اپنی حرکتوں کے ذریعہ سے بہت سی مرتبہ نادانی میں بلکہ نادانستگی میں ایسا کچھ کرڈالتے ہیں جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہے:۔

بیچ راستہ میں ٹھہر کر باتیں کرنا

(۱) ایک آدمی اسکوٹر لے کر جارہا ہے اور سامنے دوسرا دوست اسکوٹر پر سوار ملا اور دونوں کو کچھ بات کرنی ہے تو وہیں بیچ راستہ میں دونوں نے اپنے اسکوٹر کھڑے کردئے اور آپس میں باتیں کرنے لگے۔ اب آپ اندازہ لگائیں کہ وہ تو یوں سمجھ رہے ہیں کہ ہم بات چیت کررہے ہیں، ابھی دومنٹ میں بات ختم ہوجائے گی، لیکن اس کی وجہ سے اِدھر بھی ٹریفک جام ہوگیا، اُدھر بھی ٹریفک جام ہوگیا؛ اس طرح صرف ایک آدمی کو نہیں، بلکہ بے شمار آدمیوں کو تکلیف ہوگئی۔

بے تکی پارکنگ

(۲) آپ نے اپنا اسکوٹر یا اپنی گاڑی بے تکی پارک کردی جس کی وجہ سے آنے جانے والوں کے لئے وہاں سے گزرنا مشکل ہوگیا، تو اس سے کتنے لوگوں کو تکلیف ہوگی، اور ایسے لوگوں کو تکلیف ہوگی کہ ہمیں معلوم بھی نہیں کہ ہماری اس حرکت سے کن لوگوں کو تکلیف پہنچی ہے، پھر بعد میں اگر ہمیں احساس بھی ہو کہ واقعۃً مجھ سے یہ بہت غلط ہوا اور لوگوں کو تکلیف پہنچی، اب اگر معافی بھی مانگنا چاہیں تو جن لوگوں کو تکلیفیں پہنچی ہیں وہ تو ہمارے علم میں نہیں ہیں، اور ہم جانتے بھی نہیں ہیں؛ تو پھر کہاں کہاں معافی مانگنے کے لئے جائیں گے۔ ہم سے یہ ایک ایسا گناہ ہوگیا ہے جس کی ہم سے تلافی ممکن ہی نہیں ہے۔

راستہ میں پنڈال

(۳) شادی کے موقعہ پر اس طرح پنڈال (منڈپ) باندھنا کہ آنے جانے والوں کے لئے راستہ بند ہو جائے۔ حالاں کہ راستہ ایک ایسی چیز ہے جس سے کسی کو روکا نہیں جا سکتا۔ بعض مرتبہ شہروں کے اندر تو ایسا ہوتا ہے کہ ایک اجنبی آدمی سواری لے کر آیا اور یہاں دیکھتا ہے کہ راستہ بند ہے، اب اس کو تو پتہ ہی نہیں ہے کہ دوسرا راستہ کہاں ہے جس کی وجہ سے اس کے گھنٹوں بے کار گزر جاتے ہیں، اور جس کام کے لئے آیا اس کا وہ کام رہ جاتا ہے۔ بعض مرتبہ سفر کے لئے کہیں آگے جانا ہے اور گاڑی چھوٹ جاتی ہے۔ بعض مرتبہ کسی دفتری کام کے لئے آیا ہے اور وہاں پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آتی اور دفتر بند ہو جاتا ہے۔

آپ لوگوں کو تو اس طرح کے حالات سے واسطہ پڑتا ہی رہتا ہے۔ جیسے: گنپتی وغیرہ کے موقع پر ایسا ہوتا ہے کہ اس گلی سے گذرو، تو وہاں راستہ بند ہے، دوسری گلی میں جاؤ، تو وہاں بھی یہی حال ہے، اور اس کی وجہ سے ٹریفک الگ جام ہو جاتا ہے۔ اب اگر یہی حرکت کوئی مسلمان بھی کرنے لگ جائے تو کیا نتیجہ ہوگا؟ حالاں کہ شریعت ہمیں ایسی تعلیم دیتی ہے کہ ایک مسلمان اس طرح سے زندگی گزارے کہ اس کی ذات سے کسی کو کوئی تکلیف پہنچنی ہی نہیں چاہیے۔ کسی مسلمان کو تکلیف پہنچانا حرام اور کبیرہ گناہ ہے، اور آج ہم نے اس کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔

زور سے ٹیپ بجانا

(۴) آپ اپنے گھر میں ٹیپ ریکارڈ بجا رہے ہیں، آپ نے تو کسی مولانا

صاحب کی تقریر کی کیسٹ ڈال دی اور آپ یوں سمجھ رہے ہیں کہ میں نیکی کا کام کر رہا ہوں، اور اتنی زور سے بجا رہے ہیں کہ برابر میں جس کا مکان ہے وہاں ایک آدمی بیمار ہے، اس کو رات بھر نیند نہیں آئی اور وہ نیند لانے کے لئے کوشش کر رہا تھا اور آپ نے یہ حرکت کی جس کی وجہ سے اس کی نیند میں حرج ہو رہا ہے، اگر آپ کو ٹیپ ریکارڈ ہی بجانا ہے تو آپ ایسے انداز سے بجاتے کہ آپ خود سن سکتے، دوسروں کو اس میں شریک کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور یہ نیکی نہیں ہے بلکہ نیکی کی نمائش ہونے کے ساتھ ساتھ دوسروں کی ایذاء رسانی ہے۔

میں نے یہ چند نمونے پیش کئے کہ بہت سی مرتبہ آدمی کسی کام کو نیکی سمجھ کر کرتا ہے اور حقیقت میں وہ گناہ ہوتا ہے، گویا آج ہم نے نیکی اور گناہ میں فرق کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔

معاشرت کو درست کرنے والی تعلیم

امام نووی ؒ نے باری تعالیٰ کا ارشاد پیش کیا ہے: جو لوگ ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں بغیر اس کے کہ انہوں نے کوئی ایسی حرکت کی ہو تو یقیناً ایسے لوگوں نے جھوٹ اور کھلا ہوا گناہ اُٹھایا ہے۔ مطلب یہ ہے جس کو تکلیف پہنچا رہے ہو اس نے کوئی ایسی حرکت کی تھی جس کی وجہ سے وہ ایسی ایذاء رسانی کا حقدار ٹھہرا تھا، مثلاً: اس نے آپ کو مارا اور آپ بدلہ کے طور پر اس کے ساتھ اتنا ہی معاملہ کر رہے ہیں تو اس کی تو شریعت نے اجازت دی ہے، لیکن اگر اس نے ایسا کوئی کام نہیں کیا ہے جس کی وجہ سے اس کو تکلیف پہنچائی جاسکے اس کے باوجود آپ اس کو اگر زبان سے تکلیف پہنچاتے ہیں تو یہ بہتان کا ارتکاب ہوا، اور اگر عمل سے تکلیف پہنچاتے ہیں تو وہ کھلم کھلا گناہ کے اندر داخل ہے۔ یہ آیت لا کر بتلانا چاہتے ہیں کہ کسی

کو بھی تکلیف پہنچانے کی ممانعت صرف حدیث ہی میں نہیں بلکہ قرآنِ پاک کی آیت سے بھی ثابت ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا معاشرت کو درست کرنے کے سلسلہ میں نبیٔ کریم ﷺ نے بے شمار ہدایات دی ہیں۔ روایتوں میں آتا ہے کہ اگر تین آدمی ہوں تو ایک کو چھوڑ کر دو آدمی آپس میں سرگوشی نہ کریں، اس لئے کہ جب دو آدمی آپس میں سرگوشی کریں گے تو تیسرے آدمی کو تکلیف پہنچے گی، وہ یوں سمجھے گا کہ میرے متعلق تو کوئی بات نہیں کر رہے ہیں۔

اُس زمانہ میں عام طور سے لوگ ہتھیار ساتھ لے کر چلتے تھے، اور لوگوں کے پاس تیر اور ترکش ہوا کرتے تھے (ترکش یعنی چمڑے کا وہ تھیلا جس میں تیر رکھے ہوئے ہوتے ہیں) اب اگر تیر اس تھیلے میں رکھے ہوئے ہیں تب تو ٹھیک ہے، لیکن بعض مرتبہ آدمی کسی ضرورت کے پیشِ نظر تیر نکال کر چلتا ہے، تو حدیث میں آتا ہے کہ آدمی اگر کسی مجمع میں سے گزر رہا ہو تو تیر کے نوکیلے حصہ کو سامنے کر کے نہ چلے، اسی طرح نیزے کو بھی سامنے کر کے نہ چلے؛ بلکہ تیر اور نیزے کو جھکا کر چلے، یعنی اس کا نوک والا حصہ جھکا ہوا ہو، اگر سامنے کر کے چلے گا تو جو آدمی دور سے آ رہا ہے اگر چہ آپ نے اس کو نیزہ نہیں مارا، لیکن وہ ڈر محسوس کرے گا۔ جیسے: بہت سی مرتبہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ سائیکل یا اسکوٹر پر کوئی آدمی لمبا پائپ لے کر جا رہا ہوتا ہے تو اس کو دیکھ کر ہمیں ڈر محسوس ہوتا ہے کہ شاید لگ نہ جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ کوئی بھی ایسی حرکت اور ایسا کوئی بھی انداز اختیار کرنا جس سے سامنے والے کو صرف خطرہ اور اندیشہ پیدا ہو کہ شاید مجھے لگ جائے گا؛ اس کی بھی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ معلوم ہوا کہ اس بات کا بھی اسلام نے کتنا خیال رکھا ہے اور نبیٔ کریم ﷺ

بھی اس کا بہت زیادہ اہتمام فرماتے تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کے بعد بھی ہم ان چیزوں کی طرف توجہ نہ کریں؛تو اس سے زیادہ نادانی اور کیا ہوسکتی ہے!۔

اور معاشرت کی درستگی کے سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو ہدایتیں ہیں ان میں بعض تو جزوی ہیں، اور بعض اصولی حیثیت رکھتی ہیں۔چناں چہ علامہ نووی رحمہ اللہ نے یہاں دو روایتیں پیش کی ہیں اور دونوں اصولی حیثیت کی حامل ہیں۔

اسلام کی بنیادی تعلیم

۱۵۶۵:-وعن عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ.وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ)).(متفق علیہ)

ترجمہ:-حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی ایذارسانیوں سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔اور مہاجر وہ ہے جو ہر ایسی چیز کو چھوڑ دے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔

افادات:-لفظ''مسلم'' کا مادّہ (سینؔ، لامؔ،میمؔ) یعنی سلامتی ہے،اسی سے لفظ مسلمان بنا ہے،معلوم ہوا کہ مسلمان کے ہاتھ اور زبان کی ایذاءرسانیوں سے دوسرے لوگ محفوظ ہوں گے۔اور یہاں زبان کا تذکرہ پہلے ہے،اس لئے کہ زبان سے گالی بھی دے سکتے ہیں،تہمت بھی لگا سکتے ہیں،غیبت بھی کی جاسکتی ہے،ٹھٹھا مذاق اور استہزاء بھی کیا جاسکتا ہے، یہاں تک کہ زبان نکال کر کسی کو اس طرح بتانا (چڑانا) جس سے سامنے والے کو تکلیف ہو تو یہ بھی زبان سے پہنچائی جانے والی تکلیفوں میں داخل ہے مطلب یہ ہے کہ زبان سے تکلیف پہنچانے کے جتنے بھی طریقے ہو سکتے ہیں وہ سب

اس میں داخل ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دوسرے اعضاء سے تکلیف پہنچائی جاسکتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ پاؤں سے لات مارنا جائز ہو، بلکہ دوسروں کو تکلیف پہنچانے کے لئے عام طور پر یہی دو اعضاء ''زبان اور ہاتھ'' زیادہ استعمال کئے جاتے ہیں، اگر کچھ طاقت ہو تو ہاتھ؛ ورنہ زبان استعمال کی جاتی ہے۔ اور زبان ایک ایسی چیز ہے کہ ہاتھ میں طاقت ہو یا نہ ہو، اگر کوئی اس کو استعمال کرے تو کوئی بھی روک نہیں سکتا اس لئے زبان کو پہلے ذکر کیا کہ عام طور پر جس کا ہاتھ نہیں چلتا اس کی زبان زیادہ چلتی رہتی ہے۔ تو زبان کی ایذاء رسانیوں سے بھی اپنے آپ کو بچانا ضروری ہے اور ہاتھ کی تکلیفوں سے بھی بچنا نہایت ضروری ہے۔ اور ہاتھ کے اندر دیگر تمام اعضاء آ گئے۔

شہری ہونے کی حیثیت سے ہماری ذمہ داری

اور مسلمان کا تذکرہ کیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ غیر مسلموں کو تکلیف پہنچانا جائز ہے، بلکہ ہم اس ملک میں غیر مسلموں کے ساتھ رہتے ہیں تو اس ملک کے شہری ہونے کی حیثیت سے ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم کسی کو بھی تکلیف نہ پہنچائیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہاں کے شہری ہونے کی حیثیت سے یہاں کی حکومت کے ساتھ اور یہاں کے رہنے والوں کے ساتھ عملی اور قانونی طور پر بھی ہمارا معاہدہ ہے کہ ہماری ذات سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچے گی۔ آج کل تو اسکول کی کتابوں میں شروع ہی میں لکھا ہوتا ہے کہ میں اس ملک کا شہری ہوں، کسی کو میری ذات سے تکلیف نہیں پہنچے گی۔ یہ ایک بنیادی تعلیم ہے، اور اسلام بھی اس کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے۔

میں دعویدار بنوں گا

اور مسلمان کا تذکرہ اس لئے بھی کیا گیا کہ عام طور پر مسلمان کی بود و باش اور

رہن سہن مسلمانوں کے ساتھ ہی ہوتا ہے، جیسا کہ مسلمانوں کے محلے ہوتے ہیں۔ تو جن کے درمیان میں آدمی رہتا ہے عام طور پر انہیں سے زیادہ واسطہ پڑتا ہے۔ تو جس طرح کسی مسلمان کو تکلیف پہنچانا ناجائز اور حرام ہے، اسی طرح کسی غیر مسلم کو بھی تکلیف پہنچانا ناجائز اور حرام ہے، بلکہ اگر وہ غیر مسلمین اسلامی حکومت کے اندر رہتے ہوں تو ان کو تکلیف پہنچانے کا معاملہ اور زیادہ خطرناک ہوجاتا ہے، اس لیے کہ اُن کے متعلق تو حدیثِ پاک میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہاں تک فرماتے ہیں کہ کسی غیر مسلم کے ساتھ اگر کسی مسلمان نے تکلیف پہنچانے کا معاملہ کیا تو قیامت کے دن میں اس کی طرف سے دعویدار بنوں گا (ابوداؤد شریف) اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کو کتنی اہمیت دی گئی ہے۔

بہر حال! اسلام کی بنیادی تعلیم ہے کہ کسی کو ہماری ذات سے کسی بھی طرح سے تکلیف نہ پہنچے۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اصولی طور پر بتلادیا کہ ایسا آدمی کامل مسلمان کہلانے کا حقدار ہی نہیں جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچے۔ ویسے یہ بات نہیں ہے کہ اگر کوئی آدمی تکلیف پہنچائے گا تو وہ اسلام سے نکل جائے گا، کوئی بھی اس کے کافر یا غیر مسلم ہونے کا فتویٰ نہیں دے گا، لیکن اللہ تعالیٰ نے جب آپ کو ''مسلم'' کا اتنا بہترین لقب دیا ہے تو اس کا تقاضہ یہ ہے کہ آپ کی ذات سے ہر ایک کو امن وامان اور سلامتی ملنی چاہیے۔

شرعی ہجرت

''ہجرت'' کے معنیٰ ہیں ''چھوڑنا''۔ شریعت کی اصطلاح میں ہجرت اس کو کہتے ہیں کہ ایسی جگہ جہاں رہتے ہوئے شریعت کے احکام پر عمل کرنا ممکن نہ ہو، اس کو چھوڑ کر ایسی جگہ کی طرف منتقل ہوجانا جہاں رہ کر شریعت کے احکام پر عمل کرسکتے ہوں

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ مکرمہ میں جب ایمان واسلام کی دعوت شروع کی تو تیرہ سال آپ کا قیام مکہ ہی میں رہا، لیکن وہاں پر رہتے ہوئے آپ کو ایذاؤں کا معاملہ پیش آیا اور مکہ والوں نے دین پر عمل کرنے کے مواقع میسر نہیں آنے دیئے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو حکم دیا گیا کہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے جائیں، آپ کے مدینہ منورہ تشریف لے جانے کے بعد مکہ مکرمہ کا کوئی آدمی اگر ایمان لاتا تھا تو اس کے ایمان کے قبول ہونے کی شرط یہ تھی کہ وہ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آجائے، اس لئے کہ مکہ میں رہتے ہوئے اس کے لئے اسلامی احکام پر عمل کرنا ممکن نہیں تھا، اور یہ حکم مکہ مکرمہ فتح ہونے تک باقی رہا۔ ۸ سنہ ھ میں جب مکہ مکرمہ فتح ہو کر اسلامی حکومت کا حصہ بن گیا، اس کے بعد ہجرت کا وہ حکم باقی نہیں رہا۔ اسی لئے حدیث میں آتا ہے:

''لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ'' مکہ مکرمہ کے فتح ہونے کے بعد ہجرت کا وہ حکم (مکہ مکرمہ سے ہجرت کا ضروری ہونا) باقی نہیں رہا، لیکن آج بھی نفسِ ہجرت کا حکم باقی ہے۔ آج بھی اگر کوئی آدمی کسی ایسے ملک میں رہتا ہے جہاں ملکی قوانین کے پیشِ نظر نماز پڑھنا اور اسلامی احکام پر عمل کرنا ممکن نہ ہو، تو اس کے لئے وہاں سے ہجرت کر کے کسی ایسی جگہ جانا ضروری ہے جہاں اسلامی احکام پر عمل کرنا ممکن ہو۔ ویسے الحمد للہ آج کل تو کہیں بھی ایسا نہیں ہے، اس لیے کہ پوری دنیا کے انٹرنیشنل آپسی معاہدہ کے نتیجہ میں آپ کسی بھی ملک میں رہتے ہوئے اطمینان سے اپنی نماز ادا کر سکتے ہیں، زکوٰۃ کی ادائیگی میں آپ کے لئے کوئی رُکاوٹ نہیں ہے، روزوں کا رکھنا آپ کے لئے آسان ہے، اسلامی احکام پر عمل کرنے میں عام طور پر کہیں کوئی دشواری نہیں ہے۔ کسی ملک کا قانون جو کچھ بھی ہو؛ لیکن آپ اپنے اسلامی احکام پر عمل کر سکتے ہیں، جیسے: اگر میاں بیوی کے آپس میں

جھگڑے ہوں اور طلاق کا معاملہ پیش آئے، اور عورت اگر چاہے تو کورٹ میں جا کر دعویٰ دائر کرے، لیکن وہ خود اسلامی قانون پر عمل کرنا چاہے تو کوئی قانون اس کو زبردستی پکڑ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم یہاں آؤ اور اپنے شوہر کے خلاف دعویٰ دائر کرو۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ کسی جگہ رہ کر اگر اسلامی احکام پر عمل کرنا ممکن ہے تو اس صورت میں ہجرت کرنا ضروری نہیں ہے۔ اور اگر خدانخواستہ کسی جگہ کے رہنے والوں پر حکومت پابندی لگاتی ہے کہ تم ہمارے یہاں رہتے ہوئے نماز نہیں پڑھ سکتے تو پھر اس صورت میں اس جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا ضروری ہو جائے گا؛ اسی کو ''شرعی ہجرت'' کہتے ہیں۔

حقیقی ہجرت

لیکن اس روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ حقیقی معنیٰ میں مہاجر کہلانے کا حقدار وہ آدمی ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔ اسی لئے علماء لکھتے ہیں کہ ''وطنِ طبیعت سے وطنِ شریعت کی طرف منتقل ہو جائے'' اس کو اس طرح بھی تعبیر کیا گیا ہے کہ ''مَن چاہی چھوڑ کر رَب چاہی اختیار کرنا''، حقیقی معنیٰ میں ہجرت ہے۔ اب اگر آدمی ایک ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملک چلا جائے لیکن وہاں جانے کے بعد بھی من چاہی پر ہی عمل کرتا ہے، اللہ کے احکام کو بجا نہیں لاتا، اللہ کی منع کی ہوئی چیزوں پر عمل کرتا ہے؛ تو ایسی ہجرت کا کیا مطلب ہوا؟ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ حقیقی معنیٰ میں مہاجر وہی ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔ جیسے کامل مسلمان کہلانے کا حقدار وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی تکلیفوں سے دوسرے لوگ محفوظ رہیں، ایسے ہی کامل مہاجر کہلانے

کا حقدار وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔

جو آدمی یہ پسند کرتا ہو

۱۵۶۶:-وعنه قَالَ: قَالَ رسولُ اللهِ ﷺ: مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُزَحْزَحَ عَنِ النَّارِ، ويُدْخَلَ الجَنَّةَ، فَلْتَأْتِهِ مَنِيَّتُهُ وَهُوَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَاليَوْمِ الآخِرِ، وَلْيَأْتِ إِلَى النَّاسِ الَّذِي يُحِبُّ أَنْ يُؤْتَى إِلَيْهِ. (رواه مسلم)

وَهُوَ بعض حديثٍ طويلٍ سبق في بابِ طاعَةِ وُلاَةِ الأُمُورِ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی یہ پسند کرتا ہو کہ جہنم سے اس کو دور کر دیا جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے؛ اس کو چاہیے کہ ایسی حالت میں اس کی موت آئے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اور وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ ایسا معاملہ کرے جیسا وہ اپنے لیے لوگوں سے کروانا چاہتا ہے۔

افادات:- قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ﴾ تمہاری موت ایسی حالت میں آئے کہ تم مسلمان ہو۔ اب ظاہر ہے کہ جو آدمی چوبیس گھنٹے اسلام پر قائم اور باقی رہنے اور اسلام کے اعمال پر عمل کرنے کا اہتمام کرتا ہو، اس کو کسی بھی وقت موت آئے گی تو اسلام و ایمان کی حالت ہی میں آئے گی۔ اس روایت میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ آپ چوبیس گھنٹے اسلام اور ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے کا اہتمام کیجیے، اگر کوئی آدمی ایمان کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا اور خدا نہ کرے اسی وقت موت آ گئی تو پھر ایمان پر موت آئی ہوئی نہیں کہلائے گی۔

معاشرت کو درست کرنے والی اصولی تعلیم

"وَلْيَأْتِ إِلَى النَّاسِ الَّذِي يُحِبُّ أَنْ يُؤْتَى إِلَيْهِ" یہ بھی ان اصولی تعلیمات

میں سے ہے جو معاشرت کو درست کرنے کے لئے نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمائی ہے کہ: آپ جب کسی کے ساتھ کوئی معاملہ کر رہے ہوں تو پہلے سوچ لیجئے کہ اگر میرے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جائے؛ تو کیا میں اس کو اپنے لئے پسند کروں گا؟ اگر اپنے لئے پسند کرتے ہیں تو پھر سامنے والے کے ساتھ بھی وہ معاملہ کیجئے، ورنہ جس سلوک کو آپ اپنے ساتھ کیا جانا پسند نہیں کر رہے ہیں، تو پھر دوسرے کے ساتھ کیوں وہ سلوک کرتے ہیں؟۔

جیسے: اگر آپ کی بیٹی کسی کے یہاں بیاہ کر گئی ہے، اور اس کے ساتھ اس کے سسرال والے کوئی ایسا معاملہ کرتے ہیں جو آپ کو پسند نہیں آتا ہے، تو آپ دوسرے کی بیٹی جو آپ کے گھر میں بہو (یعنی اپنے بیٹے کی بیوی) بن کر آئی ہے، اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کیوں کرتے ہیں؟۔

آپ دوسروں کے ساتھ عزت و توقیر کا معاملہ نہیں کر رہے ہیں، بلکہ ایسا توہین آمیز معاملہ کر رہے ہیں کہ اگر وہی معاملہ آپ کے ساتھ کیا جاتا تو آپ اس کو اپنے لئے گوارا نہیں کرتے۔ بخاری شریف میں حضرت انس بن مالک ؓ کی روایت ہے نبیٔ کریم ﷺ فرماتے ہیں: ''لَا یُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِأَخِیْهِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِهٖ'' تم میں سے کوئی آدمی اس وقت تک کامل مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی چیز پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ گویا اس کو ایمانِ کامل کی علامت بتلایا گیا۔ اور اگر ایسی بات نہیں ہے تو حضور کے ارشاد کے مطابق وہ ایمان والا نہیں ہے۔

کون ہے جو مجھ سے یہ چیزیں حاصل کرے؟

یہ ایسی بنیادی تعلیم ہے جس کی طرف نبیٔ کریم ﷺ نے مختلف طریقوں اور مختلف انداز سے متوجہ کیا ہے۔

چناں چہ ترمذی شریف میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا: ''مَنْ يَأْخُذُ عَنِّي هَؤُلَاءِ الْكَلِمَاتِ، فَيَعْمَلُ بِهِنَّ، أَوْ يُعَلِّمُ مَنْ يَعْمَلُ بِهِنَّ؟'' کون ہے جو مجھ سے یہ چیزیں حاصل کرے، پھر خود اس پر عمل کرے، یا کسی دوسرے کو سکھلائے جو اس پر عمل کرے؟ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں اس کے لئے تیار ہوں۔ چناں چہ نبیٔ کریم ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا اور پانچ چیزیں گنوائیں(۱)۔

سب سے بڑا عبادت گزار

پہلی چیز فرمائی: ''اتَّقِ الْمَحَارِمَ تَكُنْ أَعْبَدَ النَّاسِ'' اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بچو، تم سب سے بڑے عبادت گزار قرار دیئے جاؤ گے۔ سب سے بہترین عبادت یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے اپنے آپ کو بچائے۔

دیکھو! عبادتیں کر لینا آسان ہے، جیسے: بڑی راتیں آتی ہیں تو جو لوگ دن

---

(۱) حَدَّثَنَا بِشْرُ بْنُ هِلَالٍ الصَّوَّافُ الْبَصْرِيُّ حَدَّثَنَا جَعْفَرُ بْنُ سُلَيْمَانَ عَنْ أَبِي طَارِقٍ عَنِ الْحَسَنِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: مَنْ يَأْخُذُ عَنِّي هَؤُلَاءِ الْكَلِمَاتِ فَيَعْمَلُ بِهِنَّ أَوْ يُعَلِّمُ مَنْ يَعْمَلُ بِهِنَّ. فَقَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ: فَقُلْتُ أَنَا يَا رَسُولَ اللهِ. فَأَخَذَ بِيَدِي فَعَدَّ خَمْسًا وَقَالَ: اتَّقِ الْمَحَارِمَ تَكُنْ أَعْبَدَ النَّاسِ، وَارْضَ بِمَا قَسَمَ اللهُ لَكَ تَكُنْ أَغْنَى النَّاسِ، وَأَحْسِنْ إِلَى جَارِكَ تَكُنْ مُؤْمِنًا، وَأَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ تَكُنْ مُسْلِمًا، وَلَا تُكْثِرِ الضَّحِكَ فَإِنَّ كَثْرَةَ الضَّحِكِ تُمِيتُ الْقَلْبَ.

(ترمذی، باب مَنِ اتَّقَى الْمَحَارِمَ فَهُوَ أَعْبَدُ النَّاسِ، حدیث نمبر: ۲۴۷۵)

قَالَ أَبُو عِيسَى هَذَا حَدِيثٌ غَرِيبٌ لَا نَعْرِفُهُ إِلَّا مِنْ حَدِيثِ جَعْفَرِ بْنِ سُلَيْمَانَ. وَالْحَسَنُ لَمْ يَسْمَعْ مِنْ أَبِي هُرَيْرَةَ شَيْئًا هَكَذَا رُوِيَ عَنْ أَيُّوبَ وَيُونُسَ بْنِ عُبَيْدٍ وَعَلِيِّ بْنِ زَيْدٍ قَالُوا لَمْ يَسْمَعِ الْحَسَنُ مِنْ أَبِي هُرَيْرَةَ. وَرَوَى أَبُو عُبَيْدَةَ النَّاجِيُّ عَنِ الْحَسَنِ هَذَا الْحَدِيثَ قَوْلَهُ وَلَمْ يَذْكُرْ فِيهِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ.

بھر جوا کھیلتے ہیں وہ بھی غسل کر کے، نہا دھو کر، اچھے کپڑے پہن کر پہلی صف میں براجمان ہو جاتے ہیں، روزانہ کے مسجد میں آنے والے بھی اگر ذرا چُوک جاتے ہیں تو اُن کی پہلی صف چلی جاتی ہے۔ اس لئے اس دن روز مرہ والوں کو بھی ذرا اہتمام کرنا پڑتا ہے کہ کہیں پہلی صف نہ چلی جائے، اور پھر وہ لوگ رات بھر عبادت کا اہتمام کر لیتے ہیں، لیکن دوسرے دن سے پھر وہی غفلت کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور گناہوں سے بچنے کا کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا۔

اگر کوئی آدمی نفل عبادت کرے تو اس پر ثواب ہے، اور اگر نہ کرے تو کوئی گناہ نہیں، لیکن اگر کوئی آدمی ناجائز اور گناہ کے کام کرے گا تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت ہے۔

سب سے بڑا مالدار

دوسری چیز ارشاد فرمائی: ”وَارْضَ بِمَا قَسَمَ اللّٰہُ لَكَ تَكُنْ أَغْنَى النَّاسِ“ اللہ تعالیٰ نے قسمت میں تمہارے لئے جو کچھ لکھ دیا ہے، تمہارے حصہ میں جو طے کر دیا ہے، اس پر راضی رہو؛ تم سب سے بڑے مالدار بن جاؤ گے۔ یعنی قناعت حاصل کر لو؛ تم سب سے بڑے مالدار ہو جاؤ گے۔ اس لیے کہ اصل مالداری دل کی مالداری ہے: ”لَيْسَ الْغِنَى عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ، وَلَكِنَّ الْغِنَى غِنَى النَّفْسِ“ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: سامان کی زیادتی کا نام مالداری نہیں ہے، بلکہ مالداری تو دل کی ایک خاص صفت کو کہتے ہیں۔ بہت سی مرتبہ ایک آدمی کے پاس لاکھوں اور کروڑوں روپیے موجود ہوتے ہیں، لیکن اس کے دل میں سکون نہیں ہوتا، دل میں استغناء کی کیفیت نہیں ہوتی؛ اس کا نام مالداری نہیں ہے۔ اور ایک آدمی کے پاس ایک پائی بھی نہیں ہے لیکن وہ دل

سے مستغنی ہے، اس کو کسی سے کوئی لینا دینا نہیں ہے؛ تو یہ بڑا مالدار کہلائے گا۔

تم مؤمن کہلاؤ گے

تیسری چیز فرمائی: ''وَأَحْسِنْ إِلَى جَارِكَ تَكُنْ مُؤْمِنًا'' اپنے پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرو؛ تم مؤمن کہلاؤ گے۔ گویا ایمان کی علامت پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ہے۔

تم مسلمان کہلاؤ گے

چوتھی چیز فرمائی: ''وَأَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ تَكُنْ مُسْلِمًا'' تم لوگوں کے لئے وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو؛ تو تم مسلمان کہلاؤ گے۔ میں یہی بتلانا چاہتا ہوں۔

ویسے اسلام اور ایمان دونوں کا مفہوم لفظی اعتبار سے الگ الگ ہے، دل سے ماننے کی جو چیزیں ہوتی ہیں اسے ایمان سے تعبیر کیا گیا، جیسے: آخرت پر ایمان لانا، قیامت پر ایمان لانا، اللہ کی وحدانیت پر ایمان لانا، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کو ماننا، اور عملی طور پر کرنے کی جتنی بھی چیزیں ہیں اس کو اسلام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گویا انقیادِ باطنی؛ ایمان ہے، اور انقیادِ ظاہری؛ اسلام ہے۔ لیکن دونوں لفظ ایسے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے اوپر بولے جاتے ہیں۔

زیادہ ہنسنا دل کو مار دیتا ہے

اور پانچویں چیز ارشاد فرمائی: ''وَلَا تُكْثِرِ الضَّحِكَ فَإِنَّ كَثْرَةَ الضَّحِكِ تُمِيتُ الْقَلْبَ'' اور زیادہ مت ہنسا کرو، اس لئے کہ زیادہ ہنسنا دل کو مار دیتا ہے، دل

میں آخرت کی یاد باقی نہیں رہتی۔ حضورِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں: یَا أُمَّةَ مُحَمَّدٍ! وَاللّٰہِ لَوْ تَعْلَمُونَ مَا أَعْلَمُ لَبَکَیْتُمْ کَثِیْرًا وَلَضَحِکْتُمْ قَلِیْلاً'' آخرت میں پیش آنے والے حالات جو میں جانتا ہوں اگر تم بھی جاننے لگو؛ تو تم روؤ زیادہ، اور ہنسو کم۔

ائمۂ حدیث کی منظورِ نظر روایت

میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ اس روایت کے اندر بھی نبیٔ کریم ﷺ نے خاص طور پر یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اپنے لئے جو پسند کرتے ہو وہی لوگوں کے لئے بھی پسند کرو، اسی لئے ائمۂ حدیث نے اسلام کی بنیادی تعلیمات کے اندر نبیٔ کریم ﷺ کی اس حدیث کو خصوصی حیثیت اور مقام دیا ہے۔ امام نسائیؒ حدیث کے بڑے امام اور ماہر محدث گزرے ہیں، ان کی لکھی ہوئی کتاب ''سنن صغریٰ'' کو ہمارے یہاں مدرسوں کے اندر ''سنن نسائی'' کے نام سے پڑھایا جاتا ہے۔ صحاحِ ستہ یعنی وہ چھ کتابیں جن میں صحیح روایات جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے ان میں اس کا بھی شمار ہوتا ہے، ان کی دوسری کتاب ''سنن النسائی الکبریٰ'' ہے جس میں انہوں نے گیارہ ہزار سات سو ستر (۱۱۷۷۰) روایات جمع کی ہیں، اس میں آخری حدیث یہی ہے: ''لَا یُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِأَخِیْهِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِهٖ'' تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک اپنے بھائی کے لئے بھی وہی چیز پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

امام ابوداود رحمۃ اللہ علیہ کے مناقب

امام ابوداود رحمۃ اللہ علیہ حدیث کے بڑے امام گزرے ہیں، ان کے بارے میں محدث ابراہیم حربی- جو بڑے محدث گزرے ہیں- فرماتے تھے کہ: اللہ تعالیٰ نے

علمِ حدیث کو امام ابوداودؒ کے لئے ایسا ہی نرم کر دیا جیسا کہ حضرت داود علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے لوہا نرم کیا گیا تھا۔

ایک اور محدث موسیٰ بن ہارون ان کے متعلق فرماتے تھے کہ: امام ابوداود دنیا میں حدیث کے لئے اور آخرت میں جنت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ تقویٰ کے اعتبار سے بھی ان کا مقام بہت اونچا تھا۔ ان کی ایک آستین بڑی تھی اور دوسری چھوٹی تھی، اور اس زمانہ میں آستین میں جیب ہوتی تھی۔ کسی نے پوچھا: ایسا کیوں ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ: اس میں چیزیں رکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے اس لئے اس کو بڑا رکھا ہے، دوسری میں اس کی ضرورت نہیں تو بلاوجہ اس کو کیوں بڑا رکھوں؟ اس لیے کہ یہ بھی فضول خرچی ہے۔

ایک درہم میں جنت

ایک مرتبہ ایک بڑی کشتی میں تشریف لے جا رہے تھے، کنارے پر ایک آدمی کو چھینک آئی، اس نے الحمدللہ کہا۔ تو مسئلہ یہ ہے کہ کسی کو چھینک آئے اور وہ الحمدللہ کہے تو جو مسلمان اس کی الحمدللہ سنے اس کو چاہیے کہ جواب میں یرحمک اللہ کہے، امام ابوداود ایک بڑی کشتی میں جا رہے تھے، اس چھینک کھانے والے نے الحمدللہ کہا، اس درمیان میں ان کی کشتی آگے بڑھ گئی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اس کا جواب اگر یہاں سے دوں گا تو وہاں تک آواز نہیں پہنچے گی، تو اس بڑی کشتی میں سے ایک چھوٹی کشتی ایک درہم سے کرایہ پر لی۔ جنہوں نے اسٹیمروں میں سفر کیا ہے ان کو معلوم ہے کہ آج کل بھی اس میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں ہوتی ہیں، جیسے: ہوائی جہاز میں پیراشوٹ ہوتا ہے، تاکہ اگر حادثہ پیش آجائے اور سمندر میں کودنے کی نوبت آجائے تو چھوٹی کشتیاں کام دے سکیں۔ خیر! امام ابوداودؒ نے ایک چھوٹی کشتی ایک درہم پر کرایہ پر لی اور اس میں بیٹھ کر

کنارے پر پہنچے اور جا کر اس آدمی کو یرحمک اللہ کہا۔ خیر! وہ اس کشتی کو واپس لے کر پھر بڑی کشتی میں سوار ہونے کے لئے آ گئے۔ لوگوں نے پوچھا: آپ نے اتنا زیادہ اہتمام کیوں کیا؟ تو امام ابوداود نے جواب میں کہا: میں نے سوچا کہ جس نے چھینک کھائی تھی وہ اللہ کا ایک بندہ ہے، میں جب اس کو یرحمک اللہ کہوں گا اور اس کے جواب میں وہ ''یَھْدِیْکَ اللّٰہُ'' کہے گا، اور ہوسکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مستجاب الدعوات ہو؛ تو میرا کام بن جائے گا۔ چناں چہ اسی کشتی میں ابھی سفر جاری تھا، کچھ لوگوں پر غنودگی طاری ہوئی تو کسی نے خواب میں دیکھا، کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے: ابوداود نے ایک درہم میں جنت خرید لی۔

دیکھو! ان حضرات کی نگاہیں کہاں تک پہنچتی تھیں اور ایسی چیزوں کے وہ کتنے حریص ہوا کرتے تھے؟ جیسے ہم لوگ دنیا کے لالچی ہیں، وہ آخرت کے لالچی تھے۔

دین پر عمل کے واسطے چار حدیثیں کافی ہیں

امام ابوداودؒ بڑے محدث تھے اور بڑے بزرگ بھی تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پانچ لاکھ حدیثیں لکھیں، پھر ان پانچ لاکھ حدیثوں میں سے انتخاب کر کے اپنی کتاب ''سنن ابی داود'' میں چار ہزار آٹھ سو روایتیں ہیں، ایک عقلمند اور سمجھدار آدمی کے لئے دین پر عمل کے واسطے چار حدیثیں کافی ہیں۔ ان چار میں سے پہلی روایت حضرت عمرؓ سے منقول ہے: إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِءٍ مَا نَوَى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ لِدُنْيَا يُصِيبُهَا أَوِ امْرَأَةٍ يَتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ '' اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے، اور آدمی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی کے مطابق معاملہ

ہوتا ہے جیسی اس کی نیت ہو، پس جس شخص کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہو (یعنی اللہ اور اس کے رسول کی خاطر ایک جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ گیا) تو حقیقت میں بھی اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لئے کہلائے گی اور جس کا ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا دنیا حاصل کرنے کے لئے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے ہوگا تو اس کی جیسی نیت ہے ویسا ہی معاملہ ہوگا۔

دوسری روایت حضرت نعمان بن بشیرؓ کی ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا:
اَلْحَلَالُ بَیِّنٌ وَالْحَرَامُ بَیِّنٌ وَبَیْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ لَا یَعْلَمُهَا کَثِیْرٌ مِنَ النَّاسِ فَمَنِ اتَّقَی الشُّبُهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِیْنِهٖ '' حلال بھی کھلا ہوا ہے اور حرام بھی کھلا ہوا ہے، اور ان کے بیچ میں کچھ چیزیں مشتبہ ہیں (جن میں یہ احتمال ہے کہ ہوسکتا ہے وہ حلال ہوں اور ہوسکتا ہے حرام ہوں) پس جو آدمی ایسی چیزوں سے اپنے آپ کو بچائے گا اس نے اپنے دین کی حفاظت کرلی۔

تیسری روایت ہے: ''مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهٗ مَا لَا یَعْنِیْهِ'' آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی اور بیکار چیز (جو دنیا و آخرت کے اعتبار سے کوئی کام کی چیز نہ ہو) چھوڑ دے۔

اور چوتھی روایت یہی ہے: ''لَا یَکُوْنُ الْمَرْءُ مُؤْمِنًا حَتّٰی یَرْضٰی لِأَخِیْهِ مَا یَرْضٰی لِنَفْسِهٖ'' تم میں سے کوئی آدمی مؤمن نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی چیز پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ کا مقولہ

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ: پہلی روایت

اعمال اور عبادات کی درستگی کے لئے کافی ہے۔ اور دوسری روایت معاملات کی درستگی کے لئے کافی ہے۔ اور تیسری روایت زندگی کے اوقات کو صحیح استعمال کرنے کے لئے اور اس کی قدر و قیمت پہچاننے کے لئے کافی ہے۔ اور چوتھی روایت معاشرت کی درستگی اور آپس کے تعلقات کی استواری کے لئے کافی ہے۔

سماج قابلِ رشک بن جائے

آج اگر ہم میں سے ہر آدمی اس بات کا اہتمام کر لے کہ ''جو معاملہ میرے ساتھ ہو رہا ہے، اگر مَیں اس کو اپنے لئے پسند نہیں کرتا، تو پھر ویسا ہی معاملہ میں کسی دوسرے کے ساتھ بھی نہ کروں؛ تو مَیں سمجھتا ہوں کہ دنیا میں کہیں کوئی جھگڑا نہیں ہوگا، اور ہماری معاشرت قابلِ رشک بن جائے گی۔

امام غزالیؒ نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک بزرگ تھے، ان کے یہاں چوہے بہت زیادہ ہو گئے، ایک مرتبہ انہوں نے اپنی مجلس میں کہا کہ چوہوں کی وجہ سے بڑی تکلیف ہے۔ کسی نے کہا: حضرت! ایک بلی پال لیجئے، ان چوہوں سے نجات مل جائے گی۔ خیر! بات آئی گئی ہو گئی۔ کچھ دنوں کے بعد انہوں نے دوبارہ پھر وہی کہا: چوہوں کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ جن صاحب نے بلی کا مشورہ دیا تھا انہوں نے بڑے زور سے کہا: حضرت! آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ ایک بلی پال لیجئے، لیکن آپ بلی تو پالتے نہیں۔ اس پر ان بزرگ نے جواب دیا: بلی تو پال لوں لیکن ڈر یہ ہے کہ جب بلی میرے گھر میں آئے گی تو اس کو دیکھ کر چوہے میرا گھر چھوڑ کر پڑوسی کے گھر میں چلے جائیں گے، اور جب ان چوہوں کو میں اپنے گھر کے لئے پسند نہیں کرتا تو پڑوسی کے گھر کے لئے کیسے پسند کر سکتا ہوں، جبکہ نبیٔ کریم ﷺ کا ارشاد ہے: تم میں

سے کوئی آدمی مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہو۔

علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ عمل

ہمارے تمام اسلاف اور اکابر کا طرزِ عمل یہی تھا۔ ہمارے بزرگوں میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ گزرے ہیں، ان کے حالات میں حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جس زمانہ میں حضرت کا قیام ڈابھیل میں تھا، اِس وقت اساتذہ جہاں رہتے ہیں اس کے سامنے بیت الخلاء ہیں، پرانے پڑھے ہوؤں کو معلوم ہے کہ وہ اُسی زمانہ میں بنے تھے، لیکن اُس زمانہ میں اندر پانی کا نل نہیں تھا، باہر سے پانی لے کر جانا پڑتا تھا۔ تو حضرت علامہ استنجاء سے فارغ ہونے کے بعد باہر سے بار بار لوٹا بھر کر اندر پانی ڈالتے تھے۔ کسی نے وجہ پوچھی تو فرمایا: بدبو زائل کرنے کے لئے ایسا کرتا ہوں۔ کوئی آدمی فلش والے بیت الخلاء میں پہلے گیا ہو اور اس نے اگر پانی برابر استعمال نہ کیا ہو تو بعد میں جانے والے کو بدبو کا احساس ہوتا ہے، اور یہ بدبو اس کے لئے بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ باہر سے بار بار پانی لے جا کر صرف اس لئے ڈالتے تھے کہ بعد میں آنے والے کو تکلیف نہ ہو۔ اللہ کے ایسے بندے بھی گزرے ہیں۔

دلِ دشمنانِ ہم نہ کردند تنگ

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے گلستاں کے اندر ایک واقعہ ذکر کیا ہے کہ:۔

ایک مرتبہ ایک اللہ والے کے یہاں چور آ گیا، ان کے گھر میں تو کچھ تھا نہیں،

صرف ایک گدڑی تھی اسی کو آدھی بچھا کر اور آدھی اوڑھ کر سوئے ہوئے تھے، چور دروازے سے گھسا اور پورا گھر گھوما لیکن اس کو کوئی چیز چوری کے لائق نہیں ملی۔ وہ بزرگ دیکھ رہے تھے، انہوں نے سوچا کہ یہ چور میرے گھر میں آیا ہے لیکن اس کے کام کی کوئی چیز ہے نہیں، لہٰذا جب وہ دوسری طرف گیا تو انہوں نے اپنی وہی گدڑی نکال کر اس کے راستہ میں ڈال دی کہ بیچارہ امید لے کر میرے گھر میں آیا ہے، محروم اور خالی ہاتھ نہ لوٹے۔ چناں چہ چور اُسی کو لے کر چلا گیا، یہ قصہ بیان کرنے کے بعد شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

شنیدم کہ مردانِ راہِ خدا  دلِ دشمناں ہم نہ کردند تنگ

تُرا کے میسر شود ایں مقام  کہ با دوستانت خلافست و جنگ

ہم نے سنا ہے کہ اللہ والوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ دشمن کا بھی دل دُکھایا نہیں کرتے۔ اے مخاطَب! تجھ کو یہ مقام کیسے حاصل ہوسکتا ہے کہ تیری تو اپنے ہی دوستوں کے ساتھ لڑائی چلتی ہے۔

آج ہمارا حال یہی ہے کہ دوسروں کی بات چھوڑیئے، خود ہمارے ماں باپ، ہمارے بھائی بہن، ہماری بیوی اور اولاد، ہمارے متعلقین اور رشتہ دار ہم سے تنگ ہیں اور پناہ مانگتے ہیں؛ پھر یہ مقام کیسے حاصل ہوسکتا ہے!۔ضرورت اس بات کی ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان تعلیمات کو عام کیا جائے اور ان پر عمل کا اہتمام کیا جائے۔ آج کا مسلمان اگر اسی بات کو اپنا لے تو مَیں سمجھتا ہوں کہ پھر اسلام کی دعوت دینے کے لئے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

النھی عن التباغض والتقاطع والتدابر

آپس میں بغض اور دشمنی، کینہ اور قطع تعلق کی ممانعت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ.

أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ.

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ.

نیا عنوان قائم کیا ہے: آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بغض، دشمنی، کینہ اور قطع تعلق کرنے کی ممانعت۔

بڑے مبارک ہیں وہ لوگ

''تباغض'' کا مطلب یہ ہے کہ کبھی کسی آدمی پر غصہ آیا اور اپنے غصہ کے تقاضہ کو پورا نہ کر سکنے کی وجہ سے دل ہی دل میں گھٹتا رہے، اور اس کی وجہ سے اس آدمی کے متعلق دل میں نفرت اور دشمنی پیدا ہو جائے؛ اسی کو کینہ اور بغض سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ دل کا ایک عمل ہے جس پر بڑی وعید آئی ہے۔ آگے ایک روایت پیش کروں گا جس میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دل کو صاف رکھنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے۔ بڑے مبارک ہیں وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ آئینہ جیسا دل عطا فرمائے، جس میں کسی کے متعلق کینہ کپٹ، بغض وحسد اور برے جذبات نہ ہوں۔ ایسا دل اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، اور اگر کسی کو ایسا دل ملا ہے اور وہ صرف فرائض پر اکتفاء کرتا ہے اور نوافل کا زیادہ

اہتمام نہیں کرتا؛ تب بھی اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت کے وعدے ہیں۔ بلکہ نبیٔ کریم ﷺ نے دل کے دوسروں کی طرف سے بغض، کینہ کپٹ اور حسد سے پاک ہونے کو اپنا طریقہ اور سنت قرار دیا ہے

حضرت انسؓ کے مختصر حالات

حضرت انسؓ نبیٔ کریم ﷺ کے خادمِ خاص تھے۔ حضورِ اکرم ﷺ ہجرت فرما کر جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو حضرت اُنس کے سوتیلے والد حضرت ابوطلحہ انصاریؓ سے نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا: اگر کوئی سمجھدار چھوٹا بچہ ہو تو ہمارے حوالہ کردو، تاکہ ہمارے گھر کے کام کاج میں مدد کرے، حضرت اُنس کے حقیقی والد حضرت مالک بن اُنسؓ کا تو انتقال ہو چکا تھا، اُن کی والدہ کا نکاح حضرت ابوطلحہؓ سے ہوا تھا، اس لئے وہ اُن کے سوتیلے والد ہوتے تھے حضرت اُنسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوطلحہ انصاریؓ مجھے اپنے پیچھے بٹھا کر نبیٔ کریم ﷺ کی خدمت میں لے گئے اور کہا: یہ بچہ حاضرِ خدمت ہے۔ جب وہ حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کئے گئے تھے اس وقت ان کی عمر دس سال تھی، اور ہجرت کے بعد نبیٔ کریم ﷺ کا قیام مدینہ منورہ میں دس سال رہا، اور حضرت انسؓ حضور کرم ﷺ کی وفات تک برابر آپ کی خدمت کرتے رہے، اس لیے جب حضور ﷺ کا انتقال ہوا اس وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔

اب چوں کہ وہ دس سال کے چھوٹے بچے تھے، اور ظاہر ہے کہ چھوٹے بچوں میں ویسے بھی لاپرواہی اور غفلت ہوا ہی کرتی ہے۔ چناں چہ بخاری شریف میں روایت ہے، خود حضرت اُنسؓ ہی فرماتے ہیں کہ: حضور ﷺ کے یہاں جانے میں اگر کبھی مَیں غفلت اور لاپرواہی سے کام لیتا تھا تو میری والدہ، میری خالہ اور میری نانی مجھے

تاکید کرتی تھیں کہ جاؤ! حضور کے یہاں جاؤ۔ گویا حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں میری طرف سے ہونے والی غفلت اور لاپرواہی پر میری گھر کی عورتیں مجھے ٹوکتی تھیں۔

نبی کریم ﷺ کی اپنے خادمِ خاص کو تاکیدی نصیحت

خیر! انہیں حضرت انس کو نبی کریم ﷺ نے خاص تاکیدی وصیت اور نصیحت فرمائی: ''يَا بُنَيَّ! إِنْ قَدَرْتَ أَنْ تُمْسِيَ وَتُصْبِحَ وَلَيْسَ فِي قَلْبِكَ غِشٌّ لأَحَدٍ، فَافْعَلْ'' اے میرے پیارے بیٹے! اگر تم سے یہ ہوسکے کہ صبح یا شام ایسی حالت میں کرو کہ تمہارے دل میں کسی کے متعلق کوئی میل نہ ہو، کینہ کپٹ اور حسد نہ ہو، کسی کے متعلق دل میں بغض وعداوت اور دشمنی نہ ہو؛ تو ایسا ضرور کرو، اس کے بعد حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''يَا بُنَيَّ! إِنَّ ذٰلِكَ سُنَّتِي وَمَنْ أَحَبَّ سُنَّتِي فَقَدْ أَحَبَّنِي. وَمَنْ أَحَبَّنِي كَانَ مَعِي فِي الْجَنَّةِ'' اے پیارے بیٹے! دل کو کینہ کپٹ، حسد اور کسی کے متعلق میل کچیل سے پاک رکھنا میری سنت اور میرا طریقہ ہے، اور جو میری سنت سے محبت رکھے گا اور میری سنت کو پسند کرے گا گویا اس نے مجھ سے محبت رکھی، اور جو مجھ سے محبت رکھے گا؛ قیامت کے دن جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔

دیکھو! دل کو کینہ کپٹ، حسد وبغض وغیرہ گندگیوں سے پاک رکھنے پر نبی کریم ﷺ نے کتنا بڑا وعدہ فرمایا ہے! بڑے ہی مبارک ہیں وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ ایسا دل عطا فرمائے۔ اس باب کو لاکر یہی- دل میں بغض، کینہ رکھنے اور آپس میں تعلقات قطع کرنے سے ممانعت کو- بتلاتے ہیں۔

آیاتِ قرآنیہ

اس سلسلہ میں قرآنِ پاک کی آیات پیش کی ہیں: ''إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ'' ایمان والے آپس میں بھائی بھائی ہیں، اور کیا بھائی بھائی سے دشمنی رکھ سکتا ہے؟ اس کے ساتھ قطع تعلق کر سکتا ہے؟ اس کو کبھی چھوڑ سکتا ہے؟ نہیں چھوڑ سکتا۔

ایمان والوں کی خوبی بیان فرمائی ہے: ﴿أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ﴾ ایمان والوں کے ساتھ بہت نرمی سے پیش آتے ہیں، ان کے سامنے ذلیل بن کر رہتے ہیں، اور کافروں کے مقابلہ میں بڑے تن کر اور قوت کے ساتھ رہتے ہیں۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور ان کے جو رفقاء (یعنی صحابۂ کرام) ہیں وہ کفار کے اوپر تو بڑے سخت اور آپس میں بڑے رحم دل ہیں۔

معلوم ہوا کہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور نرمی سے پیش آنا، دل میں بغض اور کینہ نہ رکھنا، آپس میں ترک تعلقات نہ کرنا، بلکہ آپس میں تعلقات کو باقی رکھنا؛ یہ اہلِ ایمان کی صفات میں سے ہے۔ بقولِ شاعرِ مشرق:-

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم ❁ رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن

آپس میں بغض و دشمنی مت رکھو

۱۵۶۷:-وعن أنس رضی الله عنه: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: ((لاَ تَبَاغَضُوا، وَلاَ تَحَاسَدُوا، وَلاَ تَدَابَرُوا، وَلاَ تَقَاطَعُوا، وَكُونُوا عِبَادَ اللهِ إِخْوَاناً، وَلاَ يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلاَثٍ)). (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بغض، دشمنی اور عداوت مت رکھو، اور آپس میں ایک دوسرے کے اوپر حسد نہ کرو، اور ایک دوسرے کو پیٹھ نہ دکھلاؤ، اور قطع تعلق مت کرو، اور اللہ کے بندے بھائی بھائی بن کر رہو۔ کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ ترکِ تعلق کرے۔

افادات:- جب کسی کے متعلق دل میں بغض ہوگا تو اسی سے حسد پیدا ہوگا، اور بغض ہی کے نتیجہ میں آدمی دل میں اس سے بدلہ لینے کی سوچتا ہے، اور جس کے ساتھ بغض ہوتا ہے اس کے متعلق یہ بھی سوچتا ہے کہ اس کو تکلیف پہنچے، اگر اس کو کوئی راحت پہنچتی ہے، نعمت ملتی ہے تو اس کو تکلیف ہوتی ہے، اور اگر اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو یہ خوش ہوتا ہے؛ یہی حسد ہے۔ اور ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ جب آمنا سامنا ہو تو اُس نے اُدھر منھ پھیرلیا اور اِس نے اِدھر منھ پھیرلیا۔ اور قطع تعلق مت کرو، آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بولنا بند مت کرو۔ اور اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن کر رہو، عبدیت اور بندگی کا تقاضا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم دیا جائے، آدمی اپنی نفسانیت، ضد اور ہٹ دھرمی کو چھوڑ کر بندہ بن کر اللہ کے اس حکم پر عمل کرے، اور بھائی بھائی بن جائے۔

''کُونُوا عِبَادَاللهِ إِخْوَاناً'' یہاں اہلِ علم موجود ہیں وہ اس بات کو سمجھیں گے کہ بعضوں نے تو ''عباداللہ'' کو مفعول اول اور ''اخوانا'' کو مفعول ثانی مانا ہے، یعنی اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن جاؤ۔ لیکن بعضوں نے ''عباداللہ'' کو منادیٰ مانا، اس صورت میں مطلب یہ ہوا ''کُونُوا عِبَادَاللهِ'' یعنی ''یَاعِبَادَاللهِ! کُوْنُوْا إِخْوَانًا'' اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔

دل ہی تو ہے، نہ ہے سنگ وخشت

دیکھو! کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کی طرف سے، یا سگے بھائی کی طرف سے، یا اپنے ملنے والوں کی طرف سے ناگواری کی کوئی بات پیش آتی ہے جس کی وجہ سے آدمی اذیت اور تکلیف محسوس کرتا ہے۔ ایسا تو ہے نہیں کہ تکلیف دینے والا ہمارے ساتھ کوئی برا معاملہ کرے اور ہمارے دل کو تکلیف نہ ہو: ؎

دل ہی تو ہے؛ نہ ہے سنگ وخشت، دَرد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رُلائے کیوں

مطلب یہ ہے کہ کوئی آدمی جب تکلیف دینے والی بات کرے گا تو تکلیف تو پہنچے ہی گی، اور یہ ایک فطری تقاضا ہے کہ اس کے متعلق دل میں دوری بھی پیدا ہوتی ہے، اسی لئے شریعت نے انسان کے ان فطری جذبات کا لحاظ بھی کیا ہے، اور تھوڑی سی مدت کے لئے ترکِ تعلق کی اجازت بھی دی کہ تین دن تک تو گنجائش ہے لیکن اس سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے، تین دن سے زیادہ ترک تعلق کرنا حرام ہے۔

نہایت سخت وعید

بلکہ ابوداود شریف کی روایت میں تو یہ ہے: لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَّهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلٰثَةٍ، فَمَنْ هَجَرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثٍ وَمَاتَ، دَخَلَ النَّارَ ''جو آدمی اپنے بھائی کے ساتھ تین دن سے زیادہ ترک تعلق کرے اور اسی حالت میں اس کی موت آجائے؛ تو جہنم میں جائے گا۔ کتنا سخت ارشاد ہے! لیکن آج ہمارے سماج میں اس بات کو کوئی حیثیت ہی نہیں دی جاتی ہے، اپنے سگے بھائی کے ساتھ ترکِ تعلق تو گویا معمولی چیز

ہوگئی، یہاں تک کہ باپ اور بیٹے کا معاملہ بھی اس طرح کا ہوتا جارہا ہے، جس کے نتیجہ میں مہینوں اور سالوں ایسے گزر جاتے ہیں۔ حالاں کہ شریعت تین دن سے زیادہ ترک تعلق کی اجازت نہیں دیتی، اور جو آدمی ایسی حالت میں مر جائے اس کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ جہنم میں جائے گا۔ غور کیا جائے کہ کتنی سخت وعید ہے! اور ایسی چیزوں سے دنیا وآخرت کا کون سا فائدہ ہوتا ہے!۔

اور جس نے سلام میں ابتدا کی؛ اس نے تعلق کو باقی رکھا۔ سلام ہی کلام کی ابتدا ہے، کوئی آدمی کسی کے ساتھ بات چیت کرنا چاہتا ہے تو شروعات سلام ہی سے کرتا ہے، جب آپس میں ملتے ہیں تو پہلے سلام ہوتا ہے پھر بات چیت ہوتی ہے، اگر صرف سلام کرتا ہے اور پھر بے رخی سے پیش آتا ہے؛ تو یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ اور اگر ضرورت کے موقعہ پر بھی کلام سے انکار کرتا ہے کہ ایک کی طرف سے کوئی بات کی جاتی ہے تو اس کا جواب بھی نہیں دیتا، اور ملاقات کے وقت یہ سلام میں ابتدا کرتا ہے، اس کے باوجود سامنے والا اس کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا ہے، تو پھر اِس پر گناہ نہیں ہوگا، بلکہ اس صورت میں ذمہ داری دوسرے پر جائے گی۔

ان دونوں کو ابھی چھوڑے رکھو

۱۵۶۸:-وعن أَبي هـريرة- رضي الله عنـه- : أَنَّ رسولَ اللهِ ﷺ قَالَ : ((تُفْتَحُ أَبْوابُ الجَنَّةِ يَوْمَ الإِثْنَيْنِ ويَوْمَ الخَمِيسِ، فَيُغْفَرُ لِكُلِّ عَبْدٍ لا يُشْرِكُ بِاللهِ شَيْئاً، إِلاَّ رَجُلاً كَانَتْ بينهُ وَبَيْنَ أَخِيهِ شَحْناءُ فَيُقَالُ: أَنْظِرُوا هَذَيْنِ حَتَّى يَصْطَلِحَا! أَنْظِرُوا هَذَيْنِ حَتَّى يَصْطَلِحَا!)). رواه مسلم.

وفي روايةٍ لَهُ: ((تُعْرَضُ الأَعْمَالُ فِي كُلِّ يَوْمِ خَمِيسٍ وإِثْنَيْنِ)) وذَكَرَ نَحْوَهُ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جنت کے دروازے پیر اور جمعرات کے دن کھولے جاتے ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ پیر اور جمعرات کے دن بندوں کے اعمال اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کئے جاتے ہیں۔ ہر وہ آدمی جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ہو اس کے گناہوں کو معاف کرنے کا اعلان کیا جاتا ہے، البتہ وہ آدمی جس کے اور اس کے بھائی کے درمیان دشمنی، عداوت اور کینہ ہو، ان کے متعلق فرشتوں سے کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کو ابھی چھوڑے رکھو اور ان کا معاملہ ابھی پیش مت کرو؛ یہاں تک کہ وہ آپس میں صلح کرلیں (یعنی جب تک کہ وہ آپس میں صلح نہیں کر لیتے وہاں تک ان کی معافی رُکی ہوئی رہتی ہے۔)

افادات:- ''شَحْنَآء'' یعنی عداوت، دشمنی، بغض، کینہ۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور مغفرتوں سے دور کر کے اور اپنے بھائی کے ساتھ دشمنی کر کے ہم نے کیا حاصل کرلیا؟ لوگ اپنی ناک اونچی رکھنے کے زعم میں ایسی برائیوں میں مبتلا رہتے ہیں اور زندگی بھر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور اور مغفرت سے محروم رہتے ہیں۔ یہ بڑی خطرناک چیز ہے جس سے اپنے آپ کو بچانے کی اشد ضرورت ہے۔

باب تحریم الحسد

وَهُوَ تمني زوالُ النعمة عن صاحبها سواءٌ كَانَتْ نعمة دينٍ أَوْ دنيا

حسد کی حرمت کا بیان

قال اللہ تعالیٰ :- أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَى مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ.

وفيه حديث أنس السابق في الباب قبله.

حسد بھی دل کا ایک عمل ہے۔ ہمارے ظاہری اعمال میں جس طرح بعض اعمال فرض، بعض واجب ہیں، اس طرح دل کے اعمال میں بھی فرض اور واجب ہیں جیسے: شکر، صبر، زہد، تواضع وغیرہ؛ سارے اعمال فرض اور ضروری ہیں۔ اور جیسے ہمارے اعضاء کے اعمال میں بعض حرام ہیں، جیسے: زنا اور چوری وغیرہ، اسی طریقہ سے دل کے بعض اعمال حرام ہیں، جیسے: کبر، بغض، کینہ، عجب وخود پسندی، دنیا کی محبت مال اور جاہ کی محبت؛ یہ سب حرام ہیں۔ انہیں میں سے ایک حسد بھی ہے جو قلب کے ان اعمال میں سے ہے جس کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے اور جس پر بڑی سخت وعید ہے۔

حسد نیکیوں کو کھا جاتا ہے

۱۵۶۹:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه أَنَّ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم قَالَ: ((إِيَّاكُمْ وَالْحَسَدَ فَإِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ)) أَوْ قَالَ: ((الْعُشْبَ)) (رواه أبوداود)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم حسد سے بچو، اس لئے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے، جیسے آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔ راوی

کہتے ہیں: یا تو آپ نے یہ فرمایا: جیسے آگ سوکھی گھاس کو کھا جاتی ہے۔

افادات: -اگر سوکھی گھاس یا لکڑی میں آگ لگ جائے تو دھیرے دھیرے وہ آگ لکڑی کو ختم کر دیتی ہے، اسی طریقہ سے جو آدمی حسد کی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے تو دل کی یہ بیماری دھیرے دھیرے آدمی کی ساری نیکیوں کو ختم کر دیتی ہے اور اس کو پتہ بھی نہیں چلتا۔

حسد کیا ہے؟

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باب کے عنوان کے ساتھ ہی حسد کی تعریف بھی بتلا دی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی جو جو نعمتیں اپنے بندوں کو دے رکھی ہیں وہ دو طرح کی ہیں، ان میں سے بعض نعمتیں تو ایسی ہیں جو ہر ایک کو ملی ہوئی ہیں، جیسے: زندگی، آنکھیں، کان، منھ، زبان، ہاتھ، پاؤں۔ اسی طریقہ سے کائنات میں اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں ایسی پیدا کی ہیں جن سے عام فائدہ اٹھایا جا رہا ہے، جیسے: سورج، چاند، زمین، آسمان، بارش؛ یہ ساری چیزیں تو ایسی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر ایک کے لئے عام ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی بعض نعمتیں وہ ہیں جو بعضوں کو دی جاتی ہیں اور بعضوں کو نہیں دی جاتیں، یا بعضوں کو زیادہ مقدار میں دی جاتی ہیں اور بعضوں کو کم مقدار میں دی جاتی ہیں، جیسے: مال و دولت، عہدہ و منصب، حسن و جمال، عزت و شہرت، علم اور صلاح و تقویٰ وغیرہ۔ تو دین کی یا دنیا کی بہت ساری نعمتیں ایسی ہیں جو بعضوں کو ملی ہیں اور بعضوں کو نہیں ملیں۔ یا بعضوں کے پاس زیادہ ہیں اور بعضوں کے پاس کم ہیں۔

اب کسی آدمی کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت دے رکھا ہے، یا عزت سے نوازا ہے، کسی کو شہرت کی نعمت اللہ نے دے رکھی ہے، کسی کو عہدہ اور منصب سے نواز رکھا ہے

کسی کو اللہ تعالیٰ نے حسن و جمال عطا فرمایا ہے، کسی کو صحت وتندرستی عطا فرمائی ہے، کسی کو علم دیا ہے، کسی کو صلاح وتقویٰ اور نیکی کی توفیق عطا فرمائی ہے، تو چاہے وہ دین کی نعمت ہو، یا دنیا کی نعمت ہو؛ اس نعمت کو دیکھ کر دل میں جلن اور کڑھن کا پیدا ہونا، اور یہ خیال آنا کہ یہ نعمت اس کو کیوں ملی؟ اس کے پاس یہ نعمت نہیں رہنی چاہیے، اس سے چھن جانی چاہیے؛ اسی کا نام حسد ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر اعتراض

اور غور کرو کہ حسد اتنا بڑا گناہ کیوں ہے؟ حسد کرنے والا حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر اعتراض کر رہا ہے، اس لئے کہ جس کو جو بھی نعمت ملی ہوئی ہے وہ خود اپنے اختیار سے تو نہیں ملی، بلکہ اس کو وہ نعمت اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ اب یہ آدمی جب اس کی اس نعمت کے اوپر جلن اور کڑھن محسوس کرتا ہے، تو پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ پر اعتراض کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت اس کو کیوں دی؟ آپ ہی اندازہ لگائیں کہ آپ نے کسی کو کوئی چیز دی ہو، اور آپ کا کوئی ملازم اس پر یوں کہے کہ: آپ نے فلاں کو فلاں چیز کیوں دی؟ تو کیا اس کے اس اعتراض کو آپ برداشت کریں گے؟ نہیں کریں گے، بلکہ اس کو اسی وقت چلتا کر دیں گے، یا اس کو جو بڑی سے بڑی سزا دے سکتے ہیں وہ دیں گے۔ تو کسی کو ملی ہوئی نعمت پر جلن یا کڑھن کا محسوس کرنا اور اس سے اس نعمت کے دور ہو جانے کی تمنا کرنا؛ یہ دراصل اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر اعتراض کرنا ہے، اور یہ بہت خطرناک بیماری ہے۔

حسد کے نتیجہ میں اور کیا کیا ہوتا ہے؟

آج ہمارے معاشرے میں یہ بیماری بہت عام ہو چکی ہے۔ جس کے متعلق

آدمی کے دل میں حسد پیدا ہوتا ہے، اس کو اگر کوئی خوشی یا مسرت حاصل ہوتی ہے، یا کوئی نعمت ملتی ہے؛ تو یا تو اِس کو تکلیف ہوتی ہے کہ اُس کو یہ نعمت کیوں ملی؟ اور اگر اس کو کوئی غم، تکلیف اور مصیبت پہنچتی ہے تو اس پر یہ خوش ہوتا ہے، اس کو بڑا مزہ آتا ہے کہ بہت اچھا ہوا، حالاں کہ کسی مؤمن کو پہنچنے والی تکلیف پر خوش ہونا بھی بڑا گناہ ہے؛ جس کو حدیثِ پاک میں ''شَمَاتَۃٌ'' کہا گیا ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں: ''لَا تُظْهِرِ الشَّمَاتَةَ لِأَخِيكَ فَيَرْحَمَهُ اللهُ وَيَبْتَلِيكَ. (رواہ الترمذی) '' اپنے بھائی کو کوئی مصیبت پہنچے، تو اس پر خوشی کا اظہار نہ کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو تو اس مصیبت سے نجات دیدے اور تم کو اس میں مبتلا کر دے۔

پھر حسد کرنے والا یہ کوشش کرتا ہے کہ یہ چیز جو اس کو ملی ہوئی ہے وہ اس سے دور ہو جائے، اور اس کے لئے تدبیریں بھی کرتا ہے، اس کو سماج اور سوسائٹی میں نیچا اور کمتر دکھلانے کے لئے اس کی برائیاں بیان کرتا ہے، غیبت کرتا ہے، اس کو نقصان پہنچانے کی تدبیریں کرتا ہے۔ اور معلوم نہیں اس حسد کی وجہ سے اور کتنے گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور کسی کا حقیقی عیب ظاہر کرنا بھی بڑا گناہ ہے جیسا کہ پہلے آچکا، لیکن یہ آدمی تو حسد کے نتیجہ میں اس کو بدنام کرنے کے لئے ایسی ایسی باتیں گھڑ کر لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے جو حقیقت میں اس میں موجود بھی نہیں ہوتیں۔ یہ ساری حرکتیں حسد کرنے والے سے سرزد ہوتی ہیں۔ اسی لئے علماء نے فرمایا ہے کہ حسد کے نتیجہ میں آدمی کبھی کفر تک میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس لیے کہ حسد کے اندر اندھا ہو کر وہ اس کو نقصان پہنچانے لئے سحر اور جادو تک کرواتا ہے، اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جادو کرنے میں ایسے اعمال کرنے ہی پڑتے ہیں جن کی وجہ سے آدمی ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، اور

ایمان سے محروم ہوجاتا ہے۔اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ حسد کتنی خطرناک بیماری ہے، اسی لئے اس سے پناہ مانگی گئی ہے۔

نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: حسد سے بچو؛ اس لئے کہ اس کے نتیجہ میں آدمی کی نیکیاں اس طرح ختم ہوجاتی ہیں جیسے آگ لکڑی کو کھالیتی ہے۔ اور ایک آگ تو بڑی اور ظاہر ہوتی ہے کہ اگر لگ جائے تو کسی چیز کو فوراً ہی ختم اور بھسم کردیتی ہے۔ اور ایک آگ ہلکی ہوتی ہے جو رفتہ رفتہ، آہستہ آہستہ کسی چیز کو ختم کرتی ہے۔ حسد والی آگ بھی جب کسی آدمی کے دل میں پیدا ہوجاتی ہے تو وہ دھیرے دھیرے اس کی نیکیوں کو ختم کردیتی ہے اور اس کو پتہ بھی نہیں چلتا۔

اور پھر آگ کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ جس چیز میں لگی ہوتی ہے جب وہ چیز جل کر ختم ہوجاتی ہے تو پھر وہ آگ خود اپنے آپ کو ہی کھانا شروع کرتی ہے، آگ کا ایک حصہ دوسرے کو کھاتا ہے یہاں تک کہ وہ خود ختم ہوجاتی ہے۔ اسی طرح حسد کرنے والے کا حال بھی ہوتا ہے۔

فارسی کی کہاوت ہے:-''اے حاسد بمیر کہ ایں رنجیست'' اے حسد کرنے والے! تو اپنے اس حسد ہی میں مرجا کہ تیرے لئے یہی ایک مصیبت کافی ہے۔ تو حسد خود اسی کے حق میں ایک آگ ہے، جس پر حسد ہوتا ہے جب وہ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تو یہ آدمی خود اندر ہی اندر گُھٹ گُھٹ کر مرجاتا ہے، اور اس کے لئے یہ ایک وبالِ جان ہوجاتا ہے۔

حسد کے تین درجات

پھر حسد کے تین درجات ہیں۔ ایک غبطہ جس کو رشک کہتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کی نعمت کو دیکھ کر آدمی کو جلن اور کڑھن نہیں ہوتی، بلکہ وہ خوش ہوتا

ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے بھائی کو یہ نعمت عطا فرمائی ہے، اور ساتھ ہی وہ یہ تمنا بھی کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی یہ نعمت عطا فرمائے۔ جیسے: کسی کا اچھا مکان دیکھ کر دل میں کوئی کڑھن نہیں ہوتی، البتہ آپ کے پاس ایسا مکان نہیں ہے تو آپ یہ تمنا کرتے ہیں کہ کاش! اللہ تعالیٰ ہم کو بھی ایسا ہی اچھا مکان دے۔ یا کسی کا اچھا لباس دیکھ کر آپ اپنے لئے ایسے لباس کی تمنا کریں۔ کسی کا علم، کسی کا تقویٰ، کسی کا حسن و جمال، کسی کا عہدہ و منصب، کسی کا مال و دولت اور ثروت دیکھ کر اسی جیسی تمنا کرنا اور اس سے جلن اور کڑھن کا محسوس نہ ہونا، اور اس سے اس نعمت کے دور ہونے کی تمنا نہ کرنا، اور ساتھ ہی ساتھ تمنا کرنا کہ مجھے بھی اللہ تعالیٰ ایسی نعمت عطا فرمائے؛ اس کو ''رشک'' کہتے ہیں، اسی کو عربی میں ''غبطہ'' کہا جاتا ہے، اور یہ حرام نہیں ہے، بلکہ اس کی اجازت ہے۔ بعض مرتبہ ''غبطہ'' کے لئے بھی حسد کا لفظ بولا جاتا ہے جیسا کہ حدیث میں آتا ہے: ''لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ'' حسد دو ہی چیزوں میں جائز ہے، ایک تو اللہ تعالیٰ نے کسی کو قرآن کا علم دیا ہو، اور وہ اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہو، اور دوسرا وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہو، اور وہ نیکی کے کاموں میں دن رات خرچ کرتا ہو۔ اس حدیث میں حسد سے غبطہ اور رشک ہی مراد ہے۔ یہ پہلا اور ادنیٰ درجہ ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ کسی کی نعمت دیکھ کر یہ تمنا کرنا کہ یہ نعمت اس سے چھن جائے اور مجھے مل جائے۔

اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ دل میں یہ خیال اور تمنا پیدا ہو کہ اس کے پاس سے یہ نعمت چھن جائے، چاہے مجھے ملے یا نہ ملے۔ یہ حسد کا سب سے خطرناک اور سب سے گھٹیا درجہ ہے۔

کبڑے کی تمنا

ایک آدمی کبڑا تھا، کسی نے اس سے پوچھا: تیری کیا تمنا ہے؟ اس نے کہا: میں چاہتا ہوں کہ سب لوگ کبڑے ہو جائیں۔ اس سے کہا گیا: اللہ کے بندے! سب کے کبڑے ہونے کی تمنا کے بجائے یہی تمنا کرتا کہ تیرا کبڑا پن دور ہو جائے؛ تو اچھا تھا۔ تو ایسی سوچ کہ سامنے والے کی نعمت زائل ہو جائے، چاہے مجھے ملے یا نہ ملے، یہ بڑی خطرناک سوچ ہے۔ اس میں سامنے والے کی نعمت کے زائل ہو جانے والا خیال ہے۔

حسد کیوں پیدا ہوتا ہے؟

اور حسد پیدا ہونے کے دو سبب بتلائے گئے ہیں، ایک سبب حبِ جاہ اور حبِ مال ہے۔ آدمی کے دل میں مال کی محبت ہو، عہدہ و منصب کی محبت ہو، تو وہ یہ چاہتا ہے کہ میں سب سے بڑا مالدار بن کر رہوں، لوگوں کے اوپر میرا سکہ چلے۔ مجھے فلاں عہدہ و منصب حاصل ہو جائے اور میں صاحبِ اقتدار بن جاؤں؛ لیکن وہ جب دیکھتا ہے کہ کسی کے پاس مال زیادہ آ گیا، کسی کے پاس اقتدار آ گیا تو اب اس کو برداشت نہیں ہوتا، اور دل سے یہ تمنا کرتا ہے کہ اس کے پاس سے وہ چیز چھن جانی چاہیے۔ یہ حبِ مال اور حبِ جاہ ہے۔ تو حسد کے پیدا ہونے کا ایک سبب تو عہدہ، منصب اور کرسی کی اور مال کی محبت ہے۔

اور دوسرا سبب بغض اور کینہ ہے۔ جیسا کہ اوپر بتلایا تھا کہ کسی کے اوپر غصہ آیا جس کے نتیجہ میں دل میں سامنے والے سے نفرت بیٹھی، اور اسی نفرت کے نتیجہ میں دل میں اس کی عداوت اور دشمنی بیٹھ گئی۔ پھر جب اس کو کوئی نعمت ملتی ہے تو اسی دشمنی کے

نتیجہ میں اس کو وہ پسند نہیں آتی، بلکہ دل سے چاہتا ہے کہ اس کے پاس یہ نعمت باقی نہ رہے اور چھن جائے۔ اس کے پاس دولت ہے تو اسی دشمنی کی وجہ سے یہ چاہتا ہے کہ اس کے پاس یہ دولت نہ رہے۔ اس کے پاس کوئی عہدہ و منصب ہے تو دشمنی کی وجہ سے یہ چاہتا ہے کہ وہ اس کے پاس نہ رہے۔ اللہ تعالیٰ نے شہرت و عزت دے رکھی ہے، اسی دشمنی کی وجہ سے یہ چاہتا ہے کہ عزت و شہرت اس کے پاس نہ رہے، اور وہ لوگوں کے درمیان بدنام اور بے عزت ہو جائے۔

حسد کیسے دور ہو؟

اور حسد کو دور کرنے کے علاج بھی بتلائے گئے ہیں۔ ایک علاج تو یہ ہے کہ آدمی یہ سوچے کہ:۔

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں تین عالَم پیدا کئے ہیں، ایک عالَمِ جنت ہے، وہ عالَم تو ایسا ہے کہ اس میں آدمی کو راحت ہی راحت، خوشی ہی خوشی، مسرت ہی مسرت ہے، وہاں غم کا نام و نشان نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نصیب فرمائے۔ آمین۔ جو آدمی جنت میں پہنچ گیا تو وہاں کوئی غم اور فکر اور کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔

دوسرا عالَم جہنم ہے جہاں مصیبت ہی مصیبت، تکلیف ہی تکلیف، رنج ہی رنج اور غم ہی غم ہے، وہاں راحت و آرام کا کوئی نام و نشان نہیں۔ اللہ تعالیٰ اس سے ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین۔

اور تیسرا عالَم یہ دنیا ہے جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ عالَمِ دنیا ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے مخلوط بنایا ہے، یہاں کی کوئی راحت ایسی نہیں جس میں رنج اور غم کا کانٹا لگا ہوا نہ ہو، اور یہاں کی کوئی تکلیف اور مصیبت ایسی نہیں جس کے اخیر میں

اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی راحت اور نعمت نہ ملتی ہو۔ گویا راحت بھی ہے اور مصیبت بھی ہے، نعمت بھی ہے اور تکلیف بھی ہے، خوشی بھی ہے اور رنج بھی ہے، مسرت بھی ہے اور مصیبت بھی ہے۔ آپ دنیا کے بڑے سے بڑے اور مالدار سے مالدار آدمی کو پوچھیں کہ کبھی ایسا ہوا کہ تیری ساری تمنائیں پوری ہوئی ہوں؟ تو جواب ملے گا کہ ایسا تو نہیں ہے۔ دنیا میں کوئی آدمی ایسا نہیں ملے گا جس کو اللہ تعالیٰ کی کوئی نہ کوئی نعمت نہ ملی ہو، اور ساتھ ہی ساتھ کوئی نہ کوئی تکلیف بھی اس کو نہ ہو۔ ہر ایک کو کچھ نعمتیں ملی ہیں تو ساتھ میں کچھ تکلیفیں بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ سے دنیا کو ایسا ہی بنایا ہے کہ کسی کو کوئی نعمت دی اور کسی کو کوئی دوسری نعمت دی۔ کسی کو مال و دولت سے نوازا، کسی کو فقر و فاقہ میں مبتلا کیا۔ کسی کو عہدہ و منصب دیا، کسی کو ماتحت بنادیا۔ کسی کو عزت و شہرت عطا فرمائی، کسی کو وہ چیز نہیں ملی۔ کسی کو حسن و جمال سے مالا مال کردیا، کسی میں وہ بات نہیں ہے۔ کسی کو علم سے نوازا، کوئی آدمی جہالت میں مبتلا ہے۔ کسی کو اللہ تعالیٰ نے صلاح و تقویٰ عطا فرمایا، اس کے برخلاف کوئی فسق و فجور میں مبتلا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بہت سی نعمتیں کسی کو دی اور کسی کو نہیں دیں۔ اب کس کو کیا نعمت دینا ہے اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہی جس کے لئے جو مناسب سمجھتا ہے وہ فیصلہ کرتا ہے لہٰذا ہمیں یوں سوچنا چاہیے کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ ان نعمتوں کا پورا پورا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اس نے جس کے لئے جو نعمت مناسب سمجھی اس کو وہ عطا فرمائی، اور ہر آدمی اگر اپنے حالات کو سوچے گا تو دوسرے کے مقابلہ میں کچھ نعمتیں ایسی ضرور ہوں گی جو اپنے پاس ہوں گی اور وہ دوسرے کے پاس نہیں ہوں گی۔ اگر کسی عہدہ و منصب والے کو دیکھیں گے تو ہوسکتا ہے کہ عہدہ و منصب تو اس کو ملا ہے، لیکن ہمیں اللہ تعالیٰ نے

دوسری کوئی نعمت ایسی دے رکھی ہوگی جو اس کے پاس نہیں ہوگی۔

ایک آدمی مال و دولت اور ثروت والا ہے، اس کی کئی فیکٹریاں لگی ہوئی ہیں، اس کے مکان کے سامنے کاریں کھڑی ہوئی ہیں، اور بنگلے بنے ہوئے ہیں، بینک بیلنس اور سب کچھ ہے، اور اس کے مقابلہ میں دوسرا آدمی ایسا ہے کہ صبح سے شام تک مزدوری کرتا ہے اور چند روپے کما کر چٹنی روٹی حاصل کرتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو صحت و عافیت اور تندرستی کی نعمت سے نوازا ہے۔ اب یہ مالدار کہے کہ اس کو یہ تندرستی کیوں ملی، اور یہ فقیر یوں سوچے کہ اوہو! یہ تو بڑا خوش قسمت ہے کہ اس کی تو فیکٹریاں ہیں، بنگلہ اور کاریں ہیں اور بینک بیلنس بھی خوب ہے؛ لیکن دونوں کے اندر کے حال پر جب غور کرتے ہیں تو کچھ اور ہی نظر آتا ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے دولت دی ہے، اس کے پاس بنگلہ اور سب کچھ ہے، لیکن اس کے اندر کا حال یہ ہے کہ بہترین سے بہترین بستر مہیا ہونے کے باوجود جب لیٹتا ہے تو نیند ہی نہیں آتی۔ تمام اسبابِ راحت موجود ہیں لیکن راحت نہیں ہے۔ اس کو نیند لانے کے لئے گولیاں کھانی پڑتی ہیں۔ اس کا دسترخوان سجا ہوا ہے، انواع و اقسام کے کھانے بنے بنائے موجود ہیں، لیکن ایسی بیماری کا شکار ہے جس کی وجہ سے ڈاکٹروں نے کہہ رکھا ہے کہ صرف دال کا پانی پیو، دوسرا کچھ کھانے پینے کی اجازت نہیں ہے۔ تو ساری نعمتیں دسترخوان پر موجود ہونے کے باوجود وہ استعمال نہیں کرسکتا۔ وہ جس تکلیف میں مبتلا ہے وہ دوسروں کو معلوم نہیں۔

اس کے بالمقابل مزدور صبح سے شام تک مزدوری کرتا ہے اور چند روپے جو اس کو ملتے ہیں ان سے چٹنی روٹی حاصل کرتا ہے اور بڑی لذت و بڑے مزے لے لے کر پیٹ بھر کر کھاتا ہے اور زمین پر سر رکھنے سے پہلے ہی نیند کی آغوش میں پہنچ جاتا ہے۔

جب وہ صاحبِ ثروت ودولت اس کو سوتا ہوا دیکھتا ہے تو رشک کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کیسی صحت دے رکھی ہے، نیند کی نعمت کے کیسے مزے اڑا رہا ہے، اور میں چاہتا ہوں تب بھی مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔

اسبابِ راحت کا نام راحت نہیں

درحقیقت ہم لوگوں نے اسبابِ راحت کو ہی راحت سمجھ رکھا ہے، حالاں کہ اسبابِ راحت حاصل ہوجانے سے راحت حاصل نہیں ہوجاتی۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ترمذی شریف میں دعا ہے کہ جب آدمی کھانا کھالے تو یہ دعا پڑھے: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنِیْ هٰذَا وَرَزَقَنِیْهِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِّنِّیْ وَلَا قُوَّةٍ'' تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے مجھے یہ کھانا کھلایا، اور مجھے بغیر کسی میری کوشش ومحنت کے یہ کھانا اپنے فضل سے بطورِ رزق عطا فرمایا۔ جو آدمی یہ دعا پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے پچھلے سارے گناہ معاف کردیتے ہیں۔ (سنن أبوداود، جامع ترمذی)

اس دعا میں دو چیزیں ہیں: ''اَطْعَمَنِیْ هٰذَا، وَرَزَقَنِیْهِ'' ایک تو یہ کہ مجھے کھلایا اور دوسرے یہ کہ مجھے رزق دیا۔ ہم یوں سمجھتے ہیں کہ بظاہر رزق اور کھانا دونوں ایک ہی چیز ہے؛ تو پھر دونوں الفاظ کو الگ الگ لانے کی کیا ضرورت تھی؟ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: وہ چیز آپ کو رزق کے طور پر ملی، اور کھانے کے استعمال میں بھی آئی۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دولت دے رکھی ہے جس سے یہ کھانا آپ کی ملک میں آیا، لیکن ضروری نہیں کہ وہ کھانا کھانے کی نوبت بھی آئے، کیوں کہ ایک چیز آپ کو ملی ہے، لیکن ہوسکتا ہے کہ کسی بیماری یا عذر کی وجہ سے آپ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکتے ہوں۔

اسی طرح ایک آدمی نیند لانے کے لئے بہترین سے بہترین مسہری اور چار پائی تیار کرالے، اس پر نرم بستر لگوالے، (A/C) لگوالے، اور دوسرے سارے اسباب اختیار کرلے، لیکن جب سونا چاہے تو نیند ہی نہ آئے؛ تو وہ کیا کرسکتا ہے؟

معلوم ہوا کہ پیسوں سے اسباب تو خریدے جاسکتے ہیں لیکن نیند نہیں خریدی جاسکتی۔ پیسوں سے کھانا تو خریدا جاسکتا ہے، لیکن بھوک نہیں خریدی جاسکتی؛ نیند اور بھوک تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اسی کو عطا فرماتے ہیں۔ پتہ چلا کہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں، اور اسبابِ راحت کا نام راحت نہیں ہے۔

ایک آدمی کو صحت و عافیت دے رکھی ہے اور دوسرے کو دولت دے رکھی ہے، اب وہ اسی غم میں گھل رہا ہے کہ اُس کے پاس دولت ہے اور میرے پاس پیسے نہیں ہیں، اور یہ یوں سوچ رہا ہے کہ یہ چار پیسے میرے کسی کام کے نہیں ہیں، مجھے تو اس سے کوئی فائدہ ہی نہیں پہنچ رہا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کو جو نعمت دی ہے وہ دوسرے کے پاس نہیں ہے۔

لیکن پسر گرمی دار است

اور دوسری بات یہ ہے کہ جس کو جو چیز دی گئی ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی بہت ساری حکمتیں مضمر ہیں۔ بعض مرتبہ آدمی تمنا کرتا ہے کہ مجھے پیسے مل جائیں، لیکن ہوسکتا ہے کہ اگر اس کے پاس پیسے آجاتے تو یہ سرکشی اور تمرد و طغیانی پر آمادہ ہوجاتا، اور ایسی حرکتیں کرتا جن کے نتیجہ میں وہ دولت اس کے لئے فائدہ مند ہونے کی بجائے نقصان دہ ہوجاتی۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

”آں کس کہ ترا تونگرمی گرداند، اُو مصلحتِ تو از تو بہتر می داند“

وہ ذات جو تجھے مالدار نہیں بناتی، وہ تری مصلحتوں کو تجھ سے بہتر جانتی ہے۔

''پدر را عسل بسیار است، لیکن پسر گرمی دار است''

باپ کے پاس شہد تو بہت ہے، لیکن بیٹے کی طبیعت میں گرمی بھی بہت زیادہ ہے، اس لیے اس کے پاس شہد ہونے کے باوجود وہ اپنے بیٹے کو نہیں دیتا، چوں کہ باپ جانتا ہے کہ شہد کی خاصیت بھی گرم ہے، اور یہ بھی گرم ہے، اگر گرم چیز کھائے گا تو اور زیادہ مصیبت میں پڑے گا۔ اسی طرح کس کو کیا دینا ہے اس کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس لئے آدمی کو یوں سوچنا چاہیے کہ یہ نعمت جو اس کو ملی ہے وہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے اس کو دی ہے، میرے بارے میں اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہی تھا کہ مجھے نہ ملے ،تو مجھے نہیں ملی؛ اب اس پر یہ تمنا کرنا کہ وہ نعمت اس سے چھن جائے؛ یہ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر ایک طرح کا اعتراض ہی تو ہے۔

یہ سوچنا حماقت ہے

دوسری بات یہ ہے کہ آدمی کی جو تمنائیں ہوتی ہیں کہ یہ بھی مجھے ملے اور وہ بھی مجھے ملے؛ ظاہر ہے کہ جتنی نعمتیں ہیں وہ ساری کی ساری تو ہر کسی کو مل ہی نہیں سکتیں؟ آدمی کی جتنی تمنائیں ہیں وہ سب اگر اس کو مل جائیں، اس کے بعد بھی آدمی کچھ نہ کچھ اور تمنا کرتا ہی رہے گا۔ دنیا کا سب سے خوش حال آدمی اگر آپ لے لیں، جیسے ہندوستان کا سب سے بڑا مالدار ''عظیم پریم جی'' سے جا کر آپ پوچھ لیجئے کہ بھائی! تیری ساری تمنائیں کیا پوری ہوگئیں؟ کیا تیری جتنی خواہشیں تھیں وہ سب پوری ہوگئیں؟ تو وہ یہی جواب دے گا کہ: نہیں! ابھی تو میری بہت ساری تمنائیں پوری ہونا باقی ہیں، ابھی تو مجھے یہ کرنا ہے اور وہ کرنا ہے:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے	بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

دنیا کے بڑے سے بڑے خوشحال اور مالدار آدمی سے یہی سوال کرلو، تو وہ یوں نہیں کہے گا کہ میری ساری تمنائیں اور خواہشیں پوری ہوچکی ہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو بنایا ہی ایسا ہے کہ ایک تمنا پوری نہیں ہوتی کہ دوسری پیدا ہوجاتی ہے، اس لئے آدمی کا یہ سوچنا کہ میری ساری تمنائیں پوری ہوجائیں؛ یہ حماقت ہے۔

ذرا سا بخار

انسان کا مزاج ایسا ہے کہ نعمتوں کے معاملہ میں دوسرے کو دیکھتا ہے، اور مصیبت کے معاملہ میں اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔ ارے بھائی! تمہارے پاس کیا نعمت ہے تم نے کبھی سوچا؟ دراصل ہمارے سوچنے کی نوعیت اور انداز کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ حضرت مولانا سیّد اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو شدید بخار تھا۔ کسی نے پوچھا: حضرت! طبیعت کیسی ہے؟ حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا: الحمدللہ! آنکھ بہت اچھی ہے، کان بہت اچھا ہے، ہاتھ بھی درست ہے، پاؤں بھی تندرست ہے، کھانا بھی کھاتا ہوں، بس! ذرا سا بخار ہورہا ہے۔ حضرت نے پہلے اللہ تعالیٰ کی ساری نعمتوں کو گنوایا، پھر بیماری کو معمولی کرکے بتلایا۔ ہمارے جیسے کو اگر تھوڑا سا بخار آجائے، اور کسی نے پوچھ لیا کہ: کیسی طبیعت ہے؟ تو کہیں گے: ارے جانے دو نا! بہت تیز بخار ہے، میں تو پریشان ہوگیا، اور یہ ہوا، اور فلاں ہوا۔

ایک گلاس آدھا دودھ سے بھرا ہوا ہو، تو اس کو دو طرح سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، ایک تعبیر تو یہ ہے کہ آدھا گلاس دودھ سے بھرا ہوا ہے، اور دوسری تعبیر یہ بھی ہے کہ آدھا

خالی ہے۔ دونوں باتیں ایک ہی ہیں، لیکن دونوں تعبیرات میں سوچ کا فرق ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو سوچے کہ میرے حال پر اس کی کتنی نعمتیں ہیں۔ جب یہ سوچے گا تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی توفیق ہوگی، اور شکر کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمتوں میں اضافہ بھی ہوگا۔ اور اگر اس طرف نہیں دیکھے گا اور دوسروں کی طرف دیکھتا رہے گا؛ تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری ہی پیدا ہوگی۔

دوسروں کو دیکھنے کا طریقہ

اور اگر دوسروں کو دیکھنا ہی ہے تو اس کا طریقہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتایا ہے کہ: دنیا کی نعمتوں کے سلسلہ میں اپنے سے کم تر کو دیکھو؛ تاکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی توفیق ہو۔ اور دین کے معاملہ میں اپنے سے بہتر کو دیکھو؛ تاکہ زیادہ سے زیادہ عمل کی توفیق ہو۔ اور آج ہمارا مزاج دنیا کے معاملہ میں یہ بن چکا ہے کہ اگر ہمارے پاس ایک لاکھ ہیں، تو پانچ لاکھ والے کو دیکھتے ہیں کہ میرے پاس اتنے نہیں ہیں، اس طرح اللہ تعالیٰ کے یہاں سے ہمیں جو ایک لاکھ ملے ہیں ان کی بھی ناشکری ہوتی ہے۔ اور دین کے معاملہ میں اگر دو نمازیں پڑھتا ہے تو سوچتا ہے کہ میں فلاں سے تو اچھا ہوں، وہ تو ایک بھی نماز نہیں پڑھتا۔ ارے بھائی! یہ نہیں دیکھتے کہ تم دو نماز ہی پڑھتے ہو اور تین چھوڑ رہے ہو؟ حالاں کہ تمہیں تو پانچوں وقت کی نماز پڑھنی چاہیے تھی۔

سارے رنج وغم سے بچالیا

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے محدث، فقیہ اور صوفی گزرے ہیں وہ فرماتے ہیں: میں پہلے مالداروں کی رفاقت میں رہتا تھا تو ہر وقت رنج وغم میں اور

تکلیف زدہ رہتا تھا، اس لیے کہ جس کو دیکھتا تھا تو سوچتا تھا کہ اس کا لباس میرے لباس سے اچھا ہے، اس کی سواری میری سواری سے اچھی ہے، اس کا مکان میرے مکان سے اچھا ہے۔ میرا مکان اس سے اچھا ہونا چاہیے، میری سواری اس سے اچھی ہونی چاہیے، میرا لباس اس سے اچھا ہونا چاہیے؛ اس طرح مَیں ہمیشہ رنج وغم میں ہی مبتلا رہتا تھا، لہٰذا مَیں نے اپنی رفاقت بدل دی اور غریبوں کے ساتھ رہنا شروع کیا، اب مَیں جس کو بھی دیکھتا تو سوچتا کہ میرا لباس اس کے لباس سے اچھا ہے، میری سواری اس کی سواری سے اچھی ہے، میرا مکان اس کے مکان سے اچھا ہے؛ اس طرح مَیں نے سارے رنج وغم سے اپنے آپ کو بچالیا۔

بہرحال! آدمی کو چاہیے کہ ایک بات تو یہ سوچے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے مجھے یہی دیا ہے۔ اور جس کو جو بھی دیا وہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل ہی سے دیا اور اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے وہ جسے جو چاہے دے: ''ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ'' جب اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل کسی کو دیا ہے تو اس پر مجھے اور آپ کو اعتراض کرنے کا کیا حق ہے؟ اس لیے حسد کرنے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر اعتراض کرتا ہے۔ لہٰذا اس سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے، یہ بہت خطرناک بیماری ہے۔

حسد کا دوسرا علاج

اور حسد کا دوسرا علاج یہ بھی ہے کہ آدمی سوچے کہ جس پر اس کو حسد ہو رہا ہے اس کے ساتھ دشمنی پیدا ہو رہی ہے۔ اور دنیا کا دستور تو یہ ہے کہ آدمی دشمن کا بھلا کبھی بھی نہیں چاہتا، بلکہ ہمیشہ اس کا برا ہی چاہتا ہے، لیکن میں تو حسد کر کے اپنے دشمن کے ساتھ بھلائی کر رہا ہوں۔ وہ کیسے؟ وہ اس طرح کہ آدمی جب حسد کرتا ہے تو اس کے نتیجہ میں

وہ خود ہی ہمیشہ رنج وغم میں مبتلا رہتا ہے، اس کو دیکھ کر اس کا دشمن تو خوش ہی ہوگا کہ اچھا ہے وہ رنج وغم میں مبتلا ہے؛ یہ تو دشمن کا دنیوی فائدہ اور خود کا دنیوی نقصان ہے۔

اور آخرت کا نقصان اس طرح ہوگا کہ اسی حسد کے نتیجہ میں اس کی غیبت کرے گا، اس کے عیوب لوگوں کے سامنے بیان کرے گا، اس کو سماج ومعاشرہ اور سوسائٹی میں نیچا دکھلانے کی کوشش کرے گا، اس کو بدنام کرنے کے لئے تدبیریں کرے گا؛ اس طرح گویا اپنی نیکیاں اپنے دشمن کو دیتا رہے گا اور اپنی آخرت کا نقصان کرے گا۔

برائی کرنے والے کو مٹھائی

ایک مرتبہ ایک بزرگ اپنی مجلس میں تشریف فرما تھے، کسی نے آکر کہا: فلاں صاحب آپ کی برائی بیان کرتے ہیں۔ یہ سن کر وہ خاموش رہے اور کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے بعد اس آدمی کی خدمت میں مٹھائی بھیجی۔ کسی نے کہا: حضرت! وہ آپ کو گالیاں دیتا ہے اور آپ اس کے پاس ہدیہ بھیجتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا: بھائی! وہ میری برائیاں کر کے مجھے اپنی نیکیاں دے کر مجھ پر آخرت کا احسان کر رہا ہے، اب میں اس کے ساتھ وہ احسان تو نہیں کر سکتا؛ اس لئے میں دنیا کی چیز اس کو بھیج کر اس سے کم درجہ کا بدلہ چکا رہا ہوں۔

گھر کی دولت گھر ہی میں رہے

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کبھی اپنی مجلس میں نہ کسی کی غیبت کرتے تھے اور نہ کسی کی غیبت سنتے تھے۔ اور اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے: نہ کسی کی غیبت کرو اور نہ سنو۔ اور اگر غیبت کرنے کا شوق ہی ہو تو اپنے ماں باپ کی کرو؛ تاکہ گھر کی دولت گھر

ہی میں رہے، کسی دوسرے کے پاس نہ جانے پائے۔ چوں کہ آدمی جب کسی کی غیبت کرے گا، اپنی نیکیاں اس کو پیش کرے گا۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہم عصر ہیں، وہ فرمایا کرتے تھے: امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بہت بخیل ہیں۔ یعنی وہ اپنی نیکی کسی کو دینا نہیں چاہتے، نہ کسی کی غیبت کرتے ہیں، نہ سنتے ہیں۔

نہ اِدھر کے رہے، نہ اُدھر کے رہے

بہرحال! یہ بڑی اہم چیز ہے کہ حسد کرنے والا اس طرح برائیوں میں مبتلا ہوکر اپنی نیکیاں برباد کرتا ہے۔ اپنی آخرت کا بھی نقصان کرتا ہے، اور دنیا کا بھی نقصان اٹھاتا ہے۔ دنیا بھی برباد اور آخرت بھی برباد: ؂

نہ خدا ہی ملا، نہ وصالِ صنم ❁ نہ ادھر کے رہے، نہ ادھر کے رہے

والا مسئلہ ہوجاتا ہے۔ اس لئے آدمی کو یہ سوچنا چاہیے کہ حسد کر کے میں بجائے فائدہ کے اپنا نقصان کررہا ہوں، لہٰذا مجھے اس سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرنی چاہیے

معاصرانہ رقابت: اور اس کا علاج

ایک اور بات بھی ہے کہ کبھی معاصرانہ رقابت کے طور پر دل میں ایسا خیال پیدا جاتا ہے۔ یعنی بعض ساتھی ہم عصر اور ایک درجہ کے ہوتے ہیں، پھر ان میں سے کوئی کسی خوبی میں آگے بڑھ جاتا ہے تو بعض مرتبہ قدرتی طور پر دل میں اس کے متعلق یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ چیز اس کو کیوں مل گئی؟ وہ مجھ سے آگے کیوں بڑھ گیا؟ اور اس طرح کبھی غیر اختیاری طور پر حسد والا جذبہ دل میں پیدا ہوتا ہے؛ تو اس کا علاج کیا ہے؟۔

دیکھئے! اس کا علاج یہ ہے کہ اگر دل میں ایسا جذبہ پیدا ہو جائے تو اپنی زبان یا اپنے عمل سے اس کو نقصان پہنچانے کی کوئی تدبیر نہ کی جائے۔ نہ اس کی غیبت کی جائے، نہ اس کو سماج اور سوسائٹی میں نیچا دکھلانے کی کوئی شکل اختیار کی جائے۔ اور نہ ہی اس کو نقصان پہنچانے اور بے عزت کرنے کے لئے کوئی اقدام کیا جائے۔ کبھی ہوسکتا ہے کہ حسد والا جذبہ کسی ایسی بات پر اُبھارے جس سے اس کو نقصان پہنچے، لیکن آدمی اپنے آپ کو ان ساری چیزوں سے بچائے۔

اپنے اس جذبہ کو برا بھی سمجھے کہ میرے دل میں جو خیال پیدا ہو رہا ہے وہ بہت برا ہے۔ اور پھر ایک کام یہ کرے کہ اس کے لیے دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ اسے اور زیادہ ترقی دے، تاکہ خود اپنے دل پر آرے چلیں۔ اس دعا کے ذریعہ یہ جذبہ خود بخود کم ہوگا۔ اور اپنے دل میں سے اس جذبہ کے دور ہونے کی بھی دعا کی جائے؛ تب تو ان شاء اللہ اس پر کوئی گرفت اور پکڑ نہیں ہوگی۔

اور اگر آپ نے اس کے خلاف تدبیریں کیں، اس کی غیبت کی، اس کو نیچا دکھلانے کے لئے کوششیں کرتے رہے، اس کو بدنام کرتے رہے، اس کے صحیح یا غلط عیوب لوگوں کے سامنے پیش کرتے رہے؛ تو یہ حق العبد ضائع ہوا، اس لیے جب تک اس سے معافی نہیں مانگیں گے وہاں تک یہ معاملہ صاف نہیں ہوگا۔

اور اگر آپ نے اپنی زبان اور عمل سے اس کے خلاف کوئی تدبیر نہیں کی، نہ غیبت کی، نہ اس کو نیچا دکھلانے کی کوئی تدبیر کی، نہ اس کے عیوب بیان کئے؛ لیکن دل کے اندر اس کے خلاف جو جذبہ پیدا ہوا ہے اس کو برا بھی نہیں سمجھا اور اللہ تعالیٰ سے اس کے دور ہونے کی دعا بھی نہیں کی، تو اگرچہ بندے کا حق ضائع نہیں ہوا، لیکن عند اللہ

آپ گنہگار ہوئے۔ اب جب تک آپ اس سے توبہ نہیں کریں گے وہاں تک یہ گناہ معاف نہیں ہوگا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ''قَدْ دَبَّ إِلَيْكُمْ دَاءُ الأُمَمِ قَبْلَكُمْ الْحَسَدُ وَالْبَغْضَاءُ هِيَ الْحَالِقَةُ لاَ أَقُولُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ وَلَكِنْ تَحْلِقُ الدِّينَ '' اگلی امتوں میں جو بیماریاں (بغض، کینہ، حسد وغیرہ) تھیں، وہ تمہارے اندر بھی دھیرے دھیرے آرہی ہیں اور آئیں گی اور یہ مونڈنے والی ہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ وہ بالوں کو مونڈ دیتی ہیں؛ بلکہ یہ دین کو مونڈ دیتی ہیں (ترمذی شریف) اس لئے کہ آدمی جب حسد بغض اور کینہ میں مبتلا ہوگا تو اس کو نقصان پہنچانے کے لئے اپنی زبان اور اپنے عمل سے تدبیریں کرے گا، اور وہ سب اس کی نیکیوں کو ختم کرنے والی ہیں۔ اس لئے یہ بڑی خطرناک بیماری ہے جس سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔

آسان نسخہ

اور جیسا کہ پہلے عرض کیا جو آدمی اپنے دل کو ایسے میل اور کینہ سے پاک صاف رکھے گا اس کے لئے جنت کی بشارت ہے۔ مسند احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس کو حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ نے معارف القرآن کی آٹھویں جلد (ص:۹،۳۷۹/۳۸۰) میں نقل کیا ہے:۔

حضرت اَنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: ابھی ایک جنتی آدمی آنے والا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک انصاری صحابی ایسی حالت میں آئے کہ وضو کا پانی ان کے چہرے سے ٹپک رہا تھا اور ان کے بائیں ہاتھ میں جوتے تھے، وہ آکر بیٹھ گئے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کو دیکھ لیا۔ پھر دوسرے روز بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہی ارشاد فرمایا اور تھوڑی دیر کے

بعد صحابہ نے دیکھا کہ وہی کل والے صحابی کل کی طرح آئے کہ وضو کا پانی چہرے سے ٹپک رہا تھا، بائیں ہاتھ میں جوتے تھے اور آکر بیٹھ گئے۔ تیسرے روز بھی اسی طرح ہوا۔ نبی کریم ﷺ تین دن تک مسلسل ان کے متعلق جنت کی بشارت سناتے رہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ ذرا دیکھوں تو سہی کہ ان کا ایسا کون سا عمل ہے جس کی وجہ سے حضور اکرم ﷺ مسلسل تین دن سے ان کے متعلق جنت کی بشارت ارشاد فرما رہے ہیں۔ جب حضور کی مجلس ختم ہوئی اور سب باہر نکلے تو میں نے ان صحابی سے عرض کیا: چچا جان! میرا گھر والوں کے ساتھ کچھ جھگڑا ہو گیا ہے، اس لئے میں نے یہ طے کرلیا ہے کہ تین دن تک اپنے گھر نہیں جاؤں گا، اگر آپ اجازت دیں تو آپ کے یہاں آکر قیام کرلوں اور ٹھہر جاؤں۔ انہوں نے کہا: ضرور آجاؤ۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: میں ان کے یہاں گیا اور تین رات تک بیدار رہ کر دیکھتا رہا کہ وہ کیا عمل کرتے ہیں، لیکن وہ تو رات کو آتے، سونے سے پہلے کچھ پڑھتے اور سو جاتے، پھر فجر کے لئے ہی اٹھتے، تہجد کے لئے بھی نہیں اٹھتے۔ اور دن بھر بھی میں نے ان کے اعمال کا جائزہ لیا تو ایک عام مسلمان جس طرح نماز وغیرہ کی پابندی کرتا ہے، وہی ان میں بھی دیکھا۔ تین دن تک میں ان کے ساتھ رہا، رات کو بھی دن کو بھی ان کے اعمال کا جائزہ لیتا رہا، لیکن کوئی ایک عمل بھی مجھے ایسا نظر نہیں آیا جس کے متعلق میرا دل گواہی دے کہ ان کے اس عمل کی وجہ سے جنت کی بشارت سنائی گئی ہے، البتہ اس پورے عرصہ میں مَیں نے ان کی زبان سے کوئی بھی کلمہ بجز کلمۂ خیر کے نہیں سنا۔

جب تین دن پورے ہوئے اور قریب تھا کہ میرے دل میں ان کے عمل کی

حقارت آجائے تو میں نے ان سے عرض کیا: چچا جان! میرا تو گھر والوں سے کچھ جھگڑا نہیں ہوا تھا، البتہ حضور اکرم ﷺ نے آپ کے متعلق تین دن تک یہ ارشاد فرمایا تھا، اس لئے میں چاہتا تھا کہ آپ کے اعمال دیکھ کر فیصلہ کروں کہ وہ کون سا عمل ہے جس کی وجہ سے حضور ﷺ نے یہ بشارت سنائی ہے، پھر میں تین دن آپ کے ساتھ رہا لیکن عجیب بات ہے کہ مجھے تو کوئی ایسا عمل نظر نہیں آیا، اب آپ ہی بتلا دیجیے کہ آپ کا وہ کون سا عمل ہے جس کی وجہ سے آپ نے یہ درجہ پایا ہے؟ انہوں نے کہا: بھائی! میرے پاس تو کوئی عمل نہیں ہے، آپ نے بھی دیکھ لیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: مَیں مایوس ہو کر واپس ہونے لگا تو انہوں نے مجھے بلایا اور کہا: ہاں! ایک بات ہے کہ ”مَیں اپنے دل میں کسی مسلمان کے متعلق کینہ کپٹ، برائی اور میل نہیں پاتا، اور کسی پر حسد نہیں کرتا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے کہا: بس یہی وہ عمل ہے جس پر نبیٔ کریم ﷺ نے جنت کی بشارت سنائی ہے(۱)۔

اس لئے میں تو کہا کرتا ہوں کہ دوسرے اعمال تو ہم سے ہوتے نہیں، لیکن یہ ایک بہت آسان نسخہ ہے، اگر ہم اس کا اہتمام کرلیں کہ اپنے دل میں کسی کے متعلق کوئی میل، بغض، کینہ، حسد اور برائیاں نہ رکھیں؛ تو ان شاء اللہ تعالیٰ ہمارے لئے بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت کی بشارت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق نصیب فرمائے۔

---

(۱) ابن کثیر نے اس کو نقل کر کے فرمایا کہ اس کو نسائی نے بھی عمل الیوم واللیلۃ میں نقل کیا ہے اور اس کی اسناد صحیح علیٰ شرط الصحیحین ہے۔

النهي عن التجسس والتسمع لكلام من يكره استماعه

لوگوں کے احوال کی ٹوہ میں رہنے کی ممانعت

وقال الله تعالىٰ:- وَلَا تَجَسَّسُوْا.

وقال تعالیٰ: والَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ والْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا، فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَاناً وإِثْماً مُبِيناً (الأحزاب:۵۸)

جاسوسی کی ممانعت

نیا عنوان قائم کیا ہے: لوگوں کے احوال کی ٹوہ میں رہنا، ان کے حالات کو معلوم کرنے کے لئے جستجو اور کوشش کرنا۔ اور کوئی آدمی اگر اپنی بات سنوانا نہ چاہتا ہو پھر بھی اس کو سننے کی کوشش کرنا؛ یہ دونوں باتیں ممنوع ہیں۔

سورۂ حجرات کی آیت کا ایک ٹکڑا پیش کیا ہے: ﴿وَلَا تَجَسَّسُوْا﴾ جاسوسی مت کرو، کسی کی حالت اور خبر معلوم کرنے کی کوشش مت کرو۔

سورۂ احزاب کی آیت ذکر کی ہے جو پہلے بھی کئی مرتبہ گزر چکی ہے کہ: جو لوگ ایمان والے مردوں اور عورتوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں بغیر اس کے کہ انہوں نے کوئی ایسا کام کیا ہو جس کی وجہ سے وہ اس تکلیف کے حقدار بنتے ہوں؛ تو ایسے لوگوں نے اپنے اوپر جھوٹ اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھا لیا۔ معلوم ہوا کہ جو لوگ دوسروں کی باتیں سننے کی

کوشش کرتے ہیں، یا ان کے حالات کی ٹوہ اور جستجو میں لگے رہتے ہیں، گویا وہ ان کو ایک طرح کی تکلیف پہنچاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں علامہ نوویؒ نے حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت پیش فرمائی ہے۔ آگے دو عنوانات قائم کریں گے: ''النهي عن سوء الظن بالمسلمين من غير ضرورة'' مسلمانوں کے ساتھ بلاوجہ بدگمانی میں مبتلا ہونا شرعاً ممنوع ہے۔ اور ''تحريم احتقار المسلمين'' مسلمانوں کو حقیر سمجھنے کا حرام ہونا، ان ابواب کے ذیل میں بھی حضرت ابوہریرہؓ کی اسی روایت کے بعض حصوں کو پیش کریں گے۔ یہاں پوری روایت ذکر کردی ہے۔

تحسّس اور تجسّس حرام ہے

۱۵۷۰:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه: أنَّ رسولَ الله ﷺ قالَ: ((إيَّاكُمْ وَالظَّنَّ، فَإنَّ الظَّنَّ أكْذَبُ الحَدِيثِ، ولا تحسَّسوا وَلاَ تَجَسَّسُوا وَلاَ تَنَافَسُوا، وَلاَ تَحَاسَدُوا، وَلاَ تَبَاغَضُوا، وَلاَ تَدَابَرُوا، وَكُونُوا عِبَادَ اللهِ إخْوَاناً كَمَا أمَرَكُمْ. المُسْلِمُ أخُو المُسْلِمِ، لاَ يَظْلِمُهُ، وَلاَ يَخْذُلُهُ وَلاَ يَحْقِرُهُ، التَّقْوَى هاهُنَا)) وَيُشِيرُ إلَى صَدْرِهِ ((بِحَسْبِ امْرِىءٍ مِنَ الشَّرِّ- أنْ يَحْقِرَ أخَاهُ المُسْلِمَ، كُلُّ المُسْلِمِ عَلَى المُسْلِمِ حَرَامٌ: دَمُهُ، وَعِرْضُهُ، وَمَالُهُ. إنَّ اللهَ لاَ يَنْظُرُ إلَى أجْسَادِكُمْ، وَلاَ إلَى صُوَرِكُمْ، وَلكِنْ يَنْظُرُ إلَى قُلُوبِكُمْ وأعْمَالِكُمْ)).

وَفِي رواية: ((لاَ تَحَاسَدُوا، وَلاَ تَبَاغَضُوا، وَلاَ تَجَسَّسُوا، وَلاَ تَحَسَّسُوا، وَلاَ تَنَاجَشُوا وَكُونُوا عِبَادَ اللهِ إخْوَاناً)).

وفي رواية: ((لاَ تَقَاطَعُوا، وَلاَ تَدَابَرُوا، وَلاَ تَبَاغَضُوا، وَلاَ تَحَاسَدُوا،

وَ كُونُوا عِبَادَ اللّٰهِ إِخْوَاناً)) وَفِي رِوَايَةٍ: ((وَلاَ تَهَاجَرُوا وَلاَ يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلَى بَيْعِ بَعْضٍ)). (رواه مسلم بكلّ هٰذِهِ الروايات، وروى البخاريُّ أكْثَرَهَا)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: بدگمانی سے بچو، اس لئے کہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے۔ اور لوگوں کے حالات معلوم کرنے کی جستجو مت کرو۔ اور (دنیا کی چیزوں کے حاصل کرنے میں) آپس میں ریس نہ کرو۔ اور حسد مت کرو۔ اور آپس میں بغض وعداوت اور دشمنیاں مت رکھو۔ اور ایک دوسرے کو پیٹھ نہ دکھاؤ، اور اللہ کے بندے! بھائی بھائی بن کر رہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ تو وہ خود اس پر ظلم کرے، اور نہ اس کو بے یار ومددگار چھوڑے، اور نہ اس کو حقیر سمجھے؛ اور (چوں کہ تقویٰ ظاہر میں تو نظر نہیں آتا، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے سینہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:) تقویٰ یہاں ہے۔ (پھر فرمایا:) ایک آدمی کی برائی کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔ ایک مسلمان پورا کا پورا دوسرے مسلمان پر حرام ہے؛ اس کا خون بھی، اس کی عزت بھی، اور اس کا مال۔ (پھر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا:) اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں کو اور تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتے، بلکہ وہ تو تمہارے دلوں کو اور تمہارے اعمال کو دیکھتے ہیں۔

اسی روایت کے بعض الفاظ دوسری روایت میں بھی آئے ہیں، جس میں ایک جملہ یہ بھی ہے: اور اگر خریدنے کا ارادہ نہ ہو تو خواہ مخواہ اس چیز کا بھاؤ بڑھانے کے لئے قیمتیں مت لگاؤ۔ اور ایک روایت میں یہ بھی ہے: ایک دوسرے کے ساتھ قطع تعلق مت کرو۔ اور ایک آدمی نے کوئی چیز خرید لی ہو تو پھر دوسرا آدمی اس کو نہ خریدے۔

افادات: - کسی کے متعلق کسی گناہ کی کوئی ایسی بات سوچنا جس کو ہم نے اپنی آنکھوں سے کرتے ہوئے نہیں دیکھا ہے، یا کوئی گناہ کی بات کرتے ہوئے ہم نے اپنے کانوں سے نہیں سنا ہے؛ اسی کو ''بدگمانی'' کہتے ہیں، اور اس کی شریعت اجازت

نہیں دیتی ہے بلکہ جو چیز ہمارے سامنے پیش آئی ہو اس کے متعلق بھی ہمیں چشم پوشی سے کام لینے کی ہدایت ہے، جیسا کہ پہلے ایک مستقل عنوان میں اس کی تفصیل آچکی ہے۔

بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ دوسروں کے متعلق مختلف وساوس اور خیالات میں مبتلا رہتے ہیں، اور سوچتے ہیں کہ اس نے یہ کیا ہوگا، فلاں نے وہ کیا ہوگا۔ ان کے متعلق محض گمان کرتے ہیں، ایسے گمان کی بنیاد پر کسی پر تہمت لگانے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ بدگمانی حرام کام ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔

''وَلَا تَحَسَّسُوْا وَلَا تَجَسَّسُوْا'' لوگوں کے حالات معلوم کرنے کی جستجو مت کرو یہاں دو لفظ ''تحسس'' اور ''تجسس'' استعمال کئے گئے ہیں۔ ''تجسس'' کے متعلق لکھا ہے کہ ہاتھ سے کسی چیز کے چھونے کو کہتے ہیں، یعنی ہاتھ سے کسی کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کرنا۔ اور ''تحسس'' حواس سے ماخوذ ہے، یعنی آنکھ، کان وغیرہ حواس کے ذریعہ لوگوں کے حالات کو معلوم کرنے کی کوشش کرنا۔

بعض حضرات فرماتے ہیں: لوگ جو چیز ہم سے چھپانے کا اہتمام کریں پھر بھی ہم از خود آگے بڑھ کر اس کو معلوم کرنے کی کوشش کریں؛ اس کو ''تجسس'' کہتے ہیں، اور عام حالات میں کسی چیز کے معلوم کرنے کے لئے کوشش کرنے کو ''تحسُّس'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ باب اسی لئے قائم کیا ہے کہ لوگوں کے چھپے ہوئے حالات کو معلوم کرنے کی کوشش مت کرو۔ جیسے: بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ اسی فکر میں لگے رہتے ہیں کہ فلاں گھر میں جاتا ہے؛ تو کیا کرتا ہے۔ فلاں کے پاس بیٹھتا ہے تو وہاں کیا باتیں ہوتی ہیں؟ کبھی دوسروں سے پوچھتا ہے کہ تم وہاں سے آئے تو کیا باتیں ہو رہی تھیں۔ بعضوں

کی عادت ہوتی ہے کہ دوسروں کے فون سنتے ہیں، جیسے کبھی ایسا ہوا کہ فون کا ریسیور اُٹھایا تو دوسروں کی باتیں سنائی دی؛ تو خاموشی سے سنتے رہتے ہیں۔ یا بعض لوگ اپنے گھر ہی میں اپنے بھائیوں اور اپنے رشتہ داروں کے فون یا باتیں سننے کی کوشش کرتے ہیں؛ یہ سب ''تجسس'' میں داخل ہے۔

خلاصہ یہ کہ لوگوں کے احوال معلوم کرنے کے لئے ٹوہ میں لگے رہنے کی کوشش کرنے کو ''جاسوسی اور تجسس'' سے تعبیر کیا گیا ہے، شریعت اس کی بالکل اجازت نہیں دیتی، یہ حرام ہے، اور اس پر بڑی سخت وعید آئی ہے۔ ہاں! کسی کے متعلق اگر یہ اندیشہ ہو کہ اس کی طرف سے ہمیں جانی یا مالی نقصان پہنچانے کی بھرپور کوشش ہو رہی ہے، لہٰذا اس کی ان بری تدبیروں سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے اس کی ان بری تدبیروں کو معلوم کرنے کی کوشش کی جائے؛ تو اس کی شریعت اجازت دیتی ہے۔

دنیوی چیزوں میں ریس کرنا ممنوع ہے

''وَلَا تَنَافَسُوْا'' اور دنیا کی چیزوں کے حاصل کرنے میں، مال و دولت کی زیادتی میں، عہدہ اور منصب حاصل کرنے کے لئے آپس میں ریس نہ کرو۔ مثلاً: اس نے فلاں عہدہ حاصل کرلیا، وہ ہماری کمیٹی کا صدر بن گیا، تو مَیں بھی صدر بن جاؤں، اس کے لئے آپس میں مقابلہ کرنا، جیسے: دورِ حاضر میں جمہوریت کے نام پر جو الیکشن ہوتے ہیں، اس کو شریعت پسند نہیں کرتی۔ اسلام میں تو عہدوں کی تقسیم کا باقاعدہ حق صاحبِ اختیار، بادشاہِ وقت، یا حاکمِ وقت کو دیا گیا ہے کہ وہ جس کے اندر اس عہدہ کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی صلاحیت دیکھے اور اس عہدہ کے تقاضے پورا کرنے کے لئے جن صفات کی ضرورت ہے وہ صفات جس کے اندر پائے، اسی کو اپنی طرف سے وہ

عہدہ دے، اور اگر کوئی سامنے سے چل کر کسی عہدہ کا مطالبہ کرے تو ایسے آدمی کو عہدہ دینے سے منع کیا گیا ہے۔

چناں چہ حضرت ابوموسیٰ اُشعریؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، میرے ساتھ دو آدمی اور بھی ہو گئے، مجھے پتہ نہیں تھا کہ وہ کس مقصد کے لئے حضور کے پاس حاضری دے رہے ہیں، وہاں جا کر انہوں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی عہدہ پر مقرر کرنے کی درخواست رکھی، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہم مناصب اور عہدے ان لوگوں کو نہیں دیتے جو اپنی طرف سے مطالبہ کریں۔ (بخاری و مسلم)

لیکن آج کل تو الیکشن میں خود ہی مطالبے کئے جاتے ہیں کہ مجھے ووٹ دو، گویا اس عہدہ کو حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں، حالاں کہ شرعی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ پسندیدہ نہیں ہے، بلکہ لوگ خود ہی ایسے آدمی کو- جو اس ذمہ داری کو ادا کرنے کی صفات کا حامل ہو- آگے بڑھائیں۔ لیکن عام طور پر ایسے مقابلوں میں ایسے ہی لوگ آتے ہیں جو اس کے اہل نہیں ہوتے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ شریف لوگ تو اس میں حصہ نہیں لیتے، بلکہ اپنے آپ کو ایسی چیزوں سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

بہر حال! دنیا کی مال و دولت، عہدہ، دنیوی عزت و آبرو کو بڑھانے کے لئے مقابلہ آرائی اور ریس کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ یہی جذبہ آگے جا کر آپس میں حسد کو پیدا کرنے والا، بغض و عداوت کو پیدا کرنے والا ہوتا ہے؛ اسی لئے فرمایا: حسد مت کرو۔ جب ریس اور مقابلے ہوں گے تو حسد ضرور پیدا ہوگا، اس لئے ریس اور مقابلے کی ممانعت کر کے حسد کی جڑ ہی کاٹ دی گئی (حسد کے متعلق بیان گذر چکا ہے۔ اور حسد ہی کے نتیجہ میں آپس میں بغض، عداوتیں اور دشمنیاں بھی پیدا ہوتی ہے، اس

لیے فرمایا:) آپس میں بغض وعداوت اور دشمنیاں مت رکھو۔

بھائی بھائی بن کر رہو

''وَلَا تَدَابَرُوا، وَکُونُوا عِبَادَ اللّٰہِ إِخْوَانًا کَمَا أَمَرَکُمْ'' ایک دوسرے کو پیٹھ نہ دکھلاؤ، اور اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن کر رہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ قرآنِ پاک کہتا ہے: ''إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَۃٌ'' مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ گویا جس طرح ایک بھائی اپنے بھائی کے ساتھ ہر چیز میں حسنِ سلوک کا اہتمام کرتا ہے، اسی طرح ایک مسلمان بھی اسلام کی بنیاد پر اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ ہر طرح کی بھلائی کا اہتمام کرے۔

گروہ بندیاں تعلیماتِ اسلام کے خلاف

لیکن ہم نے آج کل آپس میں گروہ بندیاں اور اختلافات پیدا کر رکھے ہیں کہ فلاں میرے وطن کا نہیں ہے، تو میں اس کے ساتھ بھلائی کیوں کروں؟ فلاں میری کمیونٹی، میرے خاندان اور میری برادری سے تعلق نہیں رکھتا، تو میں اس کے ساتھ بھلائی کیوں کروں؟ فلاں کی میرے ساتھ دوستی نہیں ہے تو میں اس کے ساتھ بھلائی کیوں کروں؟ حالاں کہ ان ساری بنیادوں پر مدد کرنے اور ساتھ دینے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں: مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، چاہے آپ کی اس سے کوئی رشتہ داری نہیں ہے، وہ آپ کا ہم وطن نہیں ہے، آپ کی برادری سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، کوئی دوستی بھی نہیں ہے، لیکن وہ مسلمان ہے، تو اسی ناطے سے اس کی مدد، خیر خواہی اور بھلائی کا معاملہ کرنا ہمارے لئے ضروری ہے۔ اسلام

کے نام پر ایک حق ہوتا ہے، اسلام نے ساری گروہی عصبیتوں اور پارٹی بندیوں اور فرقہ بندیوں کو ختم کر دیا ہے۔

اور آج کل تو معاملہ ایسا ہو گیا کہ وہ ہماری پارٹی کا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ وہ حق پر نہیں ہے، بلکہ ظالم ہے اور اسی کی غلطی ہے؛ تب بھی اس کے ظلم میں ہم اس کا ساتھ دیتے ہیں، اور وہ بھی مدد کے لئے پکارتا ہے کہ میری برادری، میرے رشتہ دار، میرے وطن والو آجاؤ۔ حالاں کہ وطن اور برادری کی بنیاد پر آپس میں ایک دوسرے کو مدد کے لئے بلانا جاہلیت کا نعرہ ہے، اور اسی کو عصبیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

نعرۂ جاہلیت

غزوۂ مریسیع (جس کو غزوۂ بنوالمصطلق بھی کہا جاتا ہے) کے موقعہ پر ایک انصاری اور ایک مہاجری کے درمیان جھگڑا ہو گیا، انصاری نے پکارا: اے انصار! میری مدد کے لئے آؤ۔ اور مہاجری نے بھی پکارا: اے مہاجرین! میری مدد کے لئے آؤ، حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جہاں تشریف فرما تھے، آپ کے گوشِ مبارک میں جب یہ آوازیں پڑیں تو آپ نے فرمایا: ''مَابَالُ دَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ'' یہ جاہلیت والا نعرہ کہاں سے لائے؟ ''دَعُوهَا فَإِنَّهَا مُنْتِنَةٌ'' اس نعرہ کو چھوڑ و؛ یہ تو بڑا بدبودار ہے۔ (بخاری و مسلم)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو۔ کسی نے سوال کیا: اے اللہ کے رسول! اگر وہ مظلوم ہو تو مدد کرنا سمجھ میں آتا ہے اور میں اس کی مدد کروں گا، لیکن ظالم ہو تو پھر مدد کیسی؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ظالم ہو تب بھی مدد اس طرح کرو کہ اس کو ظلم سے روک دو۔ ایک آدمی غلط لائن پر جا رہا ہے تو ایسا نہیں ہے کہ آپ اس کا ساتھ دیں، بلکہ اس کو اس غلط لائن سے بچا لینا یہ اس کی مدد

ہے۔آج کل تو محض اپنی رشتہ داری، اپنی کمیونٹی اور برادری کی بنیاد پر، محض ہم وطنی کی بنیاد پر، محض دوستی کی بنیاد پر، محض اپنی پارٹی اور جماعت کی بنیاد پر ساتھ دیا جانے لگا ہے، حالاں کہ جانتے ہیں کہ یہ غلط ہے، اور خود اقرار بھی کرتے ہیں، اس کے باوجود اس کا ساتھ دیا جارہا ہے، شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔

خاندان وقبائل کیوں؟

خاندان قبائل برادریاں سب تعارف کے لئے ہیں، باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:
﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا﴾ اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد (حضرت آدم علی نبیّنا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) اور ایک عورت (حضرت حوا علیہا السلام) سے پیدا کیا ہے، اور خاندان اور برادریاں پہچان کے لیے بنائیں کہ یہ فلاں برادری کا ہے اور وہ فلاں برادری کا ہے۔ یہ اس لئے نہیں ہیں کہ اس کے ذریعہ ایک دوسرے پر فخر کرو اور اپنی بڑائی جتلاؤ کہ میرا تعلق فلاں خاندان اور فلاں برادری سے ہے، میں اونچا ہوں اور وہ نیچا ہے۔ بلکہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتحِ مکہ کے موقعہ پر جو تقریر فرمائی تھی، اس میں فرمایا تھا: تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے، لہٰذا کسی گورے کو کالے پر اور کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں عزت تو تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔ اسی کو قرآنِ کریم میں بھی فرمایا گیا ہے: ''إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ'' بے شک اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں تم میں سب سے زیادہ شریف اور عزت والا وہ ہے جو تقویٰ والا اور اللہ سے ڈرنے والا ہو ہم کسی کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے کہ کون تقویٰ والا ہے، اس لیے کہ تقویٰ تو دل سے تعلق رکھنے والی چیز ہے، وہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، اسی لئے فرمایا: ''إِنَّ اللَّهَ

عَلِيمٌ خَبِيرٌ'' تقویٰ کس میں زیادہ اور کس میں کم ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں، ہم کسی کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے، دلوں کے حال سے اللہ تعالیٰ ہی واقف اور باخبر ہیں۔ اس لئے کسی کے متعلق فیصلہ کرنے کا حق اور اختیار ہمیں نہیں دیا گیا ہے۔

آج کل ہم نے جو بنیادیں قائم کر دی ہیں وہ صحیح نہیں ہیں، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم یہی ہے کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ تو وہ خود اس پر ظلم کرے گا، اور نہ اس کو بے یار و مددگار چھوڑے گا۔ اگر مسلمانوں پر کسی جگہ ظلم ہو رہا ہے، یا کسی جگہ کوئی پریشانی میں مبتلا ہیں اور وہ آپ کو مدد کے لئے پکار رہے ہیں، اور آپ میں ان کی مدد کرنے کی طاقت ہے؛ تو ان کی مدد کرنا لازم اور ضروری ہے۔ اگر مدد کرنے کی طاقت رکھنے کے باوجود آپ ان کی مدد نہیں کرتے تو آپ گنہگار ہیں۔

کسی کو حقیر نہ سمجھو

''وَلَا يَحْقِرُهُ'' اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مسلمان کو اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ دوسرے مسلمان کو حقیر سمجھے۔ کسی کو یا تو دنیاوی کمزوری کی وجہ سے حقیر سمجھا جاتا ہے، یا دینی کمزوری کی وجہ سے حقیر سمجھا جاتا ہے، جیسے: آپ کو اللہ تعالیٰ نے کسی اونچے گھرانے میں پیدا کیا، اس لئے آپ کسی ایسے آدمی کو- جو نسبی اعتبار سے کم درجہ والا ہو- حقیر سمجھیں۔ یا آپ کو اللہ تعالیٰ نے حسن و جمال عطا فرمایا اور کوئی دوسرا بدصورت ہے؛ تو آپ اس کو حقیر سمجھیں۔ یا آپ کو اللہ تعالیٰ نے دولت و ثروت سے مالا مال کیا، اور کسی کے پاس دولت نہیں ہے، وہ بے چارہ غریب و محتاج ہے، اس بنیاد پر آپ اس کو حقیر سمجھتے ہیں۔ یا آپ کو اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا ہے اور وہ علم سے محروم ہے، اس بنیاد پر آپ اس کو حقیر سمجھتے ہیں۔ یہ ساری نعمتیں اللہ تعالیٰ کی ملک ہیں، اگر اللہ تعالیٰ کی طرف

سے آپ کو دی گئیں ہیں تو اس کا مطلب یہ تھوڑا ہی ہے کہ ان نعمتوں کی وجہ سے آپ اللہ تعالیٰ کے دوسرے بندوں کو حقیر سمجھیں۔ بلکہ ان نعمتوں کا شکر ادا کرو اور حق ادا کرو، اور ان نعمتوں کی بنیاد پر آپ پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کو پورا کرو۔

اس پر فخر کرنا کیا معنیٰ رکھتا ہے؟

شریعت اس بات کی کہاں اجازت دیتی ہے کہ ان نعمتوں کے مل جانے کی وجہ سے اپنے آپ کو اونچا سمجھنے لگو، بلکہ ان نعمتوں میں سے بہت سی نعمتیں ایسی ہیں کہ جن کے حصول میں آدمی کے اپنے کسی عمل کو کوئی دخل بھی نہیں ہے، مثلاً: کوئی آدمی حسین وخوبصورت ہے، تو اس کے خوبصورت ہونے میں کیا اس کے کسی عمل کو دخل ہے؟ اس نے کوئی محنت کی تھی جس کی وجہ سے اس کا چہرہ خوبصورت اور حسین بن گیا؟ ایسا نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو خوبصورت پیدا کیا۔ تو جو چیز تمہارے عمل اور اختیار سے تمہیں حاصل نہیں ہوئی اس پر فخر کرنا کیا معنیٰ رکھتا ہے؟

اسی طرح ایک آدمی اونچے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو نسبی شرف عطا فرمایا؛ تو اس میں اس کا کون سا کمال ہے؟ لہٰذا اس بنیاد پر کسی ایسے آدمی کو- جو بے چارہ نسبی شرافت سے محروم ہے، یا کسی نچلے طبقے سے تعلق رکھتا ہے- حقیر سمجھنے کی کون اجازت دے گا؟

محض اللہ کا فضل

بعض نعمتیں ایسی ہیں جن کا ملنا بظاہر آدمی کے عمل دخل پر موقوف ہوتا ہے، جیسے: دولت وثروت۔ اور بعضوں کو تو دولت وثروت بھی ویسے ہی مل جاتی ہے، جیسے:

باپ نے کمایا تھا، وہی دولت اس کو وراثت کے اندر مل گئی؛ تو پھر اس دولت کی وجہ سے کسی غریب کو حقیر سمجھنے کی شریعت کہاں اجازت دے گی؟ اور مان لو کہ اگر آپ نے کمانے کی محنت بھی کی ہے؛ تب بھی جو ملتا ہے وہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل ہی سے ملتا ہے۔

تم تو بڑے منحوس ہو

جیسے: میں ہمیشہ ایک قصہ سناتا رہتا ہوں کہ ایک آدمی ایک اونٹ لے کر جا رہا تھا اور اونٹ پر بوجھ لاد رکھا تھا، دونوں طرف دو بوریاں تھیں۔ ایک صاحب جو ذرا پڑھے لکھے اور سمجھدار تھے وہ اس کے ساتھ ہو گئے، راستہ میں دونوں میں آپس میں باتیں ہو رہی تھیں، اسی درمیان پڑھے لکھے صاحب نے اس سے پوچھا: ان دو بوریوں میں کیا بھر رکھا ہے؟ اس نے کہا: ایک میں تو گیہوں ہیں اور دوسری بوری میں ریت بھر رکھا ہے۔ چوں کہ وہ لوگ صحراء میں (رَن کے اندر) سفر کر رہے تھے تو اس نے کہا: ریت تو یہاں ڈھیروں پڑا ہوا ہے، اس کو بوری میں بھر کر لادنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس نے کہا: ایک طرف کی بوری کے اندر گیہوں ہیں، میں نے بیلنس کے لئے دوسری بوری میں ریت بھر دی۔ انہوں نے کہا: اللہ کے بندے! بیلنس اور توازن کے لئے تو ایسا بھی کر سکتا تھا کہ آدھے آدھے گیہوں دونوں بوریوں میں تقسیم کر دیتا، اس طرح اونٹ پر بوجھ بھی کم ہو جاتا اور سفر بھی آسان ہوتا۔ اس نے کہا: تمہاری بات تو بڑی معقول ہے، چناں چہ اس نے ایسا ہی کیا، اور دونوں بوریوں میں گیہوں تقسیم کر کے لاد دئے۔ چوں کہ پہلے بوجھ زیادہ تھا اس لئے اونٹ تیز نہیں چل سکتا تھا، اب تیز رفتار ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ اس نے کیسی سمجھداری کی بات کی ہے، یقیناً اس کے پاس مجھ سے بہت زیادہ مال ہوگا۔ وہ دیہات کا رہنے والا تھا اس لئے اس نے پوچھا: تمہارے

یہاں گائیں کتنی ہیں؟ اس نے کہا: ایک بھی نہیں۔ اس نے پوچھا: بھینسیں کتنی ہیں؟ اس نے کہا: ایک بھی نہیں۔ اس نے پوچھا: بکریاں تو ہوں گی؟ اس نے کہا: وہ بھی نہیں۔ اس نے پوچھا: پھر تو تمہاری زمین اور جاگیریں ہوں گی؟ اس نے کہا: یہ سب کچھ بھی نہیں ہے۔ تو وہ کہنے لگا: تم تو بڑے منحوس آدمی ہو، اگر میں تمہاری بات پر عمل کروں گا تو میرے اندر بھی نحوست آجائے گی، اس لئے فوراً ایک بوری میں گیہوں بھر کر دوسری بوری میں پھر سے ریت بھری اور اونٹ پر لاد کر توازن برابر کردیا۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اگر عقل کی بنیاد پر روزی ملتی تو جو لوگ بیوقوف و نادان ہیں وہ سب سے زیادہ بھوکے مرتے، حالاں کہ دنیا کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ حقیقت میں تو یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ اپنے فضل ہی سے دیتے ہیں، وہ یوں سمجھتا ہے کہ میں نے محنت کی ہے، حالاں کہ ہم اور آپ دیکھتے ہیں کہ جن کے پاس دولت ہے، ان سے زیادہ محنت کرنے والے دوسرے بے شمار لوگ ہیں، لیکن ان کے پاس ایک پائی بھی نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے ملتا ہے۔

ذرا بندِ قبا دیکھ

اسی طرح کسی کو اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا اور عمل کی توفیق نصیب فرمائی ہے، کسی کو تقویٰ کی دولت عطا فرمائی، اور گناہوں سے بچنے کی سعادت نصیب فرمائی ہے؛ تو یہ سب بھی اللہ تعالیٰ ہی کے فضل سے ملا ہے۔ قرآنِ پاک میں خود باری تعالیٰ فرماتے ہے: ﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ مَا زَكٰى مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ أَبَدًا وَلَٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّي مَن يَشَآءُ﴾ جو لوگ گناہوں سے بچتے ہیں اور جن کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کی دولت عطا فرمائی ہے، اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت شامل حال نہ ہوتی تو تم میں سے

کوئی بھی گناہوں سے نہیں بچ سکتا تھا۔ غور کیجئے کہ کتنی تاکید کے ساتھ جملہ آیا ہے: ''مَازَکیٰ مِنْکُمْ مِنْ أَحَدٍ أَبَداً'' نکرہ نفی کے ماتحت آیا ہے جو تاکید کا فائدہ دیتا ہے۔ اور ''أبداً'' کتنی سخت تاکید کے ساتھ لایا گیا ہے۔ ترجمہ اس طرح ہوگا کہ تم میں سے کبھی کسی گناہ سے بچ ہی نہیں سکتا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے گناہوں سے بچنے کی توفیق اور سعادت عطا فرماتا ہے۔ لہٰذا جو آدمی گناہوں سے بچ رہا ہے وہ کبھی کسی گنہ گار کو دیکھ کر اس کو حقیر نہ سمجھے، شریعت کسی گنہ گار کو حقیر سمجھنے کی اجازت نہیں دیتی۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مَیں ہر مسلمان کو فی الحال اور ہر کافر کو فی المآل والاحتمال اپنے سے بہتر سمجھتا ہوں۔ پتہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کس کے ساتھ کیا معاملہ ہے۔ ایک کافر گو اس وقت کافر ہے، لیکن ہوسکتا ہے کہ کل کو اللہ تعالیٰ اس کو ایمان کی توفیق عطا فرمادے اور اس کی موت ایمان پر ہوجائے اور وہ ہم سے آگے بڑھ جائے۔

بہرحال! اگر کسی کو اللہ تعالیٰ کسی نیکی کی توفیق عطا فرمائے تو اس نیکی کی وجہ سے کسی دوسرے کو حقیر سمجھنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی، اسی کو باری تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''فَلَاتُزَكُّوْا أَنْفُسَكُمْ هُوَأَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى'' اپنی پاکی مت بیان کرو، تمہارے اندر کے حال کو اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں، تمہاری پولوں سے وہ واقف ہے، کون کیسا ہے اس کو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں:۔

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت	دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندِ قبا دیکھ

حقیقت یہ ہے کہ جتنی بھی نعمتیں ہیں ان کا شکر ادا کرنا چاہیے، اللہ کا ممنون واحسان مند ہونا چاہیے کہ اے اللہ! تو نے محض اپنے فضل سے یہ چیز عطا فرمائی، میں اس لائق نہیں تھا، اور ان نعمتوں کی وجہ سے جو جو ذمہ داریاں ہم پر عائد ہوتی ہیں ان کو ادا کرنے کا

اہتمام کرنا چاہیے، ان نعمتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے کسی بھی بندے کو حقیر سمجھنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی، اس کا بڑا بُرا انجام ہوتا ہے۔

یہ نصیحت خوب یاد رکھیے

یہ نصیحت خوب یاد رکھیے کہ کسی کی تحقیر دل میں نہ آنے پائے۔ اگر کسی کی تحقیر میں مبتلا ہوئے تو اللہ تعالیٰ بڑی آزمائش میں ڈال دیں گے۔ اس لئے اپنے آپ کو ہر ایک کی تحقیر سے بچانے کی پوری کوشش ہونی چاہیے، کسی کے ساتھ بھی تحقیر کا معاملہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک قصہ سناتے تھے:۔

ایک صاحب نے آکر مجھ سے کہا: میری ماں کا انتقال ہوگیا ہے اور مجھے پیسوں کی ضرورت ہے۔ میں نے اس کو کچھ پیسے دیدیئے۔ ان کے جانے کے بعد ایک اور صاحب میرے پاس آئے اور کہا: آپ کے پاس ابھی جو صاحب آئے تھے شاید انہوں نے یہ کہا ہوگا کہ میری ماں کا انتقال ہوگیا ہے، مجھے پیسوں کی ضرورت ہے؟ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: جی ہاں! یہی کہا تھا۔ انہوں نے کہا: آپ نے پیسے دیدیئے؟ حضرت نے کہا: جی ہاں! دیئے۔ انہوں نے کہا: حضرت! وہ تو جھوٹا آدمی ہے، آپ نے پیسے کیوں دیئے؟ حضرت نے فرمایا: مجھے بھی معلوم تھا، اس کا چہرہ بتلا رہا تھا، لیکن میں نے تو یہ سوچ کر اس کو پیسے دیئے کہ: اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ ایسے حالات سے تو نے مجھے محفوظ رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو آدمی کسی بھی حالت میں ہو، اس کو کبھی حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔

''تحقیر'' کا انجام بڑا برا ہوتا ہے

طبقات ابن سعد کے اندر ایک عجیب واقعہ لکھا ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر

جب آفتاب غروب ہو چکا اور میدانِ عرفات سے روانگی کا وقت ہوگیا تو حضورِ اکرم ﷺ کی سواری تیار تھی، لیکن ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ آپ ﷺ کسی کا انتظار فرما رہے ہیں، اور یمن کے عمائدین اور بڑے بڑے سربرآوردہ لوگ اس وقت آپ ﷺ کے پاس موجود تھے اور وہ سوچ رہے تھے کہ حضور کیوں رکے ہوئے ہیں؟ آخر کس کا انتظار ہے؟ اتنے میں دیکھا کہ حضرت اسامہ بن زیدؓ آئے۔ حضرت اسامہ کے والد حضرت زید تو گورے چٹے تھے لیکن یہ گورے نہیں تھے، اور اِن کی ناک بھی بھدی تھی، چہرہ بھی سانولا تھا، اور بدن بھی ایسا چھریرا تھا کہ دیکھنے والے آدمی پر کوئی خاص اثر نہ ڈال سکے خیر! جب وہ آئے تو حضور ﷺ نے ان کو اپنے پیچھے بٹھایا اور روانہ ہو گئے اس وقت عمائدینِ یمن کہنے لگے: اچھا! اس کی وجہ سے ہمیں رکنا پڑا اور انتظار کرنا پڑا؟

حضرت عروہ بن زبیرؓ جو اس واقعہ کو نقل کرنے والے ہیں وہ فرماتے ہیں: ''فَلِذٰلِكَ كَفَرَ أَهْلُ الْيَمَنِ مِنْ أَجْلِ ذَا'' اہلِ یمن اسی وجہ سے کفر وارتداد میں مبتلا ہوئے۔ اس روایت کو اپنی کتاب میں نقل کرنے والے محمد بن سعد صاحبِ طبقات فرماتے ہیں: میں نے اپنے استاذ یزید بن ہارون سے- جو بہت بڑے محدث ہیں- حضرت عروہ بن زبیرؓ کے اس جملہ کا مطلب پوچھا کہ: انہوں نے یہ کیوں فرمایا؟ تو انہوں نے کہا: حضور اکرم ﷺ کے انتقال کے بعد جب ارتداد پھیلا اور جو لوگ ایمان سے محروم ہوئے ان میں یمن والے بھی تھے، اور اس کی وجہ ان کا یہی جملۂ تحقیر تھا۔

کسی کی بھی تحقیر کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بڑی آزمائش میں ڈال دیتے ہیں
شیخ ابو عبداللہ اندلسی کا واقعہ مشہور ہے، اپنے زمانہ کے کتنے بڑے بزرگ تھے۔ وہ بھی آخر اس ابتلاء اور آزمائش میں کیوں ڈالے گئے تھے؟ اس کی وجہ وہ خود فرماتے ہیں کہ:

میں نے صلیب کی پوجا کرنے والوں کو دیکھا تو میرے دل میں خیال آیا کہ یہ عجیب قوم ہے جو صلیب کی پوجا کرتی ہے۔ (مفصل قصہ آپ بیتی ۱/ ۵۶۴ پر قابلِ مطالعہ ہے۔ مرتب) اللہ تعالیٰ نے اگر ہمیں کفر و شرک اور برائیوں سے بچا رکھا ہے تو یہ اس کا احسان ہے۔

علامہ عبدالرؤف مناوی رحمۃ اللہ علیہ بعض اہلِ معرفت کا قول نقل کرتے ہیں: کسی کو بھی حقیر نہ سمجھو، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے جس وقت اس کو پیدا کیا تھا تو اس کی طرف توجہ والتفات فرمایا۔ گویا وہ اس قابل تھا کہ اللہ تعالیٰ کی توجہ اس کی طرف متوجہ ہوئی، اس سے بڑی صلاحیت اور کیا ہو سکتی ہے؟ اور آپ اللہ تعالیٰ کی بناوٹ پر اعتراض کرنا چاہتے ہیں؟ نعوذ باللہ آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کیا بنا دیا؟ اگر آپ کی کسی بناوٹ پر کوئی اعتراض کرے، تو کیا آپ گوارا کرتے ہیں؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کی صنعت اور خَلقت پر بہت بڑا اعتراض ہے، اس لئے تحقیر کی شریعت اجازت نہیں دیتی، اور اس کا انجام بڑا برا ہوتا ہے۔

برائی کے لئے اتنا ہی کافی ہے

''اَلتَّقْوٰی هَاهُنَا'' تقویٰ ظاہر میں تو نظر نہیں آتا، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے سینہ کی طرف اشارہ کرکے ارشاد فرمایا: تقویٰ یہاں ہے۔ پھر فرمایا: ایک آدمی کی برائی کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے، کوئی آدمی اگر کسی کو حقیر سمجھتا ہے تو اس سے برا اور کوئی نہیں ہے، اس کی برائی کے لئے یہی چیز بہت کافی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک جگہ کے گورنر تھے، کچھ لوگ ان کی خدمت میں پہنچے جن میں عربی النسل بھی تھے اور کچھ عجمی نژاد بھی تھے (عجمی نژاد یعنی وہ پہلے کبھی غلام رہ چکے تھے) حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے

عربی نسل والوں کے ساتھ عزت واحترام کا معاملہ کیا اور عجمی نژادوں کے ساتھ ویسا معاملہ نہیں کیا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس کا پتہ چلا کہ ایسا ہوا ہے تو ان کو تنبیہ فرمائی اور یہی روایت سنائی: ''بِحَسْبِ امْرِیءٍ مِنَ الشَّرِّ أَنْ يَحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمِ'' آدمی کی برائی کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔

ہر ایک کی ''جان، مال، عزت'' محفوظ ہے

''كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ : دَمُهُ، وَعِرْضُهُ، وَمَالُهُ'' ہر آدمی میں تین چیزیں ہوتی ہیں، ایک اس کا جسم اور اس کی جان، دوسری اس کی عزت وآبرو، اور تیسرا اس کا مال۔ اور ایک مسلمان کی یہ تینوں چیزیں دوسرے مسلمان کے اوپر حرام ہیں، اس کی ذات پر بھی کسی شرعی وجہ کے بغیر ہاتھ اٹھانے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ اس کی عزت وآبرو کو چھیڑنے کی بھی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ آج کل تو کسی کی عزت وآبرو پر دھبہ لگا دینا بہت عام ہو گیا ہے، کسی کے متعلق آدمی جو چاہے بول دیتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک مرتبہ اپنے حواریوں سے پوچھا: اگر تمہارا بھائی سویا ہوا ہو، اور ہوا کی وجہ سے اس کا کپڑا تھوڑا سا ہٹ جائے جس کی وجہ سے اس کا ستر نظر آنے لگے؛ تو تم لوگ کیا کرو گے؟ انہوں نے کہا: ہم تو اس کے ستر کو ضرور ڈھانپ دیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمایا: نہیں! بلکہ تم تو اس کو اور زیادہ کھولو گے انہوں نے کہا: حضرت! ایسا کون کرے گا؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: تم لوگ اپنے بھائیوں کے ساتھ ایسا ہی کرتے ہو، اگر اس کی کوئی بات معلوم ہو جاتی ہے تو اس کی چشم پوشی کے بجائے لوگوں میں اس کو اور مشہور کرتے ہو؛ یہ اس کو اور زیادہ کھولنا نہیں ہوا؛ تو

اور کیا ہوا؟ درحقیقت یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔ اسی لئے کسی کے مال پر ہاتھ ڈالنے کی، کسی کی جان پر ہاتھ اُٹھانے کی، اور کسی کی عزت وآبرو کو چھیڑنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی ہے، غیبتیں کرنا، کسی پر تہمتیں لگانا، اور کسی کو حقیر سمجھنا؛ یہ سب عزت و آبرو سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہیں جو حرام ہیں۔

دلوں کی کیفیت دیکھی جاتی ہے

حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں: ''إِنَّ اللهَ لاَ يَنْظُرُ إِلَى أَجْسَادِكُمْ، وَلاَ إِلَى صُوَرِكُمْ، وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وأَعْمَالِكُمْ '' اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں کو اور تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتے، بلکہ وہ تو تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتے ہیں۔ وہاں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کون کتنا خوبصورت ہے، اور جسمانی اعتبار سے کون بھاری بھرکم، توانا و پہلوان اور طاقتور ہے، بلکہ وہاں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ ظاہری اور باطنی اعمال کیسے ہیں، تمہارے دلوں میں تقویٰ کی کیفیت کیا ہے۔

یہ تو صریح دھوکہ بازی ہے

اگر خریدنے کا ارادہ نہ ہو تو خواہ مخواہ اس چیز کے بھاؤ بڑھانے کے لئے قیمتیں مت لگاؤ۔ مثلاً: ایک چیز بیچی جارہی ہے، اور ایک آدمی فقط اس لئے زیادہ قیمت بولتا ہے تاکہ دوسرا کوئی اس کو خرید نہ سکے۔ جیسے: کہیں نیلام ہورہا ہے، ایک آدمی کا ارادہ اس چیز کے خریدنے کا نہیں ہے، لیکن وہ اس کا بھاؤ اس لئے بڑھاتا جارہا ہے تاکہ دوسرے لوگ زیادہ بھاؤ دے کر خریدیں۔ آج کل تو بیوپاری لوگ اپنے ایسے چیلے رکھتے ہیں جو جھوٹا بھاؤ بولتے رہتے ہیں، تاکہ کوئی گاہک بیچارہ آکر پھنس جائے؛ یہ کہاں جائز ہوسکتا

ہے؟ یہ تو صریح دھوکہ بازی ہے۔

جاسوسی کروانا؛ اخلاق کو خراب کرنے کا ذریعہ

۱۵۷۱:-وعن معاویۃ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رسولَ اللہِ ﷺ یقول: ((إِنَّكَ إِنِ اتَّبَعْتَ عَوْرَاتِ الْمُسْلِمِینَ أَفْسَدْتَهُمْ، أَوْ كِدْتَ أَنْ تُفْسِدَهُمْ)). (حدیث صحیح، رواہ أبو داود بإسناد صحیح.)

ترجمہ:- حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: اگر تم مسلمانوں کی اندرونی باتوں کو معلوم کرنے کی کوشش کروگے، ان کی ٹوہ میں لگوگے اور ان کے پیچھے پڑوگے؛ تو ان کے اخلاق کو خراب کردوگے۔

افادات:- یہ حکم ماتحتوں کے متعلق ہے۔ بعض بڑوں کی عادت ہوتی ہے کہ حالات معلوم کرنے کے لئے جاسوس لگائے رکھتے ہیں کہ وہ کیا کرتا ہے اور کہاں جاتا ہے؟ اس کے نتیجہ میں ان کے اخلاق اور خراب ہوتے ہیں اور ان کی عادتیں زیادہ بگڑتی اور فاسد ہوتی ہیں۔ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ ہاں! جو چیز سامنے آجائے اس پر ضرور ٹوکا جائے، اور جو چیز سامنے نہیں آئی، اس کی ٹوہ میں لگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مثلاً: کسی ادارہ کا ذمہ دار اور پرنسپل و مہتمم ہے، یا کسی فیکٹری کا مالک ہے تو اپنے ماتحتوں کے اندرونی حالات کی ٹوہ میں لگنے کی ضرورت نہیں ہے، جو سامنے آئے اس کے مطابق معاملہ کیا جائے۔ معلوم ہوا کہ جاسوسی کروانا اور ٹوہ میں لگے رہنا بڑی خطرناک چیز ہے۔

اندرونی حالات کو ٹٹولنے سے ہمیں منع کیا گیا

۱۵۷۲:-وعن ابن مسعود رضی اللہ عنہ: أَنَّهُ أُتِيَ بِرَجُلٍ فَقِيلَ

لَهُ: هَذَا فُلاَنٌ تَقْطُرُ لِحْيَتُهُ خَمْراً. فَقَالَ: إِنَّا قَدْ نُهِيْنَا عَنِ التَّجَسُّسِ، وَلٰكِنْ إِنْ يَظْهَرْ لَنَا شَيْءٌ، نَأْخُذْ بِهِ. (حدیث حسن صحیح، رواه أبو داود بإسنادٍ عَلَى شَرْطِ البخاری ومسلم.)

ترجمہ مع تشریح:۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک آدمی کو لایا گیا اور آپ سے کہا گیا: اس آدمی کی داڑھی میں سے بھی شراب ٹپک رہی ہے۔ اس پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا: لوگوں کے اندرونی حالت کے ٹٹولنے اور ان کی ٹوہ میں لگنے سے ہمیں منع کیا گیا ہے (ہمیں یہ نہیں کہا گیا کہ لوگوں کے گھروں میں گھس کر، یا دروازوں کی دراڑوں میں سے جھانک کر کچھ معلوم کریں) لیکن اگر کسی کا کوئی معاملہ ہمارے سامنے کھل کر آجائے گا (مثلاً: کسی کے منھ سے شراب ٹپک رہی ہوگی) تو پھر ہم اس کی گرفت کریں گے۔

النهي عن سوء الظنّ بالمسلمين من غير ضرورة

مسلمانوں کے ساتھ بلا وجہ بدگمانی کرنا حرام ہے

قَالَ اللہ تَعَالَی: يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيراً مِنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ. (الحجرات:۱۲)

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچو، اس لئے کہ بعض گمان گناہ ہیں۔ اور جب تک کسی گمان کے متعلق یہ یقین نہ ہو جائے کہ وہ گناہ نہیں ہے وہاں تک اس کے قریب جانے کی اجازت نہیں۔ گناہ سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے ایسے تمام گمان جن کے گناہ ہونے کا امکان ہو؛ ان سے آدمی دور رہے۔

۱۵۷۳:- وعن أبي هريرة - رضی اللہ عنہ - : أنَّ رسول اللہ ﷺ قَالَ: ((إيَّاكُمْ والظَّنَّ، فإنَّ الظَّنَّ أكْذَبُ الحَدِيثِ)) (متفق عَلَيْهِ)

حضرت ابو ہریرہؓ کی وہی روایت پیش کی ہے جو اوپر آئی تھی جس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ بدگمانی سے بچنا چاہیے اس لیے کہ بدگمانی حرام ہے۔

تحریم احتقار المسلمین

مسلمانوں کو حقیر سمجھنا حرام ہے

قَالَ اللّٰہ تَعَالَیٰ: يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِنْ نِسَاءٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُنَّ خَيْرًا مِنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ. وَمَنْ لَمْ يَتُبْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ. (الحجرات:۱۱)

ایک اور باب قائم کیا ہے جس میں یہ بتایا جارہا ہے کہ: مسلمانوں کو حقیر سمجھنا حرام ہے۔ کسی کے اندرونی حالات تو ہمیں معلوم نہیں ہیں پھر صرف کسی کی ظاہری شکل و صورت کو دیکھ کر اس کو حقیر سمجھنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ اس سلسلہ میں سورۂ حجرات کی آیت لائے ہیں: اے ایمان والو! تم میں سے کچھ لوگ دوسروں کا ٹھٹھا اور مزاق نہ کریں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور تم میں سے کچھ عورتیں دوسری عورتوں کا ٹھٹھا اور مذاق نہ کریں، ہوسکتا ہے وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور اپنے لوگوں پر عیب نہ لگاؤ اور برے لقب سے ایک دوسرے کو یاد نہ کرو، ایمان لانے کے بعد تو یہ بڑے فسق کے کام ہیں، اور جو آدمی توبہ نہ کرے گا تو وہ ظلم کرنے والا ہے۔

اس لیے کہ ایک اندھا آیا

دیکھو! حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بڑے محبوب اور لاڈلے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف اور خوبیوں کو اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں مختلف جگہوں پر بیان کیا ہے،

لیکن ایک دو مواقع ایسے بھی ہیں جہاں آپ ﷺ کو عتاب کیا گیا ہے، اسی میں ایک موقعہ وہ ہے کہ ایک مرتبہ قریش کے کچھ اہم ذمہ دار اور سردار لوگ نبیٔ کریم ﷺ کے پاس آئے ہوئے تھے، اور آپ ﷺ اُن کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کر رہے تھے، اسی دوران ایک نابینا صحابی حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ حضور ﷺ کی خدمت میں کوئی مسئلہ پوچھنے کے لئے آ گئے۔ چوں کہ وہ نابینا تھے اس وجہ سے ان کو تو یہ پتہ ہی نہیں تھا کہ حضور ﷺ کسی کے ساتھ بات چیت میں مشغول ہیں۔ آپ ﷺ نے۔ صرف یہ سمجھ کر کہ یہ تو اپنے آدمی ہیں، بعد میں ان کو مسئلہ بتلا دیا جائے گا- ان کی بات کا جواب دینے کے بجائے ان کی طرف سے چہرہ پھیر کر اور رُخ موڑ کر سرداروں کی طرف توجہ فرمائی۔ اور وہ بھی اپنی ذاتی غرض کی وجہ سے نہیں، بلکہ صرف اس امید پر کہ اگر یہ سردار لوگ اسلام لے آئیں گے تو پوری قوم کے ہدایت پر آنے کی شکلیں پیدا ہو جائیں گی، اس پر باری تعالیٰ کی طرف سے بڑا زبردست عتاب کیا گیا: ﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰى أَنْ جَآءَهُ الْأَعْمٰى﴾ منھ بگاڑا اور رُخ پھیرا اس لئے کہ ایک اندھا آدمی آیا۔ یہ کتنی سخت آیت ہے اس کو اہلِ علم سمجھ سکتے ہیں۔ حالاں کہ وہاں تحقیر کا جذبہ بھی پیشِ نظر نہیں تھا، بلکہ رسول اللہ ﷺ نے صرف بے توجہی اور عدمِ التفات کیا تھا اور وہ بھی اپنی ذاتی غرض سے نہیں، بلکہ اپنے خیال سے تبلیغ ورسالت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی غرض سے؛ اس پر بھی یہ تنبیہ آ گئی۔ معلوم ہوا کہ یہ بڑی اہم چیز ہے۔

وقال تَعَالَى: وَيلٌ لِكُلِّ هُمَزَةٍ لمزَةٍ.(الهمزة:۱) اور باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: بڑی خرابی ہے ہر ایسے شخص کے لیے جو پسِ پشت عیب نکالنے والا اور روبرو طعنہ دینے والا ہو۔

۱۵۷۴:-عن أَبِي هريرة رضي الله عنه: أَنَّ رسولَ اللهِ ﷺ قَالَ: ((بِحَسْبِ امْرِءٍ مِنَ الشَّرِّ أَنْ يَحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ.)) (رواه مسلم. وَقَدْ سبق قريباً بطوله)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آدمی کی برائی کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔

تکبر کیا ہے

۱۵۷۵:- وعن ابن مسعود رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قَالَ: ((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ!)) فَقَالَ رَجُلٌ: إِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ أَنْ يَكُونَ ثَوْبُهُ حَسَناً، وَنَعْلُهُ حَسَناً. فَقَالَ: ((إِنَّ اللهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ، الْكِبْرُ: بَطَرُ الْحَقِّ، وَغَمْطُ النَّاسِ)) (رواہ مسلم)

ومعنی ((بَطَرُ الْحَقِّ)) دَفْعُه، ((وغَمْطُهُمْ)): احْتِقَارُهُمْ، وَقَدْ سَبَقَ بَيَانُهُ أَوْضَحَ مِنْ هَذَا فِي باب الْكِبْرِ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وہ آدمی جنت میں نہیں جائے گا جس کے دل میں ایک ذرّہ برابر بھی تکبر ہو۔ اس پر ایک آدمی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! بعض آدمی اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ ان کا کپڑا اچھا ہو، اور جوتا اچھا ہو (تو کیا یہ بھی تکبر ہے؟) حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہ تکبر نہیں ہے، اللہ تعالیٰ جمیل ہیں اور جمال کو پسند کرتے ہیں۔ تکبر تو حق بات کا انکار کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے۔

یہ تکبر نہیں

افادات:- کوئی بات آپ سے کہی جائے تو یہ جاننے کے باوجود کہ حق بات کہی جارہی ہے، کہنے والے کی تحقیر کی بنیاد پر اس حق بات کا انکار کرنا؛ یہ کبر ہے۔ اور لوگوں کو حقیر سمجھنا بھی کبر ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ باقی اگر کوئی آدمی اچھا کپڑا پہننے کا، اچھے لباس، اچھا جوتا اور اچھے رہن سہن کا اہتمام کرتا ہے؛ تو یہ تکبر نہیں ہے۔ پہلے کبر کا بیان گذر چکا ہے

اس میں تفصیل آچکی ہے، وہاں اس روایت کا مطلب بہت تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔

ایک رند اور ایک زاہد

۱۵۷۶:-وعن جُندب بن عبدِ الله -رضی اللہ عنہ- قَالَ : قَالَ رسولُ اللهِ ﷺ:

((قَالَ رَجُلٌ : وَاللهِ لا يَغْفِرُ اللهُ لِفُلانٍ، فَقَالَ اللهُ -عز وجل-: مَنْ ذا الَّذِي يَتَأَلَّى عَلَيَّ أنْ لا أغْفِرَ لِفُلانٍ! فَإِنِّي قَدْ غَفَرْتُ لَهُ، وَاحْبَطْتُ عَمَلَكَ)). (رواه مسلم)

ترجمہ مع تشریح: حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: (ایک آدمی بڑا گنہگار تھا اور دوسرا آدمی بڑا عبادت گزار تھا۔ عبادت گزار اس گنہگار کو ہمیشہ نصیحت کرتا تھا: اے میرے بھائی! اپنے گناہوں سے باز آجا، لیکن وہ باز نہیں آتا تھا، یہاں تک کہ ایک مرتبہ) اس عبادت گزار آدمی نے اس گنہگار سے یہاں تک کہہ دیا: اللہ تعالیٰ تیری مغفرت نہیں کریں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: میرے نام کی قسم کھا کر ایسا کہنے والا تو کون ہوتا ہے؟ (کیا تجھے اختیارات دیئے ہیں؟) جو تو یوں کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مغفرت نہیں کریں گے؟ (سن لے) مَیں نے اس کی تو مغفرت کر دی، اور تیرے اعمال حبط اور ضائع کر دیے۔

افادات: ۔معلوم ہوا کہ اگر کوئی آدمی دوسرے کی تحقیر میں کوئی جملہ اپنی زبان سے نکال دیتا ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ ناراض ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اس بات کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے کہ کسی کی بھی تحقیر ہماری طرف سے پائی نہ جائے۔

لہٰذا آج کی اس مجلس سے اپنے دل و دماغ میں یہ بات بٹھا کر جائیے کہ ہم کسی کی تحقیر نہیں کریں گے، اور اپنے دل سے کسی کو حقیر نہیں سمجھیں گے، اس لیے کہ ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا ہے! اور تحقیر کی وجہ سے آدمی کو بڑی آزمائشوں اور ابتلاءات میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔

النهي عن إظهار الشماتة بالمُسلم

کسی مسلمان کو تکلیف اور مصیبت پہنچنے پر خوش ہونے کی ممانعت

قَالَ اللہ تَعَالَی: إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ. (الحجرات:۱۰)

وقال تَعَالَی: إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ. (النور:۱۹)

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نیا عنوان قائم کیا ہے: کسی مسلمان کو تکلیف اور مصیبت پہنچنے پر خوشی کا اظہار کرنے کی ممانعت۔

جب کسی کے دل میں کسی کے متعلق کینہ، بغض اور حسد پیدا ہو جاتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس کا بغض و عداوت دل میں بیٹھی ہوئی ہوتی ہے اگر اس کو کوئی مصیبت پہنچ جاتی ہے تو یہ آدمی مسرت اور خوشی محسوس کرتا ہے، اور اگر اس کو کوئی نعمت مل جاتی ہے تو اس کو دکھ اور تکلیف ہوتی ہے۔ حالاں کہ کسی مسلمان کو پہنچنے والی مصیبت پر خوشی کا اظہار کرنے کی ممانعت آئی ہے۔

اس سلسلہ میں قرآنِ پاک کی وہی آیت لائے ہیں جو پہلے بھی گذر چکی ہے: ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ لہٰذا بھائی چارگی اور اخوت کا تقاضہ یہ ہے کہ کسی آدمی پر کوئی مصیبت آئے تو اس پر خود بھی دکھ اور تکلیف محسوس کرے؛ نہ یہ کہ اس پر آنے والی مصیبت سے خوش ہو۔

عربوں کی نیک فالی

عربوں میں نام رکھنے کے اندر نیک فالی کا بڑا لحاظ کیا جاتا تھا۔ جب نبئ کریم ﷺ مبعوث ہوئے اس وقت عرب کا عجیب حال تھا، نہ کسی کی جان محفوظ تھی، نہ کسی کا مال محفوظ تھا، نہ کسی کی عزت و آبرو محفوظ تھی۔ کوئی آدمی گھر سے باہر نکلتا تھا تو صحیح سلامت واپس آجائے گویا یہی اس کے لئے خوش قسمتی کی بات ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ سفر میں بھی وہ لوگ قافلوں اور بڑی بڑی جماعت کی شکل میں جاتے تھے، پھر بھی ان کو خطرہ لگا ہی رہتا تھا کہ کہیں کوئی قبیلے والے حملہ نہ کردیں اور پورے قافلے کو لوٹ نہ لیں۔ اس لیے کہ اس زمانہ میں یہ عام تھا کہ قافلوں کو لوٹ لیا جاتا تھا اور سب کو گرفتار کر کے غلام و باندی بنالیا جاتا تھا۔ گویا جو بھی قافلہ سفر کرتا تھا اس کی واپسی کی کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی تھی، اسی لئے اہلِ عرب نے اس کا نام ہی ''قافلہ'' رکھا۔ ''قافلہ'' عربی زبان کا لفظ ہے: ''قَفَلَ، یَقْفُلُ، قُفُوْلًا'' کا معنیٰ آتا ہے ''لوٹنا''۔ ''قافلہ'' یعنی وہ جماعت جو لوٹ کر واپس آئے۔ اب یہ جماعت تو ابھی سفر پر روانہ ہو رہی ہے، اور ابھی سے ان کو قافلہ کا نام دیا گیا ہے، یہ دراصل نیک فالی کے طور پر بولا جاتا تھا، گویا ابھی جا رہے ہیں لیکن ان کو قافلہ کہو، تاکہ اللہ کرے کسی کی زبان سے نکلا ہوا یہ لفظِ قافلہ قبول ہو جائے اور یہ لوگ صحیح سلامت واپس آجائیں۔

اسی طرح کسی آدمی کو اگر سانپ نے کاٹ لیا ہو تو عربی زبان میں سانپ کے کاٹے ہوئے کو ''سلیم'' کہتے ہیں، حالاں کہ ''سلیم'' کا ترجمہ ہوتا ہے کہ ایسا آدمی جو محفوظ اور سلامت ہو۔ اور عام طور سے ایسا ہوتا ہے کہ اگر کسی کو سانپ کاٹ لے تو وہ بچتا نہیں ہے، اس لئے عربوں نے اس کا نام ہی ''سلیم'' رکھا، تاکہ کوئی بھی پوچھے کہ یہ کون

ہے؟ اور اس کو کیا ہوا؟ تو کہیں کہ ''هٰذَا سَلِيْمٌ'' یہ سلیم ہے۔ گویا اللہ کے کسی بندے کی زبان سے لفظِ سلیم نکلے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہو جائے تو یہ بچ جائے۔ مطلب یہ ہے کہ نام رکھنے کے اندر وہ لوگ تفاؤل اور نیک فالی کا لحاظ رکھتے تھے۔

قیامت کے مختلف ناموں میں سے ایک نام ''اَلسَّاعَة'' ہے، اور ''ساعۃ'' ایک گھڑی کو کہتے ہیں، حالاں کہ قیامت کا ایک دن تو پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا، لیکن نیک فالی کے طور پر اس کا ایک نام ''ساعۃ'' بھی رکھا گیا تا کہ اللہ تعالیٰ اس کو اہلِ ایمان کے حق میں ایک گھڑی کے برابر بنا دے۔

خطابت کا نہایت بلیغ انداز

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کسی کی جان، کسی کا مال، کسی کی عزت و آبرو محفوظ نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب دین کی دعوت لے کر آئے اور لوگ اسلام میں داخل ہوئے تو آپ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر سب سے اہم جو تعلیم دی وہ یہی تھی۔ اس لیے کہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر عالمِ اسلام میں جتنے افراد تھے تقریباً سب ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ اس حج میں شریک ہوئے تھے جن کی بڑی تعداد وہاں موجود تھی، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کو جو وہاں موجود تھے اور قیامت تک آنے والی امت مسلمہ کو ایک پیغام دیا، اور اتنا ہی نہیں کہ جو لوگ سن رہے ہیں ان کو کہہ دیا بلکہ یہ تاکید کر دی: ''فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ'' جو لوگ یہاں موجود ہیں اور میری اس بات کو سن رہے ہیں، وہ ان لوگوں تک جو یہاں موجود نہیں ہیں میری یہ بات پہنچائیں۔ اس وعظ اور خطبہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک بات خاص طور پر ارشاد فرمائی تھی: ''إِنَّ دِمَآءَ كُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا فِيْ شَهْرِكُمْ هٰذَا فِيْ

بَلَدِكُمْ هٰذَا'' تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری عزت وآبرو اسی طرح حرام ہیں جیسے اس دن کی حرمت، اس مہینے کی حرمت اور اس شہر اور بستی کی حرمت ہے۔ اس لیے کہ زمانۂ جاہلیت میں بھی وہ لوگ دین سے دور ہونے اور گناہوں میں مبتلا ہونے کے باوجود کچھ چیزوں کا احترام کرتے تھے، انہیں میں سے ایک ان کے یہاں حرمت والے چار مہینوں کا احترام تھا جو حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ سے چلے آرہے تھے۔ ان مہینوں میں کسی پر حملہ کرنا، کسی کو لوٹنا، کسی کی جان ومال پر ہاتھ ڈالنا؛ وہ اپنے لئے معیوب اور گناہ سمجھتے تھے۔ دینِ ابراہیمی کی جو کچھ بچی کچی علامتیں پائی جاتی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھا۔ ان حرمت والے مہینوں میں سے ایک مہینہ ذو الحجہ کا بھی تھا، اور حج کے ایام بھی اسی میں آتے ہیں، اور پھر خاص طور پر ''یوم النحر'' یعنی دسویں ذوالحجہ کی حرمت کو تو وہ لوگ اور زیادہ مہتم بالشان سمجھتے تھے۔ اور حدودِ حرم کے اندر کسی کی جان ومال پر حملہ کرنے کو بھی وہ لوگ بڑا گناہ سمجھتے تھے۔ اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کسی مسلمان اور مؤمن کی عزت وآبرو اور جان ومال کی حفاظت واہمیت کو ان کے دلوں میں بٹھانے کے لئے کتنا بلیغ وعمدہ اور کتنا اعلیٰ انداز اختیار فرمایا کہ انہیں سے سوالات کیے کہ: اچھا یہ بتاؤ! کہ آج کون سا دن ہے؟ انہوں نے کہا: یوم النحر یعنی دسویں ذوالحجہ ہے۔ پھر سوال کیا: کون سا مہینہ ہے؟ انہوں نے کہا: ذوالحجہ کا مہینہ ہے۔ پھر سوال کیا: کون سا شہر اور بستی ہے؟ انہوں نے کہا: مکہ مکرمہ ہے۔

ان چیزوں کی حرمت کو تو وہ لوگ سمجھتے ہی تھے پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمہاری جانیں، تمہارے مال، تمہاری عزت وآبرو کی حرمت بھی ایک دوسرے پر اسی طرح ہے۔ گویا ہر مسلمان کی جان تمہاری جان ہے، ہر مسلمان کی عزت وآبرو

تمہاری عزت وآبرو ہے، ہر مسلمان کا مال تمہارا مال ہے۔ اگر کسی کی عزت وآبرو پر حملہ ہو رہا ہے تو یہ نہ سمجھو کہ وہ کوئی غیر ہے، بلکہ تمہاری عزت وآبرو پر حملہ ہے۔ اور جیسے آدمی اپنی عزت کا دفاع کرتا ہے اسی طریقہ سے دوسروں کی طرف سے دفاع اور ڈیفنس کرنا بھی ہر ایک کا فریضہ ہے اسی لئے غیبت کے سلسلہ میں پہلے روایتیں گزر چکی ہیں کہ کسی مجلس میں غیبت اور برائی بیان کی جارہی ہو تو اس کی طرف سے دفاع کرنا ضروری ہے۔ کوئی آدمی اگر طاقت رکھتے ہوئے بھی دفاع نہیں کرے گا تو کل قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کو بے یارو مددگار چھوڑ دیں گے۔

اسلام؛ پورا پریوار ہے

گویا نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کے نام سے ایک پورا کنبہ تیار کیا ہے۔ پہلے زمانہ میں یہ ہوتا تھا کہ اپنے خاندان یا وطن کی نسبت پر ایک دوسرے کی مدد کی جاتی تھی (جیسا کہ آج کل بھی ایسا ہی ہو گیا ہے، لوگ سوچتے ہیں کہ فلاں اپنے قبیلہ کا آدمی ہے) پھر اسی نسبت پر مدد کی جاتی تھی۔ یا آپس میں معاہدہ اور اس بات کا اگریمنٹ کیا جاتا تھا کہ میں تمہاری مدد کروں گا تم میری مدد کرو گے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''لَاحِلْفَ فِي الْاِسْلَامِ'' اسلام میں ایسا اگریمنٹ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک آدمی نے جب زبان سے کلمہ پڑھ لیا تو اس کے بعد دوسرے تمام کلمہ گو مسلمانوں پر اس کے جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت کے لئے ہر طرح کی کوشش کرنا ضروری ہو گیا۔

ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان کے اوپر جو بہت سارے حقوق بتلائے ہیں جیسا کہ پچھلے اسباق میں گزر چکا ہے ''اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يَخْذُلُهُ

وَلَا یَحْقِرُہٗ‘‘ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، وہ خود بھی کسی پر ظلم نہیں کرتا، کوئی دوسرا اس کے ساتھ زیادتی کرتا ہے اور یہ مدد کی طاقت رکھتا ہے تو اس کو بے یار و مددگار بھی نہیں چھوڑتا، بلکہ اس کی بھرپور مدد کرتا ہے۔ کسی کو دل سے کمتر وحقیر بھی نہیں سمجھتا، یعنی شریعت اتنی بھی اجازت نہیں دیتی کہ ایک ادنیٰ مسلمان کو اپنے دل میں حقیر و ذلیل سمجھا جائے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضور ﷺ نے اسلام کی نسبت پر ایک پورا کنبہ اور پریوار کا رشتہ قائم کیا ہے۔

آج کل لوگ کسی ادارہ یا کسی جماعت سے منسلک ہوجاتے ہیں، تو اس جماعت کے ممبران اور اس ادارہ سے تعلق رکھنے والوں کو ایک پریوار سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کا ہر ایک فرد دوسرے کی مدد کو ضروری سمجھتا ہے۔ آج اِس زمانہ میں یہ سب ہورہا ہے، حالاں کہ حضور اکرم ﷺ نے پہلے ہی دن سے اسلام کے نام سے ایک پریوار قائم کیا تھا، ایک آدمی نے اسلام کا کلمہ پڑھ لیا تو آپ چاہے ہندوستان کے کسی کونہ اور گوشہ میں رہتے ہوں، اور دوسرا امریکہ کے کسی کونہ اور گوشہ میں رہتا ہو؛ تب بھی وہ آپ کی ہمدردی کا حقدار ہے، اور آپ کو اس کے ساتھ اسی طرح کا معاملہ کرنا ہے جیسا کہ اپنی ذات کے ساتھ کرنا ہے۔ اسی لیے حدیثِ پاک میں آیا ہے: ’’لَا یُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِأَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ‘‘ تم میں سے کوئی آدمی کامل مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے

رشتۂ اسلامی

ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر بہت سارے حقوق ہیں، جیسے: بیمار ہو تو عیادت کرنا، اب یہ حکم کسی رشتہ دار کے ساتھ خاص نہیں ہے کہ تمہارا رشتہ دار بیمار ہو

جائے تو اس کی خبر لینے جاؤ، اور تمہارا دوست بیمار ہو جائے تو اس کی خبر لینے جاؤ، تمہاری پارٹی کا آدمی بیمار ہو جائے تو اس کی خبر لینے جاؤ؛ بلکہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر جو حقوق بتلائے گئے ہیں ان میں عیادت کرنا بھی آیا ہے، اس کے لیے اسلام کا رشتہ ہی کافی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی حقوق ہیں، جیسے: جب اس کی موت واقع ہو جائے تو اس کی نمازِ جنازہ پڑھے اور اس کے جنازہ میں جائے۔ اگر وہ بھوکا ہو تو اس کو کھانا کھلائے۔ وہ ملے تو اس کو سلام کرے۔ اس کو چھینک آئے اور وہ ''الحمدللہ'' کہے تو جواب میں ''یرحمک اللہ'' کہے۔ اب آپ اندازہ لگائیے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ایسا سماج و معاشرہ قائم فرمایا کہ جس کا ہر فرد دوسرے فرد کے ساتھ پوری ہمدردی اور محبت رکھنے والا ہو، یہاں تک کہ دل میں بھی کسی کے متعلق میل اور کینہ رکھنے کی اجازت نہیں دی۔

پچھلے اسباق کے اندر جو روایتیں گزریں ان میں یہ مضمون تھا کہ دل کے اندر کسی مسلمان کے متعلق کینہ اور میل نہ رکھا جائے، اس کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اور ہر وہ چیز جو مسلمان کی خیر خواہی کے تقاضہ کے خلاف ہو اس کے متعلق صرف اتنا ہی نہیں کہا کہ اس کو مت کرو، بلکہ اس کو حرام اور کبیرہ گناہ قرار دیا۔ دراصل ان سارے ابواب میں کبیرہ گناہوں کی پوری فہرست بیان کرنے کا سلسلہ چل رہا ہے کہ آپ کسی مسلمان کو حقیر نہ سمجھئے، کسی کی غیبت نہ کیجئے، کسی کے ساتھ کینہ نہ رکھئے، کسی سے حسد کا معاملہ نہ رکھئے، اور آج جو باب قائم کیا ہے اس میں یہ ہے کہ ایک مسلمان پر کوئی مصیبت آجائے تو اس کی وجہ سے آپ کے دل میں خوشی کا احساس نہیں ہونا چاہیے، حالاں کہ اگر کوئی خوش بھی ہو گیا تو سامنے والے کو اس کی وجہ سے کوئی تکلیف بھی نہیں ہونے والی

ہے، کیوں کہ اس کو پتہ بھی نہیں ہے کہ میری مصیبت پر اس کو خوشی ہوئی ہے، لیکن اس کی بھی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

جذبۂ خیر خواہی

آج کے اس گئے گزرے دَور میں بھی اس کے نمونے ہمیں خوب دیکھنے کو ملتے ہیں، حالاں کہ ہم اپنی اغراض، دنیا کی اور مال کی محبت کی وجہ سے بہت سی برائیوں میں پڑ گئے ہیں، پھر بھی جب کوئی عام مصیبت آتی ہے تو ہر مسلمان کے دل میں دوسرے مسلمان کے لئے خیر خواہی کا جذبہ اُبھر آتا ہے۔ لیکن شریعت تو یہ چاہتی ہے کہ یہ جذبہ وقتی نہ ہو، کسی بڑی مصیبت کے آنے کے ساتھ مخصوص نہ ہو، بلکہ چوبیس گھنٹے اور بارہ مہینے (یعنی پوری زندگی) یہی معاملہ ہونا چاہیے۔

اور اسلام نے آپس میں سلام کو مشروع کیا کہ جب کوئی بھی مسلمان ملے تو اس کو سلام کرو، اس لئے کہ زمانۂ جاہلیت میں اگر ایک آدمی اِدھر سے جا رہا ہوتا اور دوسرا سامنے سے آ رہا ہوتا تو دونوں میں سے ہر ایک دوسرے سے خطرہ محسوس کرتے تھے کہ معلوم نہیں سامنے والا میرے ساتھ کیا معاملہ کرے گا؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری جان کا پیاسا ہو جائے، میرے اوپر حملہ کر دے، میری عزت و آبرو پر ڈاکہ ڈال دے، میرا مال چھین لے۔ اسلام نے آکر سلام کا طریقہ جاری کیا، بلکہ سلام کے عام کرنے کو ایمان و اسلام کی خاص علامتوں میں سے قرار دیا، اور وہ اعمال جو اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہیں ان میں ایک ''افشاءِ سلام'' یعنی سلام کو پھیلانا بھی بتایا۔ اور سلام کی ابتدا کرنے پر زیادہ فضیلت اسی لیے سنائی کہ اس طرح کر کے گویا آپ اپنی طرف سے سامنے والے کو اطمینان دلا رہے ہیں اور اس بات کی گارنٹی دے رہے ہیں کہ میری طرف سے آپ

مطمئن رہیے، میں تو خود آپ کا خیر خواہ ہوں، بھلا میں آپ کی جان، مال، عزت و آبرو پر کہاں ہاتھ ڈال سکتا ہوں؟ میں تو وہ شخص ہوں جو آپ کے لئے بھلائیاں چاہتا ہے اور دعا کرتا ہے "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر سلامتی ہو، اور اس کی رحمت تم پر نازل ہو، اور اس کی برکتیں ہوں۔

یہ صرف اسلام ہی کا خاصہ ہے

آپس کی ملاقات کا یہ ایسا عمدہ طریقہ اسلام نے ہمیں بتلایا ہے کہ کسی اور قوم کے پاس ایسا بہترین طریقہ نہیں ہے۔ دوسری قوموں میں بھی ملاقات کے وقت آپس میں کچھ نہ کچھ جملے ادا کرنے کا رواج ہے، جیسے: نمستے، نمسکار، گڈ مارننگ اور گڈ ایوننگ، یا آداب وغیرہ؛ لیکن کسی بھی جملہ میں دعا نہیں ہے۔ اور ہمیں جو طریقہ بتلایا گیا وہ دعا والا ہے، اور اس پر بڑے ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے کہ جو آدمی "السلام علیکم" کہے تو دس نیکیاں، اور "ورحمۃ اللہ" بھی کہے تو بیس نیکیاں، اور "وبرکاتہ" بھی کہے تو تیس نیکیاں ملیں گی، اور صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ مسلمان کے دل میں خوشی داخل کرنے کا مستقل ثواب ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا: کون سا عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے زیادہ پسندیدہ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "إِدْخَالُ السُّرُوْرِ فِيْ قَلْبِ الْمُسْلِمِ" "مسلمان کے دل میں خوشی کو داخل کرنا۔ اسی لیے یہ تعلیم ہے کہ کسی کی ملاقات کے وقت اپنا منہ ارنڈی کا تیل پیا ہوا مت رکھو، بلکہ کہا گیا ہے: "تَبَسُّمُكَ فِيْ وَجْهِ أَخِيْكَ صَدَقَةٌ" "تمہارا اپنے بھائی کے سامنے مسکرانا بھی صدقہ ہے۔ اگر کسی سے مسکرا کر ملو گے تو اس کو کتنی خوشی ہوگی۔ ایک آدمی منہ

بگاڑ کر ملتا ہے تو سامنے والا سوچتا ہے کہ معلوم نہیں؛ اس کا منہ ایسا کیوں ہے؟ کہیں میری طرف سے کوئی ایسی بات تو پیش نہیں آئی جس سے اس کا دل دکھا ہو۔ اور اگر خوشی اور مسرت سے ہنستے ہوئے چہرے کے ساتھ ملو گے تو سامنے والے کا جی خوش ہو جائے گا، اس لئے شریعت نے یہاں تک حکم دیا کہ اپنے بھائی سے ملو تو مسکراتے ہوئے ملو۔

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

اسی طرح ہر موقعہ پر دعائیں بتلائی ہیں کہ اس کے یہاں بچہ پیدا ہو تو آپ مبارک باد دیجئے۔ جب شادی ہو تو شادی کے موقعہ پر دعائیں دیجئے کہ اس کے یہاں خیر و برکت آئی تو اس مناسبت سے اس کے ساتھ معاملہ کیجئے۔ یہاں تک کہ اگر اس نے نیا لباس پہنا تو شریعت یہ دعا بتلاتی ہے کہ کسی کو نیا لباس پہنا ہوا دیکھو تو یوں کہو: ''أَبْلِ وَأَخْلِقْ '' اس کو پرانا کرو اور اس کو اور زیادہ پہنو، یعنی تمہاری زندگی طویل ہو۔ کسی کو ہنستا ہوا دیکھو تو یوں کہو: ''أَضْحَكَ اللهُ سِنَّكَ '' اللہ تعالیٰ تمہیں اور ہنسائے۔ اندازہ لگائیے کہ اسلام کی کتنی بہترین تعلیمات ہیں، آج اگر ان تعلیمات کو ہم اختیار کر لیں تو ہمارا معاشرہ ایسا بن جائے گا:

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد	کسے را با کسے کارے نباشد

کسی کو کسی سے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ:

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر	سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

ایک مسلمان کی کیفیت یہ ہونی چاہیے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی کی تعلیم بھی دی ہے۔

ہمارا حال!

پچھلے اسباق میں اور اس باب میں بھی چھوٹی چھوٹی چیزیں بتلائی جا رہی ہیں،

لیکن ان کو چھوٹا نہیں کہا بلکہ گناہِ کبیرہ بتلایا ہے، اور ان میں سے بعض گناہ تو ایسے خطرناک ہیں کہ ان کے متعلق حدیث پاک میں آیا کہ ایسا آدمی جنت میں نہیں جائے گا اندازہ لگائیے کہ شریعت کی نگاہوں میں ان چیزوں کی کتنی اہمیت ہے! لیکن آج ہمارا حال یہ ہے کہ پرائے تو پرائے؛ جن کے ساتھ رشتہ داریاں ہیں، اپنے بھائی، بہن، ماں باپ، اور دوسرے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ وہ معاملہ کرنے کے لئے ہم تیار نہیں ہیں۔ اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم تو یہ ہے کہ ہر مسلمان کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرنا ہے، اور برائی سے پیش آنے سے اپنے آپ کو باز رکھنا ہے۔

دنیا و آخرت میں دردناک عذاب

دوسری آیت لائے ہیں: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِى الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِى الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ﴾ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ بری چیزوں کی خبریں مسلمانوں میں پھیلے، ان کے لئے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی کی بدنامی کی کوئی بات ہوئی، کسی پر تہمت لگائی گئی، اور وہ تہمت لوگوں میں پھیلائی جارہی ہے، تو برائی کے پھیلنے کی دل سے پسندیدگی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وعید سنائی گئی ہے۔

میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ اپنی آنکھوں سے کوئی عیب دیکھو تب بھی اس کو چھپانے کی شریعت نے تاکید کی ہے، نہ یہ کہ جو نہیں دیکھا ہے اس کا بھی لوگوں کے سامنے اظہار کیا جائے۔ پچھلے سبق میں حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا مقولہ بتلایا تھا کہ انہوں نے اپنے حواریوں سے پوچھا: تمہارا بھائی سویا ہوا ہو، اور ہوا کی وجہ سے اس کا کپڑا ہٹ جائے جس سے اس کا ستر تھوڑا سا کھل جائے؛ تو تم کیا کروگے؟ انہوں نے

جواب میں عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم تو اس کو ڈھانپ دیں گے۔ آپ نے فرمایا نہیں! تم ڈھانپو گے نہیں، بلکہ تم تو اور زیادہ کھول دو گے۔ انہوں نے کہا: ایسا کون کرے گا؟ آپ نے فرمایا: تم لوگ ایسا ہی کرتے ہو کہ تمہارے بھائی کا کوئی عیب چاہے حقیقی ہو یا غیر حقیقی؛ جب تمہارے سامنے آتا ہے تو بجائے اس کے کہ تم اس کو چھپاؤ، تم اس کو لوگوں کے درمیان اور زیادہ پھیلاتے ہو۔

ایمان نہ ہونے کے مرادف ہے

تو حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی بری باتیں پھیلائی جاتی ہیں اور اسی پر لوگ خوش ہوتے ہیں؛ اسی کو ''شماتت'' کہا جاتا ہے، یعنی کسی کی برائی اور تکلیف پر خوش ہونا، اس کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ کسی کی بدنامی ہو رہی ہے، کسی کے خلاف غلط افواہ چل رہی ہے تو آپ بھی اس میں ساتھ دے رہے ہیں اور اس کو پھیلانے میں مدد کر رہے ہیں۔ اس پر تو قرانِ پاک میں دعویٰ ہے کہ ان کے لئے دنیا اور آخرت میں بھی دردناک عذاب ہے۔ اب جس بات پر قرآن وحدیث میں اتنی سخت وعیدات آئیں، اس کے باوجود مسلمان ایسی حرکتوں کا ارتکاب کرتے رہیں، تو یہ تو گویا اللہ اور رسول کی باتوں پر ایمان نہ ہونے کے مرادف ہے۔

بھائی کی مصیبت پر خوشی کا اظہار مت کرو؛ ورنہ

۱۵۷۷:- وعَن وَاثِلَـةَ بن الأسقع رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسول الله ﷺ:

((لاتُظْهِرِ الشَّمَاتَةَ لأَخِيكَ فَيَرْحَمَهُ اللهُ وَيَبْتَلِيكَ)) (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت واثلۃ بن اسقع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اپنے بھائی کی مصیبت پر خوشی کا اظہار مت کرو؛ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ رحم و

کرم کا معاملہ کرے اور اس مصیبت سے اس کو نجات دیدے اور تم کو اس کے اندر مبتلا کر دے۔

افادات: ۔چنانچہ ایک روایت میں ہے: ''فَيُعَافِيْهِ اللّٰهُ'' اللہ تعالیٰ اس کو اس مصیبت سے عافیت نصیب فرمائے اور تم مبتلا ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہے، اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کے فیصلوں کے معاملہ میں دخل دینے والے تم کون ہوتے ہو؟۔

بہرحال! بھائی چارگی اور رشتۂ اخوت کا تقاضہ یہ تھا کہ کسی پر کوئی مصیبت آئے چاہے اس کے ساتھ رشتہ داری ہو یا نہ ہو، کوئی نسبی وطنی تعلق ہو یا نہ ہو، جماعتی تعلق ہو یا نہ ہو؛ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا فریضہ اور ذمہ داری ہے اس کی مدد کرنا اور ہمدردی کا اظہار کرنا۔ اسلام نے تو انسانیت کی بنیاد پر بھی بہت سارے حقوق لازم کئے ہیں، ایک انسان پر چاہے وہ آپ کا ہم مذہب نہ ہو، اس کے ساتھ بھی بھلائی کرنے کی تاکید فرمائی ہے، چہ جائیکہ ہم مذہب ہو؛ اس صورت میں تو اور زیادہ تاکید آئی ہے۔

ہے یہ گنبد کی صدا

حضورِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ جس مصیبت میں وہ گرفتار ہے اس کو اللہ تعالیٰ نجات دیدے اور تم کو اس میں ڈال دے؛ تو پھر کیا ہوگا؟ تم اس وقت دوسروں پر ہنستے تھے، اب تم خود ہی دوسروں کا نشانہ بن سکتے ہو۔ یہ تو قدرت کا قانون ہے: ؎ ہے یہ گنبد کی صدا، جیسی کہے ویسی سنے

دوسروں کے ساتھ جیسا معاملہ کروگے، ہوسکتا ہے کہ تمہارے ساتھ بھی ویسا معاملہ کیا جائے، اس لئے آدمی ڈرتا رہے۔ اور جس چیز کو ہم اپنی ذات کے لئے پسند نہیں کرتے، اس کو دوسروں کے لئے بھی پسند نہ کریں۔ ہم اگر مصیبت میں ہوں اور لوگ ہم

پر خوش ہوتے ہوں، اس کو ہم گوارا کریں گے؟ جب ہم اس کو اپنے لئے گوارا نہیں کرتے تو دوسروں کے لئے یہ نہیں سوچا جا سکتا۔ یہی ایمان کا تقاضہ ہے۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا

آج کل اگر ہم کسی کو سمجھاتے بھی ہیں کہ ایسا مت کرو، تو وہ کہتا ہے کہ مولوی صاحب! اس نے میرے ساتھ یہ یہ کیا؛ تو میں ایسا کیوں نہ کروں؟ بھائی! اس نے جو بھی کیا؛ وہ کیا، اب تمہیں جو کچھ کرنا ہے اس کا بدلہ اللہ تعالیٰ سے لینا ہے۔ دیکھئے! جتنے بھی اعمال کرنے کے لئے ہمیں کہا گیا ہے، ان کا بدلہ ہمیں انسان سے نہیں لینا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ سے لینا ہے۔ یہی تو اسلام کی عجیب وغریب خوبی ہے کہ آپس کے جتنے بھی حقوق ہیں ان کی ادائیگی کا حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا گیا ہے، اور ان کی ادائیگی پر جو کچھ بھی انعام اور اجر وثواب ملنا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی سے ملنا ہے۔ تم اپنے بھائی کے ساتھ جو بھی بھلائی کا معاملہ کرو گے وہ اس لیے کرو گے کہ شریعت نے حکم دیا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بار بار بتلاتا رہا ہوں کہ اسلام میں ہم پر جو بھی حقوق لازم کئے گئے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لازم کئے گئے ہیں، اور ان کی ادائیگی کے نتیجہ میں ہمیں اجر وثواب بھی اللہ تعالیٰ سے حاصل کرنا ہے۔ ہم اپنے بھائی کے ساتھ جو بھی بھلائی کریں گے اگر اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھ کر کریں گے، تو اس صورت کے اندر ہمیں اس کا بدلہ اللہ تعالیٰ ہی دے گا، ہمیں اسی سے توقع ہے۔ اگر سامنے والا دے تب بھی ہمیں لینے کی ضرورت نہیں ہے:

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا	ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

تو حقیقت یہ ہے کہ اس کا بدلہ اس سے لے کر اس بڑے بدلہ کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والا ہے کیوں بند کریں؟ جیسے: کسی بادشاہ نے آپ کے پاس کسی کو چٹھی دے

کر بھیجا کہ اس کا فلاں کام کر دو، اور آپ نے اس کا وہ کام کر دیا۔ اب وہ آدمی آپ کو کچھ بدلہ دینے کے لئے آئے؛ تو کیا آپ بدلہ لیں گے؟ آپ کہیں گے کہ: نہیں نہیں بھائی! ہم نے تو بادشاہ سلامت کے کہنے سے تمہارا کام کیا ہے، ہمارا معاملہ تو ان سے ہے۔ یہاں ہم یہ جواب اس لیے دیتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ اس سے بدلہ لے کر کیا کریں گے؟ اور وہ دے گا تو زیادہ سے زیادہ کیا دے گا؟ اسی طرح دوسروں کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کر کے ہمیں اس سے کسی بدلے کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔

نفس وشیطان کے دھوکہ سے نجات مل جائے گی

آج کل آپس میں جو کچھ رنجشیں ہوتی ہیں وہ بدلے کی بنیاد پر ہوتی ہیں، اسی لئے ہم ان ساری مصیبتوں میں گرفتار ہیں۔ اگر کوئی ہمارے ساتھ کچھ بھی معاملہ کرے اس وقت ہمیں یہی سوچنا چاہیے کہ ہمیں تو اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا ہے اسی کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے۔ اگر یہ سوچ لیں گے تو ان شاء اللہ ہمارا نفس ہمیں جو دھوکہ دیتا ہے اور شیطان ہمیں جو گمراہ کرتا ہے، اور دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنے سے روکتا ہے؛ اس سے نجات مل جائے گی۔ ہمیں چاہیے کہ بار بار یہی سوچتے رہیں کہ ہم جو کچھ بھی کر رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کے لیے کر رہے ہیں، یہاں تک کہ اپنی بیوی کے ساتھ بھی جو بھلائی کریں وہ اس لئے نہ کریں کہ ہمارے دل میں اس کی محبت ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے اس لیے کریں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اگر دل میں محبت کی کمی بھی ہوگی تب بھی ہم اس کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کا ارتکاب نہیں کریں گے۔

تحریم الطعن فی الانساب الثابتة فی ظاهر الشرع

جونسب شریعت کے ظاہری حکم کے مطابق ثابت ہو اس میں طعن کرنا حرام ہے

ایک عورت کے ساتھ ایک مرد نے نکاح کیا اور اس عورت کے اس مرد کے نکاح میں آنے کے چھ مہینے کے بعد اس عورت کو بچہ پیدا ہوا؛ تو شریعت یہ کہتی ہے کہ یہ بچہ اس مرد کا کہلائے گا جس کے ساتھ اس کا نکاح ہوا ہے۔ بس! بات ختم ہوگئی۔ اب خدانخواستہ وہ عورت برائی میں مبتلا ہوئی، تو لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ بچے کے متعلق کہتے ہیں: (આ તો પેલા નો લાગે) یہ تو فلاں کا لگتا ہے؛ تو شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ مطلب یہ ہے کہ جب اس کا شوہر ہے اور شریعت نے ثبوتِ نسب کے لئے جو اصول وقانون بنائے ہیں وہ سب پائے جارہے ہیں تو ایسا کہنے کی کیسے اجازت ہوگی؟ یہاں تک کہ زنا سے پیدا ہونے والے بچے کا نسب زنا سے ثابت نہیں ہوتا، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھلم کھلا فرما دیا ہے: ''اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ'' عورت جس کے نکاح میں ہے، بچہ تو اسی کا سمجھا جائے گا، یا جس کی باندی ہے اس کا سمجھا جائے گا، اور زانی کے لیے تو پتھر ہیں، اس سے نسب ثابت نہیں ہوسکتا۔ یعنی اگر خدا نہ کرے زنا کا ثبوت ہو بھی جائے تب بھی نسب کو شوہر ہی سے ثابت مانا جائے گا۔ ہاں!

اگر شوہر انکار کردے تو شریعت نے اس کے لئے ایک قانون رکھا ہے کہ آپس میں لعان کیا جائے گا، اور بچے کے نسب کی وجہ سے جب لعان ہو جائے تو اس صورت میں قاضی اس کا نسب کی نسل کرے گا، اس لیے کہ اس کے علاوہ اور کوئی شکل نہیں رہی۔

کبیرہ گناہ

آج کل تو معمولی معمولی باتوں کی وجہ سے، اور شک وشبہ کی وجہ سے لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں؛ تو جان لینا چاہیے کہ یہ تہمت کے اندر داخل ہے جو ایک کبیرہ گناہ ہے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں قرآنِ پاک کی وہی آیت پیش کی ہے جو پہلے بھی کئی مرتبہ آچکی ہے: ﴿وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَاناً وَإِثْماً مُبِيناً﴾

دو باتیں کفر تک پہنچانے والی ہیں

۱۵۷۸:-وعن ابی هريرة رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: اثْنَتَان فی النَّاسِ هُمَا بهم كُفْرٌ: الطَّعْنُ فِي النَّسَبِ، وَالنِّيَاحَةُ عَلَى الْمَيِّتِ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دو باتیں لوگوں کے اندر ایسی ہیں جو ان کو کفر تک پہنچانے والی ہیں (یعنی ان کا گناہ کفر جیسا ہے) ایک تو کسی کے نسب میں طعن کرنا، اور دوسرا میت پر نوحہ کرنا۔

افادات:- ان دونوں کی شریعت بالکل اجازت نہیں دیتی۔ یہ دونوں بہت بڑے گناہ ہیں، ان سے اپنے آپ کو بچانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

باب النهي عن الغش والخداع

ملاوٹ اور دھوکہ کی ممانعت

والَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ والْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَاناً وإِثْماً مُبِيناً. (الأحزاب:۵۸)

چوں کہ یہ ساری چیزیں وہی ہیں جو ایمان والوں کو تکلیف پہنچانے والی ہیں اور ہر وہ کام جو کسی مؤمن مرد وعورت کی تکلیف کا ذریعہ بنتا ہو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑی وعیدیں آئی ہیں۔ اسی میں دو چیزوں کو اس باب میں بیان کرتے ہیں۔

''غِشٌّ'' خیر خواہی میں ملاوٹ کو کہتے ہیں، یعنی بھلائی چاہنے میں کمی کرنا اور خیر خواہی نہ کرنا۔ اور کسی کو دھوکہ دینے کو ''خِدَاعٌ'' کہتے ہیں۔

وہ ہم میں سے نہیں

۱۵۷۹:- عن أَبِي هريرة - رضي الله عنه: أَنَّ رسول الله ﷺ قَالَ: ((مَنْ حَمَلَ عَلَيْنَا السِّلاَحَ فَلَيْسَ مِنَّا، وَمَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا)). (رواه مسلم)

وفي رواية لَهُ: أَنَّ رسول الله ﷺ مَرَّ عَلَى صُبْرَةِ طَعَامٍ فَأَدْخَلَ يَدَهُ فِيهَا فَنَالَتْ أصابِعُهُ بَلَلاً، فَقَالَ: ((مَا هٰذَا يَا صَاحِبَ الطَّعَامِ؟)) قَالَ: أَصَابَتْهُ السَّمَاءُ يَا رسول الله. قَالَ: ((أَفَلاَ جَعَلْتَهُ فَوقَ الطَّعَامِ حَتَّى يَرَاهُ النَّاسُ! مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا)).

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو

ہمارے خلاف ہتھیار اُٹھائے گا (یعنی کسی کو صرف ہتھیار دکھائے گا تو) وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ اور جو آدمی ہم کو دھوکہ دے (اور ہمارے ساتھ ملاوٹ کرے اور خیر خواہی کا معاملہ نہ کرے) تو وہ بھی ہم میں سے نہیں ہے۔

اور ایک روایت حضرت ابو ہریرہؓ ہی کی ہے (جس میں اس کی وجہ بتلائی ہے) ایک مرتبہ آپ ﷺ بازار سے گزر رہے تھے، ایک آدمی اناج کا ایک ڈھیر لئے ہوئے بیچنے کے لئے کھڑا تھا، نبیٔ کریم ﷺ نے اپنا ہاتھ اس اناج کے اندر داخل فرمایا، تو اناج کے دانے اندر سے گیلے تھے (چوں کہ اناج کا گیلا ہونا عیب ہے اور اس کی وجہ سے وزن بھی بھاری ہو جاتا ہے) تو حضور اکرم ﷺ نے پوچھا: بھائی! یہ کیا ہے؟ (اندر سے گیلے اور اوپر سے سوکھے؛ ایسا کیوں ہے؟) اس نے جواب دیا: یا رسول اللہ! دراصل بارش گر گئی تھی اس کی وجہ سے جو دانے بھیگ گئے تھے ان کو میں نے اندر کر دیا، اور اندر کے جو دانے سوکھے تھے وہ اوپر کر دیئے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ان کو اوپر کیوں نہیں کیا کہ لوگ دیکھ لیں؟ جو ہمیں دھوکا دے گا اور ہمارے ساتھ ملاوٹ کا معاملہ کرے گا؛ وہ ہم میں سے نہیں (حضور اکرم ﷺ اس کو اپنی جماعت سے خارج بتلا رہے ہیں اور اس کو اپنا امتی کہنے کے لئے راضی نہیں ہیں)۔

افادات:- اس روایت میں ایک تو اسلامی اخوت و بھائی چارگی کے تقاضے بتلائے ہیں۔ بہت سوں کی عادت ہوتی ہے کہ دوسروں کو ڈرانے کے لئے بات بات میں چاقو نکال لیتے ہیں، بات بات میں ڈنڈا اُٹھا لیتے ہیں، اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

دوسری بات یہ بتلائی کہ جو ہمیں دھوکہ دے اور ہمارے ساتھ ملاوٹ کا معاملہ کرے؛ وہ ہم میں سے نہیں۔ آج کل تو معمولی نفع اور دو پیسوں کی خاطر دھوکہ دینے کی بات ہوتی ہے، جیسا کہ بہت سے لوگ پوچھتے ہیں اور مفتیانِ کرام سے باقاعدہ سوال کیا جاتا ہے کہ مسالہ کے اکثر دکاندار سوکھی مرچوں میں پانی ڈال دیتے ہیں، اور ان کا

کہنا یہ ہے کہ اگر ہم پانی نہ ڈالیں تو وہ سوکھی رہتی ہیں جس سے ہمارا نقصان ہوتا ہے؛ تو یہ دھوکہ اور ملاوٹ ہے۔ دارالافتاء کی برکت سے بہت سی چیزیں ہمارے علم میں بھی آجاتی ہیں؛ ورنہ ہمیں تو پتہ بھی نہ چلے۔

امام ابوحنیفہؒ کا طریقۂ تجارت

پہلے زمانہ میں اس کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا کہ اگر کوئی عیب ہوتا تو سودا کرنے کے وقت اس کو بتلانا ضروری سمجھتے تھے۔ اگر بھول سے بتانا رہ گیا ہو تو اس کو اپنے لئے گوارا نہیں کرتے تھے۔ امام ابوحنیفہؒ کی کپڑوں کی تجارت تھی اور حفص بن عبدالرحمن امام صاحب کے پارٹنر تھے، ایک تھان ایسا تھا جس میں کوئی عیب تھا تو امام ابوحنیفہؒ نے اپنے پارٹنر کو بتلایا کہ جب اس تھان کو بیچنا تو خریدنے والے کو عیب بتا دینا، لیکن بیچتے وقت عیب بتانا وہ بھول گئے ان کو یاد ہی نہیں رہا، اور سارا لاٹ بیس ہزار درہم میں بک گیا۔ اور بیس ہزار درہم کی تقریباً چھ سو پچاس کلو چاندی ہوتی ہے۔ خیر! بعد میں جب امام صاحب کے ساتھ حساب کتاب ہونے لگا تو امام صاحبؒ نے پوچھا: میں نے تم سے کہا تھا کہ ایک تھان کے اندر عیب ہے وہ خریدار کو بتا دینا؛ تو تم نے اس کو بتا دیا تھا؟ اب ان کو یاد آیا اور کہنے لگے: میں تو بھول ہی گیا۔ امام صاحب نے پوچھا: خریدنے والا کون تھا؛ اس کو تلاش کرو۔ بہت تلاش کیا لیکن خریدار کا پتہ نہیں چلا، تو امام صاحب نے اتنا ہی نہیں کیا کہ اس سودے میں جو منافع ہوا تھا اس کو الگ کر کے صدقہ کر دیا، بلکہ پوری قیمت (بیس ہزار درہم) کا صدقہ کر دیا۔ غور کیجئے کہ کتنی زیادہ احتیاط فرمائی کہ اپنے لئے اس کو گوارا ہی نہیں کیا اور آئندہ کے لیے ان سے شرکت ختم کر لی۔ آج کل تو جان بوجھ کر ایسا کیا جاتا ہے؛ پھر کمائی کیسے درست ہو سکتی ہے؟۔

یہ بھی دھوکہ ہے

۱۵۸۰:-وعنه: أَنَّ رسول الله ﷺ قَالَ: ((لَا تَنَاجَشُوا)) (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:-حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نجش مت کرو۔

افادات:- ''نجش'' کا مطلب پچھلے سبق کے اندر آچکا کہ کوئی چیز نیلام کی جارہی ہو، اور کسی کا اس چیز کو خریدنے کا ارادہ نہیں ہے پھر بھی اس کی قیمت بڑھائے جارہا ہے؛ تاکہ دوسرے لوگ زیادہ قیمت میں لے لیں۔ آج کل شہروں میں خاص کر فٹ پاتھ پر جو چیزیں نیلام کی جاتی ہیں وہاں نیلام کرنے والے خود ہی اپنے گُرگے رکھ چھوڑتے ہیں جو قیمت بڑھاتے رہتے ہیں۔ کوئی نیا آدمی بیچارہ آتا ہے تو دیکھتا ہے کہ پینٹ یا شرٹ پانچ روپئے میں مل رہا ہے، تو وہ سوچتا ہے کہ کتنا سستا ہے، اتنا سستا تو میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں، ابھی وہ قیمت لگانا ہی چاہتا تھا کہ نیلام کرنے والے کا ہی چھوڑا ہوا گُرگا آکر کہتا ہے کہ دس میں دینا ہے، پھر دوسرا پندرہ لگاتا ہے، اور اس کی قیمت بڑھاتے بڑھاتے اس کی جو اصل قیمت ہے اس سے بھی آگے نکل جاتا ہے، چوں کہ ان کا خریدنے کا ارادہ تو ہوتا نہیں پھر بھی قیمت لگاتے ہیں؛ اب جو آدمی حقیقت میں خریدار ہوتا ہے اس کے ساتھ ایک طرح کا دھوکہ ہی ہوجاتا ہے؛ اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

امانت و دیانت کا تقاضہ

۱۵۸۱:-وعن ابن عمر رضی الله عنهما: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهى عن النَّجْشِ (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:-حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات سے

منع فرمایا کہ خریدنے کا ارادہ نہ ہو پھر بھی قیمت بڑھائی جائے۔

۱۵۸۲:-وعنه قَالَ: ذَكَرَ رَجُلٌ لِرَسُولِ الله ﷺ: أَنَّهُ يُخْدَعُ فِي البُيُوعِ؟ فَقَالَ رسول الله ﷺ: ((مَنْ بَايَعْتَ، فَقُلْ: لاَ خِلاَبَةَ)). (متفق عَلَيْهِ)

((الخِلاَبَةُ)) بخاءٍ معجمةٍ مكسورةٍ وباءٍ موحدة، وهي: الخديعة.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضور اکرم ﷺ سے اپنا حال بیان کیا کہ مجھے زیادہ سمجھ نہیں پڑتی ہے، اس لئے خریداری میں دھوکہ ہو جاتا ہے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: جس کے ساتھ بھی سودا کرو تو یوں کہہ دیا کرو کہ دھوکہ نہیں ہونا چاہیے۔

افادات:- وہ زمانہ خیر و برکت کا تھا، لوگوں میں امانت و دیانت تھی، اس لیے گویا وہ آدمی اپنا حال بتلا دے کہ مجھے سودے میں سمجھ نہیں پڑتی ہے، لہٰذا جو بھی معاملہ کرنا برابر کر کے دینا، تو اب دکاندار کو بھی چاہیے کہ ایسے آدمی کے ساتھ دھوکہ نہ کرے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ خود ہی جانچ پرکھ لیتے ہیں، اس لیے دکاندار بھی ان کے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں کر سکتا، اگر کچھ بھی گڑبڑ ہو تو ان کو پتہ چل جاتا ہے۔ لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس کا اندازہ لگا نہیں سکتے، اس لیے اگر وہ صاف صاف بات کر لے؛ تو اس صورت کے اندر پھر امانت اور دیانت داری اور اخوتِ اسلامی کا تقاضا یہ ہے کہ جو چیز جیسی ہو اس کو بتلا دی جائے، پھر بھی اگر کسی معاملہ میں اس کے ساتھ دھوکہ کیا گیا تو اس کو معاملہ فسخ کرنے کا اختیار رہے گا۔

ہم میں سے نہیں

۱۵۸۳:-وعن أَبي هريرة - رضي الله عنه - قَالَ: قَالَ رسول الله ﷺ: ((مَنْ خَبَّبَ زَوْجَةَ امْرِئٍ، أَوْ مَمْلُوكَهُ، فَلَيْسَ مِنَّا)). (رواهُ أَبُو داود)

((خَبب)) بخاءٍ معجمة، ثُمَّ باءٍ موحدة مكررة: أيْ أفْسده وخدعه.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس آدمی نے کسی کی بیوی کو شوہر کے خلاف، یا کسی کے غلام کو آقا کے خلاف بھڑکایا؛ تو ایسا آدمی ہم میں سے نہیں ہے۔

افادات:- آج کل یہ ایک عام بیماری ہوچکی ہے کہ میاں بیوی میں بہت اچھا چل رہا ہے، لیکن ایک تیسرا آدمی بیوی کے کان میں پھونک مارتا ہے کہ تیرا شوہر تو ایسا ایسا ہے۔ اب وہ بیچاری بیوقوف بیوی دوسرے کے کہنے پر شوہر کے ساتھ اپنا معاملہ بگاڑ لیتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دھیرے دھیرے ان کے تعلقات خراب ہوتے ہیں اور نوبت طلاق اور جدائی تک پہنچ جاتی ہے۔

یا کسی سیٹھ کے یہاں کوئی نوکر بہت اچھا ہوتا ہے تو کسی کو اس سے حسد ہوجاتا ہے کہ یہ اس کے یہاں سے کسی بھی طرح چلا جائے۔ لہٰذا وہ اپنی صلاحیتیں اس کے لئے استعمال کرنا شروع کرتا ہے اور اس کے دل میں باتیں ڈالتا ہے کہ تمہارے سیٹھ کا تو کوئی ٹھکانہ نہیں ہے، اس کا مزاج تو ایسا ہے کہ اپنے پرانے پرانے نوکروں کو چلتا کردیتا ہے، کہیں تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی نہ کرے، اگر کبھی تجھے بھی چلتا کردیا تو تم تو فٹ پاتھ پر آجاؤگے (یعنی کہیں کے نہ رہوگے) ایسی باتیں بنا بنا کر اس کو سیٹھ کے خلاف بھڑکاتا ہے، اور آج کل ایسے طریقے بہت زیادہ چل رہے ہیں۔ تو جو لوگ شوہروں کے خلاف بیویوں کو بھڑکانے کا کام کرتے ہیں، یا آقا اور سیٹھ کے خلاف غلام اور نوکروں کو بھڑکاتے ہیں، ان کے متعلق حضورِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ ایسا آدمی ہم میں سے نہیں۔ دیکھئے! کتنی سخت وعید ہے۔

پھر کس سے توقع لگائی جاسکتی ہے؟

یہ بہت اہم چیز ہے۔ لیکن بہت سے لوگ ایسی حرکت کرتے ہیں اور اس کو کوئی گناہ اور برا کام بھی نہیں سمجھتے، حالاں کہ یہ اتنا خطرناک اور بڑا گناہ ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ اس کو اپنا امتی ماننے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں۔ اور جس کو حضور ﷺ فرمادیں کہ یہ میرا نہیں؛ تو بھلا اس کا کل قیامت میں کیا حال ہوگا؟ وہاں کے متعلق تو بہت سے گنہگاروں کو بھی یہی آس لگی رہتی ہے کہ حضور ﷺ کی شفاعت نصیب ہو جائے گی اور ہمارے گناہوں پر پردہ پڑ جائے گا۔ لیکن اگر ہم ایسی حرکتیں کریں اور حضور ہی فرمادیں کہ تو میرا نہیں ہے؛ تو پھر اس کے بعد کون سی توقع قائم کی جاسکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے اور ہمیں صحیح توفیق عطا فرمائے۔

باب تحریم الغدر

عہد شکنی حرام ہے

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ. (المائدۃ:۱)

وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولاً. (الإسراء: ۳۴)

نیا عنوان قائم کیا ہے: عہد شکنی کا حرام ہونا۔ آپس میں جو معاہدہ کیا جاتا ہے اس کو پورا کرنے کا قرآنِ پاک میں حکم ہے اسی سلسلہ میں دو آیتیں پیش کی ہیں: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ﴾ اے ایمان والو! جو معاملات اور معاہدات آپس میں طے کئے جائیں ان کو پورا کرو۔

اور باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولاً﴾ معاہدے کو پورا کرو، بے شک اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کے یہاں سوال ہوگا۔

عہد اور معاہدہ میں فرق اور شرعی حکم

اگر ایک فریق دوسرے فریق کو کسی کام کے انجام دینے، یا کسی کام کے چھوڑنے کے متعلق اپنی طرف سے گارنٹی دے اور اطمینان دلائے اور معاملہ یک طرفہ (One Sided) ہو؛ تو وہ تو "وعدہ" کہلاتا ہے۔ اور اگر دونوں فریق مل کر کسی کام کرنے یا چھوڑنے کے لئے آپس میں طے کریں، اور کسی کام کے کرنے پر، یا کسی کام کے چھوڑنے پر اپنی رضامندی کا اظہار کریں؛ تو یہ "معاہدہ" کہلاتا ہے۔

اب سوال ہوتا ہے کہ دونوں میں فرق کیا ہے؟ تو دیکھئے! معاہدہ میں تو شرعی

طور پر یہ حکم ہے کہ اگر ایک فریق کی طرف سے اس کی خلاف ورزی ہو تو شریعت نے دوسرے کو یہ حق دیا ہے کہ وہ شرعی کورٹ میں قاضی کے پاس جا کر اس کے متعلق مطالبہ کرے اور سامنے والے فریق کو- آپس میں جو بات طے ہوئی ہے اس کے انجام دینے پر- مجبور کرے۔ گویا بذریعۂ قاضی یہ حق وصول کیا جا سکتا ہے۔

جبکہ وعدہ کے اندر ایسا نہیں ہے۔ یعنی اگر کسی نے یک طرفہ وعدہ کیا ہو کہ میں فلاں کام کروں گا، یا فلاں کام نہیں کروں گا؛ تو اس صورت میں اس وعدہ کو پورا کرنا ایمانی تقاضہ ہے، اور اس کو پورا نہ کرنے کی صورت میں وہ گنہگار ہوگا، لیکن جس کے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے وہ کورٹ میں مقدمہ دائر کر کے اور قاضی کا تعاون حاصل کر کے اس سے زبردستی وہ کام نہیں کروا سکتا۔ وعدہ اور معاہدہ میں یہی فرق ہے۔ معاہدہ میں وعدہ کے مقابلہ میں قوت زیادہ آتی ہے، اگرچہ دونوں (وعدہ کی خلاف ورزی، اور معاہدہ کی خلاف ورزی) کو نفاق کی علامت قرار دیا گیا ہے۔

تو معاہدہ کی خلاف ورزی جس کو وعدہ توڑنا اور عہد شکنی کہا جاتا ہے اس کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس پر قرآن وحدیث میں بہت تاکید آئی ہے اور اس کی خلاف ورزی کرنے کی صورت میں بہت وعیدیں بیان فرمائی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے کہ جو قوم عہد شکنی میں مبتلا ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اس کے اوپر دشمنوں کو مسلط کر دیتا ہے۔

معاہدہ کی قسمیں

اب علماء نے معاہدوں کی تین قسمیں بتلائی ہیں: ایک معاہدہ تو بندے کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ آدمی جب ایمان لاتا ہے اور کلمہ پڑھتا ہے، تو اس وقت گویا وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک معاہدہ کرتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے احکام

اور نبیٔ کریم ﷺ کی ہدایات کو عملی جامہ پہناؤں گا، اللہ تعالیٰ کی اطاعت، فرمانبرداری کروں گا اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری میں رسول اللہ ﷺ کی پیروی کروں گا۔ گویا پوری شریعت بندہ کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک طرح کا معاہدہ ہی ہے۔ اب جو آدمی شریعت کی خلاف ورزی کرتا ہے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ عہد شکنی کرنے والا اور معاہدہ کی خلاف ورزی کرنے والا ہے، اور عہد شکنی کرنے پر جن عذابوں سے ڈرایا گیا ہے؛ شریعت کی خلاف ورزی پر بھی ان سارے عذابوں کا امکان ہے۔

معاہدہ انسانوں کا انسانوں کے ساتھ

اور ایک معاہدہ انسانوں کا انسانوں کے ساتھ ہوتا ہے، مثلاً: آپ نے کسی آدمی کے ساتھ کوئی معاملہ کیا، چاہے خرید و فروخت کا ہو جس کو عقد اور سودا کرنا کہتے ہیں، چاہے کرایہ داری کا ہو، یا دنیا میں آپس میں جو بہت سارے معاملات کئے جاتے ہیں ان سب معاہدات میں دو فریقوں نے – چاہے وہ دو آدمی ہوں، یا دو جماعتیں ہوں، یا دو حکومتیں ہوں – آپس میں کسی کام کے کرنے، یا نہ کرنے کے متعلق جو بھی طے کیا ہو اور معاہدہ کیا ہو، اگر وہ شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے ہے، اور اس میں اللہ اور رسول کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں ہو رہی ہے؛ تو ان کو پورا کرنا دونوں میں سے ہر ایک کے لیے ضروری ہے۔ اور اگر وہ معاہدہ کسی ناجائز کام کا کر لیا ہو، یعنی معلوم ہی نہیں تھا اور غفلت میں کر لیا، پھر بعد میں کسی نے بتایا کہ آپ لوگوں نے آپس میں جو معاہدہ کیا ہے وہ شرعاً درست نہیں ہے، تو جب کسی ایک فریق کو پتہ چلے تو وہ سامنے والے فریق کو آگاہ کر دے کہ ہمارا معاہدہ تو ہوا تھا، لیکن مجھے شریعت کا حکم معلوم نہیں تھا اب صحیح حکم معلوم ہوا تو پتہ چلا کہ ہمارا یہ معاہدہ شریعت کے اعتبار سے درست نہیں، لہٰذا اب

وہ معاہدہ ختم ہو چکا ہے، اور پھر اس عہد کی پابندی کرنا ضروری نہیں ہے۔

معاہدہ اپنی ذات کے ساتھ

اور ایک معاہدہ وہ بھی ہے جو آدمی اپنی ذات سے کرتا ہے، جیسے: کسی چیز کی منت مان لی، یا قسم کھالی؛ تو اس کو پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ منتوں کے پورا کرنے کے سلسلہ میں فقہاء جہاں دلائل قائم کرتے ہیں اس میں اس آیت ''وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولاً'' کو بھی پیش کرتے ہیں۔ مثلاً: کسی آدمی نے یہ منت مان لی کہ میرا فلاں کام ہو جائے گا تو میں اتنے روزے رکھوں گا، یا اتنا مال صدقہ کروں گا، یا حج کروں گا، یا فلاں نیک کام کروں گا۔ تو منت کے صحیح ہونے کی جو شرطیں ہیں وہ اگر ان شرطوں کے مطابق ہے، تو گویا یہ ایک معاہدہ ہے جو آدمی اپنی ذات سے کر رہا ہے، اب اس کا پورا کرنا بھی ضروری ہے۔

اسی طرح کسی کام کے متعلق کرنے یا نہ کرنے کی قسم کھالی، مثلاً: کوئی آدمی اللہ کے نام کو بیچ میں رکھ کر قسم کھالے، تو گویا وہ بھی ایک کام کو کرنے کے لئے اپنی ذات سے کہہ رہا ہے؛ تو یہ بھی ایک طرح کا معاہدہ ہے جو انسان اپنی ذات سے کرتا ہے اور اس کا پورا کرنا بھی ضروری ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ یہ باب قائم کر کے بتلانا چاہتے ہیں کہ تینوں میں سے جونسا بھی معاہدہ ہو، چاہے انسان نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا ہو، یا انسانوں کا آپس میں کیا ہوا ہو، چاہے ایک فرد کا دوسرے فرد کے ساتھ، ایک جماعت کا دوسری جماعت کے ساتھ، ایک حکومت کا دوسری حکومت کے ساتھ، ایک ملک کا دوسرے ملک کے ساتھ۔ یا ایک آدمی اپنی ذات کے ساتھ جو معاہدہ کرتا ہے؛ یہ سارے معاہدات اگر شریعت کی حدود

میں رہ کر ہیں؛ تو ان سب کا پورا کرنا ضروری ہے، اور ان کی خلاف ورزی کرنا حرام اور ممنوع ہے۔

منافق کی چار خصلتیں

۱۵۸۴:-وعن عبد الله بن عمرو بن العاص رضی الله عنهما : أَنَّ رسول الله ﷺ قَالَ : ((أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقاً خَالِصاً، وَمَنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتَّى يَدَعَها : إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ، وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ)). (متفق عَلَيْهِ.)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس آدمی میں چار خصلتیں اور عادتیں ہوں گی، تو وہ خالص منافق ہوگا، اور جس میں ان میں سے کوئی ایک عادت ہوگی تو (یوں کہا جائے گا کہ) نفاق کی عادتوں میں سے ایک عادت ہے، یہاں تک کہ اس کو چھوڑ دے۔ جب اس کے پاس کوئی چیز امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے، اور جب بات کرے تو جھوٹ بولے، اور جب عہد کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے، اور جب جھگڑا کرے تو حد سے آگے نکل جائے۔

افادات:- ’’نفاق‘‘ یعنی ظاہر اور باطن کا ایک دوسرے سے مخالف ہونا، اندر کچھ ہو اور باہر کچھ ظاہر کیا جائے؛ اس کو شریعت کی اصطلاح میں نفاق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دیکھئے! کفر کی کئی قسمیں ہیں، ایک تو کفر بدیہی ہوتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک ٹھہرایا جائے۔ دوسرا ’’کفرِ جُحود‘‘ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو جانتے ہوئے بھی اس سے انکار کرے، یعنی دلائل سامنے ہیں جن کی وجہ سے

دل بھی ماننے کے لئے آمادہ ہے لیکن پھر بھی انکار کرتا ہے۔ اور تیسرا ''کفر نفاق'' کہلاتا ہے کہ دل کے اندر تو کفر ہی ہے لیکن زبان سے ایمان کا اظہار کرتا ہے، گویا ظاہر و باطن میں فرق ہوتا ہے۔ لیکن اگر دل کے اندر تو ایمان ہے، اور عملی شکل میں اس کے تقاضوں کی خلاف ورزی کرتا ہے؛ تو یہ نفاق ہی کی ایک شکل ہے۔ اور موجودہ زمانہ کے مسلمان اکثر وہ ہیں جو دل میں ایمان رکھتے ہیں لیکن ان کے اعضاء و جوارح سے جو اعمال سرزد ہوتے ہیں وہ ایمان کے تقاضوں کے مطابق نہیں ہوتے؛ یہ کفر نہیں ہے، بلکہ اس کو ''نفاقِ عملی'' کہا گیا ہے، ایسا آدمی گنہگار کہلائے گا اور اس کو اپنی اصلاح کی فکر کرنا چاہیے۔ اور ان عادتوں کو نفاق کی علامتیں قرار دے کر اہلِ ایمان کو اس بات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ جو آدمی اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے، اس کے شایانِ شان نہیں ہے کہ ان باتوں میں سے کوئی بات اس کے اندر پائی جائے، اگر ایسی کوئی بات پائی جاتی ہے تو اس کو فکر کرنی چاہیے، اور ایسی برائی سے اپنے آپ کو جلد از جلد پاک صاف کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

ایمان کے تقاضے

''إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ'' جب اس کے پاس کوئی چیز امانت رکھی جائے تو وہ خیانت کرے (اس کی تفصیل چوتھی جلد میں امانت کے باب کے اندر آچکی ہے)

''وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ'' اور جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔

''وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ'' جب عہد کرے تو اس کی خلاف ورزی اور عہد شکنی کرے۔ بعض روایتوں میں ''إِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ'' آیا ہے۔ اور میں نے وعدہ اور معاہدہ کا فرق بتلایا تھا کہ وعدہ یکطرفہ ہوتا ہے، اور معاہدہ دوطرفہ ہوتا ہے۔ اسی لئے بعض

روایتوں میں ''وَعَدَ'' آیا ہے، اور بعض روایتوں میں اسی کو ''عَاھَدَ'' سے تعبیر کیا ہے۔ معاہدہ کے اندر وعدہ کے مقابلہ میں پختگی زیادہ ہے جیسا کہ میں نے اس کا بھی حکم بتلایا تھا، اسی کو ایگریمنٹ کہتے ہیں۔ لیکن آج کل یہ مصیبت بھی عام ہوگئی ہے کہ آپس میں ایگریمنٹ کرتے ہیں اور پھر اس سے مُکَرُ جاتے ہیں؛ حالاں کہ یہ حرام ہے اور بہت خطرناک گناہ ہے، اس پر بڑی سخت وعید آئی ہے، اس سے اپنے آپ کو بچانا چاہیے۔ ایک مرتبہ جب معاہدہ ہوا تو اس کی پابندی کرنا ایمان کا تقاضا ہے۔

انصاف کے تقاضے مت چھوڑو

''وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ'' اور جب جھگڑا کرے تو آپے سے باہر نکل جائے اور گالی گلوچ کرنے لگے۔ حالاں کہ مؤمن کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جھگڑے کی حالت میں بھی انصاف کے تقاضوں کو نہ چھوڑے، اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ﴾ کسی قوم کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف کے تقاضوں کو چھوڑ دو، انصاف پر قائم رہو، یہی تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔ کسی کے ساتھ کیسی ہی دشمنی کیوں نہ ہو، اس کے باوجود ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ اس کو جا و بیجا نقصان پہنچایا جائے۔ آپ انصاف پر قائم رہیے، انصاف کے تقاضوں کو مت چھوڑیئے۔

حب وبغض میں اعتدال

بہت سوں کا مزاج ایسا ہوتا ہے کہ اگر کسی کے ساتھ دوستی ہوگئی تو اس کی تعریف کے اتنے پل باندھ دیئے کہ اس کو آسمان پر چڑھا دیا، اور جب کسی سے دشمنی پر

اتر آئے تو ایسے اس کے پیچھے پڑ گئے کہ اس کا جینا دوبھر کر دیا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے، اسلام اس کو پسند نہیں کرتا، اسلامی تعلیم تو یہ ہے، ترمذی شریف کی روایت میں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: أَحْبِبْ حَبِيبَكَ هَوْنًا مَا، عَسٰى أَنْ يَكُونَ بَغِيضَكَ يَوْمًا مَا، وَأَبْغِضْ بَغِيضَكَ هَوْنًا مَا، عَسٰى أَنْ يَكُونَ حَبِيبَكَ يَوْمًا مَا، دوست سے دوستی کرو تب بھی ہلکی کرو، ہوسکتا ہے کہ کبھی وہ دشمن ہوجائے۔ اور دشمن سے دشمنی کرو تو وہ بھی ہلکی کرو؛ ہوسکتا ہے کبھی وہ دوست ہوجائے۔ بہت سوں کا مزاج ایسا ہوتا ہے کہ کسی کو دوست بناتے ہیں تو اتنی دوستی بڑھاتے ہیں کہ اپنے سارے راز اور بھید سے اس کو واقف کرا دیتے ہیں پھر جب وہی دوست دشمنی پر اتر آتا ہے تو ایک ایک کر کے سب راز وصول کرتا ہے۔ اور اگر دشمنی میں ہم نے کوئی پوئنٹ چھوڑا ہی نہیں، تو بعد میں اگر دشمنی ختم ہوجائے گی اور دوستی کا وقت آئے گا تو وہ سب باتیں یاد آئیں گی، اور اس کے سامنے دل ہی دل میں شرمندہ ہونا پڑے گا۔ اس لیے آدمی کو ہر معاملہ شریعت کے حدود کے اندر ہی رہ کر کرنا چاہیے۔

انتہاء درجہ کی رسوائی

۱۵۸۵:-وعن ابن مسعودٍ، وابن عمر وأنس-رضی الله عنهم-قالوا: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: ((لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، يُقَالُ: هٰذِهِ غَدْرَةُ فُلَانٍ))

(متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- یہ روایت تین صحابہ کرام حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عمر حضرت انس رضی اللہ عنہم نقل کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہر عہد شکنی کرنے والے (ایگریمنٹ کو توڑنے والے) کے لئے قیامت کے روز ایک جھنڈا ہوگا، اور اعلان کیا جائے گا کہ

یہ فلاں کی عہد شکنی ہے۔

افادات:۔عرب میں دستور یہ تھا کہ اگر کسی کے ساتھ کوئی عہد شکنی کرتا تو حج کے موقع پر باقاعدہ کالے رنگ کا جھنڈا گاڑا جاتا تھا۔لوگ پوچھتے تھے کہ یہ کاہے کا جھنڈا ہے؟ تو کہا جاتا تھا کہ فلاں نے فلاں کے ساتھ معاہدہ کیا تھا لیکن اس کی خلاف ورزی کی۔گویا یہ اس کے لیے سماج کے اندر ایک طرح کی شرمندگی کا موقع ہوتا تھا۔

اور اگر کسی نے کسی کے ساتھ کوئی ایسا معاہدہ کیا ہوتا جس کو پورا کرنا واقعتاً مشکل تھا، لیکن جان پر کھیل کر اور تکلیف اُٹھا کر بھی اس عہد کو پورا کرتا تھا تو اس کی نیک نامی کے واسطے سفید رنگ کا ایک جھنڈا گاڑا جاتا تھا، لوگ پوچھتے تھے کہ یہ کاہے کا جھنڈا ہے؟ تو بتایا جاتا تھا کہ فلاں نے فلاں کے ساتھ ایک عہد کیا تھا اس کو پورا کیا، یہ اس کا جھنڈا ہے۔یہ عرب کا ایک دستور تھا اسی کے مطابق سمجھانے کے لئے کہا گیا کہ قیامت کے روز بھی ایسا ہی ہوگا۔

اور دنیا میں حج کے موقعہ پر اُس زمانہ میں اتنے حاجی نہیں ہوتے تھے جتنے آج ہمارے زمانہ میں ہوتے ہیں۔لیکن اُس وقت کے اعتبار سے زیادہ ہی ہوتے تھے۔تو جب اس کو اپنے لئے اتنا معیوب اور بدنامی کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، تو قیامت کے روز جبکہ اولین وآخرین سب جمع موجود ہوں گے اور وہاں اس طرح کا جھنڈا گاڑا جائے گا اور اعلان کیا جائے گا کہ یہ فلاں کی عہد شکنی کا جھنڈا ہے، تو کتنی بڑی بدنامی کی بات ہوگی۔ گویا انتہاء درجہ کی رسوائی ہوگی، اس لئے اس سے اپنے آپ کو بچانے کا اہتمام کیا جائے۔

اس سے بڑی غداری اور کوئی نہیں ہوسکتی

۱۵۸۶:-وعن أَبِی سعیدٍ الخدریؓ رضی اللہ عنہ: أَنَّ النبیَّ ﷺ قَالَ:

((لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ عِنْدَ إِسْتِهِ يومَ القِيَامَةِ يُرْفَعُ لَهُ بِقَدَرِ غَدْرِهِ، أَلاَ وَلاَ غَادِرَ أَعْظَمُ غَدْراً مِنْ أَمِيرِ عَامَّةٍ)). (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہر عہد شکنی (اور اگریمنٹ کی خلاف ورزی) کرنے والے کے لئے اس کی سرین پر جھنڈا گاڑا جائے گا اور (کمال تو یہ ہے کہ) جتنی بڑی عہد شکنی ہوگی وہ جھنڈا بھی اتنا ہی اونچا ہوگا (حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں) سنو! ایک حاکمِ اعلیٰ کی غداری کرنے سے بڑی غداری (اور عہد شکنی) کرنے والا اور کوئی نہیں ہے۔

افادات:- جیسی جیسی عہد شکنی ہوگی اسی حساب سے جھنڈے کی اونچائی بھی ہوگی، اگر بڑی عہد شکنی ہوگی تو جھنڈا بھی اسی حساب سے زیادہ اونچا ہوگا۔ اور اگر چھوٹی عہد شکنی ہوگی تو جھنڈا بھی چھوٹا ہوگا۔ اور وہ جھنڈا زمین پر نہیں بلکہ اس کی سرین پر گاڑا جائے گا۔ گویا یہ اس کے لئے اور زیادہ تکلیف اور بدنامی کا ذریعہ ہوگا۔

''حاکم کی غداری کرنے سے بڑی غداری اور کوئی نہیں''، یعنی جس کو حاکم اور امیر بنایا گیا، پھر وہ اپنے وعدہ کو پورا نہ کرتے ہوئے عہد شکنی کرے؛ تو وہ سب سے بڑی غداری ہے۔ جیسے: الیکشن کے موقعہ پر جمہوری حکومتوں کی ہر جماعت کی طرف سے باقاعدہ اپنا ایجنڈا شائع کیا جاتا ہے کہ اگر ہم برسرِ اقتدار آئے تو ہماری طرف سے لوگوں کو سہولت کے طور پر فلاں فلاں چیزیں دی جائیں گی، انہیں وعدوں اور ایگریمنٹ کی بنیاد پر ان کو ووٹ دیئے جاتے ہیں، اب ظاہر ہے کہ اگر ایک فرد کا دوسرے ایک فرد کے ساتھ، یا ایک جماعت کا دوسری ایک جماعت کے ساتھ کوئی معاہدہ اور وعدہ ہو، اور پھر اس کو پورا نہ کیا جائے تو اس کا نقصان محدود ہوتا ہے، لیکن یہاں تو پوری قوم اور ایک

جم غفیر کے ساتھ وعدہ و معاہدہ کیا جاتا ہے، اور جب اس کو توڑا جائے گا تو صرف ایک آدمی یا ایک جماعت کا دل نہیں ٹوٹے گا، بلکہ سینکڑوں اور کروڑوں آدمیوں کے دل ٹوٹیں گے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کتنا خطرناک عمل ہے۔ اسی لئے حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ بڑے حکمراں نے جو معاہدہ اور ایگریمنٹ کیا ہو، اس کی خلاف ورزی، غداری اور عہد شکنی کرنے پر ایک دو نہیں، سینکڑوں اور ہزاروں نہیں، بلکہ لاکھوں اور کروڑوں آدمیوں کو نقصان پہنچتا ہے اور ان کے دل ٹوٹتے ہیں، اس لیے یہ اتنی بڑی غداری ہے کہ اس سے بڑی غداری اور کوئی نہیں ہوسکتی۔

ان کے خلاف میں خود مدعی بنوں گا

۱۵۸۷:-وعن أبي هريرة -رضي الله عنه- عن النبي ﷺ قال: ((قَالَ اللهُ تَعَالَى: ثَلاثَةٌ أنا خَصْمُهُمْ يَوْمَ القِيَامَةِ: رَجُلٌ أعْطَى بِي ثُمَّ غَدَرَ، وَرَجُلٌ بَاعَ حُرّاً فَأَكَلَ ثَمَنَهُ، وَرَجُلٌ اسْتَأجَرَ أجيراً، فَاسْتَوْفَى مِنْهُ، وَلَمْ يُعْطِهِ أجْرَهُ)).

(رواه البخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: (یہ حدیثِ قدسی ہے) تین آدمی ایسے ہیں جن کے خلاف میں خود مدعی بنوں گا (اللہ تعالیٰ جس کے خلاف مدعی بن جائیں گے تو پھر اس کی ہلاکت میں کیا تردد ہوسکتا ہے؟) ایک وہ آدمی جس نے میرا نام لے کر کسی کے ساتھ عہد کیا؛ پھر اس کی خلاف ورزی کی، دوسرا وہ آدمی جس نے کسی آزاد آدمی کو پکڑ کر غلام بنالیا اور اس کو غلام کہہ کر بیچ دیا اور اس کی قیمت کھا گیا۔ اور تیسرا وہ آدمی جس نے کسی کو مزدور بنایا (یعنی کسی سے اجرت کا معاملہ طے کیا کہ میرا یہ کام کردو، اتنا بوجھ اٹھا کر لے جاؤ) اور اس سے کام تو پورا وصول کیا لیکن اس کو اجرت

بالکل ہی نہیں دی، یا پوری پوری نہیں دی (آج کل یہ تیسرا کام بہت زیادہ ہوتا ہے)۔

افادات:۔ عام طور پر جب لوگ آپس میں معاہدے کرتے ہیں تو اللہ کا نام بیچ میں لایا جاتا ہے، اور اللہ کو گواہ بنایا جاتا ہے، مثلاً: یوں کہتے اور لکھتے ہیں کہ اللہ کو حاضر و ناظر سمجھ کر ہم یہ معاہدہ کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرا نام لے کر اور مجھے بیچ میں رکھ کر جب کوئی معاہدہ کیا جائے؛ پھر اس کی خلاف ورزی کی جائے اور اس معاہدہ کو توڑا جائے؛ تو میں اس کے خلاف مدعی بنوں گا جو اس کو توڑے گا۔

''وَرَجُلٌ بَاعَ حُرًّا أَفَأَكَلَ ثَمَنَهُ'' پہلے زمانہ میں یہ ہوتا تھا کہ کہیں کوئی قافلہ جا رہا ہے، اس پر چھاپہ مار کر اس کو لوٹ لیا اور اس قافلے کے شرکاء کو پکڑ لیا اور دوسری جگہ جا کر ان کو غلام بتا کر بیچ دیا، حالاں کہ یہ لوگ پیدائشی آزاد ہوتے تھے، تو کسی کو اس طرح غلام بنا کر بیچنا اور اس کی قیمت کو کھا جانا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ایسے آدمی کے خلاف میں مدعی بنوں گا۔ پہلے زمانہ میں ایسا ہوتا تھا، اب تو وہ بات نہیں رہی۔

''وَرَجُلٌ اسْتَأْجَرَ أَجِيراً، فَاسْتَوْفَى مِنْهُ، وَلَمْ يُعْطِهِ أَجْرَهُ'' کسی نے کسی مزدور سے اجرت کا معاملہ طے کیا کہ میرا فلاں کام کر دو، یا میرا یہ سامان اُٹھا کر وہاں تک لے جاؤ، اور اس سے وہ کام پورا وصول کیا اور اجرت اس کو نہیں دی، یا اجرت دی لیکن پوری نہیں دی؛ تو یہ بھی بہت خطرناک عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اس مستأجر کے خلاف مدعی بنوں گا۔ اگر کسی سے اجرت پر کام لیا جائے تو حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ مزدور کا پسینہ سوکھے اس سے پہلے اس کی اجرت دیدی جائے، اس میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔

باب النهى عن المن بالعطية ونحوها

کسی کو کوئی بخشش یا ہدیہ وغیرہ دے کر اس پر احسان جتلانے کی ممانعت

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَى. (البقرۃ:۲۶۴)

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَا أَنْفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى. (البقرۃ:۲۶۲)

ہمارے سماج کی عام وبا

کسی کو ہدیہ اور بخشش دے کر اس پر احسان جتلانا؛ یہ بھی کبیرہ گناہ ہے، اور آج کل ہمارے سماج ومعاشرہ میں یہ گناہ بھی بہت زیادہ عام ہوگیا کہ جہاں کچھ جھگڑا ہوا، بلکہ اگر اپنے سگے بھائی سے بھی ذرا سا جھگڑا ہوا تو اب وہ سب کچھ گنانے لگ جاتا ہے کہ فلاں دن میں نے تیرے ساتھ یوں کیا تھا، اور تجھے یہ دیا تھا، اور تیرے ساتھ فلاں فلاں احسان کیا تھا، اور تجھے اتنے کپڑے لا کر دیئے تھے، اور تیری بیوی کے کپڑے بھی سلوا دیئے تھے، تجھے مکان بھی بنوا دیا تھا، وغیرہ وغیرہ؛ اسی کو ''احسان جتلانا'' کہتے ہیں۔ حالاں کہ ایک مؤمن کی شان یہ ہے کہ وہ جو بھی نیکی کا کام کرتا ہے، یا کسی کے ساتھ کوئی بھلائی اور حسنِ سلوک کرتا ہے، چاہے اپنے باپ کے ساتھ ہو، بیوی کے ساتھ ہو، اپنے بھائی کے ساتھ ہو، اپنے کسی عزیز اور دوست کے ساتھ ہو، یا کسی اجنبی کے ساتھ ہو؛ جس کسی کے بھی ساتھ آدمی جب کوئی حسنِ سلوک کرتا ہے تو وہ اللہ

تعالیٰ ہی کے خاطر اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کرنے کے لئے کرتا ہے۔

میں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ ایمان لانے کے بعد مؤمن کا اصل تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے، اس کے بعد پھر ساری دنیا کے ساتھ جو بھی تعلق ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے واسطے سے ہوتا ہے۔ اگر کوئی مؤمن اپنے باپ کی اطاعت اور فرمانبرداری کرتا ہے تو وہ اس لئے کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے باپ کی فرمانبرداری کرنے کا اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک اور اس کی خدمت کا حکم دیا ہے، اسی لئے باپ اگر ایسے کام کا حکم کرتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے تو باپ ہونے کے باوجود اس کی اس بات پر عمل نہیں کیا جائے گا، اس لیے کہ شریعت نے ایک قاعدہ بتلا دیا ہے: ''لَاطَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ'' کسی مخلوق کی بات ماننے سے اگر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہو تو پھر وہاں اس مخلوق کی بات مانی نہیں جائے گی، پھر چاہے وہ استاذ ہو، باپ ہو، پیر ہو، بیوی ہو، بھائی ہو، یا اپنے سے بڑا یا چھوٹا؛ کوئی بھی ہو۔ ایک مؤمن کا تعلق کسی کے بھی ساتھ ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے ہے۔

مؤمن کا اپنی بیوی سے تعلق

اسی لیے ایک مؤمن اپنی بیوی کے حقوق بیوی کی محبت سے مجبور ہو کر ادا نہیں کرتا۔ اگر ایسا ہی ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر کسی روز کسی وجہ سے بیوی سے جھگڑا ہو گیا اور دل میں محبت باقی نہیں رہی؛ تو کیا وہ ناانصافی پر اتر آئے گا؟ معلوم ہوا کہ ایک ایمان والا اپنی بیوی کے حقوق اس لیے ادا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے حقوق مقرر کئے ہیں؛ اس لئے اس کا اصل تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوا اور بیوی سے تعلق اللہ کے واسطے ہوا ہے۔ مَیں ہمیشہ ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ آپ کے گھر میں فون ہے، اس کا اصل

کنکشن ٹیلی فون ایکسچینج کے ساتھ ہے، اور اس ٹیلی فون ایکسچینج کے واسطے سے پورے شہر اور پورے ملک میں جتنے بھی فون ہیں ان کے ساتھ رابطہ ہے۔ تو پورے ملک اور شہر کے ساتھ آپ کا رابطہ اور کنکشن براہِ راست نہیں ہوتا بلکہ ایکسچینج کے واسطے سے ہوتا ہے، یہاں تک کہ آپ کے مکان اور پڑوسی کے مکان کی دیوار ایک ہے، آپ کے گھر بھی فون ہے اور اس کے گھر بھی فون ہے، تب بھی اس کے گھر کے فون کے ساتھ آپ کے فون کا رابطہ اور تعلق ایکسچینج کے واسطے ہی سے ہے۔ اسی لئے آپ جب بھی اس سے فون پر بات کریں گے تو پہلے آپ کی بات اس ایکسچینج میں جائے گی جو آپ کے مکان سے دو چار میل دور ہے، اور وہاں سے پڑوسی کے فون پر آئے گی۔ ایسا نہیں ہے کہ دیوار پھاند کر سیدھے اُدھر چلی جائے۔ اور حقیقت یہی ہے کہ ایمان والے کا اصل تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے اور اللہ تعالیٰ کے واسطے سے دوسروں کے ساتھ ہے چاہے بیوی ہو یا اولاد ہو۔ اسی لئے جب تک کسی سے تعلق اللہ تعالیٰ کے واسطے سے رہے گا تب تک ہر جگہ اس بات کا خیال رکھا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے ٹوٹنے کی نوبت نہ آئے اور اس کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے۔ آدمی اگر بیوی سے محبت صرف دوسرے تقاضوں کی وجہ سے ہی قائم کرتا ہے تو پھر بیوی کے کہنے کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے حکموں کی خلاف ورزی بھی کر لے گا، لیکن اگر بیوی سے محبت اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے کرتا ہے تو پھر بیوی کی خاطر کبھی بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔

بہر حال! آپ جس کے ساتھ جو سلوک کریں، باپ کے ساتھ، ماں کے ساتھ بیوی کے ساتھ، اولاد کے ساتھ، بھائیوں کے ساتھ، یا کسی اجنبی کے ساتھ، پڑوسی کے ساتھ؛ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے کریں۔ اور جب اللہ تعالیٰ کے حکم سے کر رہے ہیں

تو پھر وقت آنے پر اس کو جتلانا کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ اب اگر کوئی آدمی احسان جتلا رہا ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ یہ کیا تھا اور وہ کیا تھا؛ تو یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ اس نے جو کچھ بھی کیا تھا وہ اللہ کے واسطے نہیں کیا تھا۔ اگر اللہ کے واسطے کیا ہوتا تو احسان جتلانے کی نوبت ہی نہ آتی۔ اسی لئے جو آدمی احسان جتلاتا ہے اس کا اجر و ثواب بھی ختم ہو جاتا ہے۔

احسان جتلانا کبیرہ گناہ

بہرحال! احسان جتلانا کبیرہ گناہ ہے۔ قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَى﴾ اے ایمان والو! اپنی نیکیوں کو (یعنی مال کے ذریعہ صدقات دے کر کسی کو جو بھی فائدہ پہنچاتے ہو، ان کو) احسان جتلا کر اور تکلیف دے کر ضائع مت کردو۔ کسی غریب کو زکوٰۃ دینے کے بعد اگر آپ کے دل میں اس کی تحقیر آ گئی تو اس کی شریعت کسی حال میں بھی اجازت نہیں دیتی۔ حضرت مولانا محمد عمر صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ: آپ مسجد کا احترام کیوں کرتے ہیں؟ ظاہر ہے مسجد کا احترام ہم اسی لئے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ایک فرض کو ادا کرنے کی جگہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ایک فریضہ نماز کی شکل میں یہاں آ کر ادا کرتے ہیں، حالاں کہ مسجد تو پتھر، سمینٹ اور روڑوں کی بنی ہوئی ہے۔ آپ جب پتھروں کا بھی احترام کرتے ہو اور اس کے لئے اپنی جانیں تک بھی دیدیتے ہو؛ تو پھر ایک غریب فقیر بھی تو اللہ تعالیٰ کے ایک فریضہ -یعنی زکوٰۃ- کی ادائیگی کی جگہ ہے، اگر وہ نہ ہو تو آپ اس فریضہ کو کہاں ادا کریں گے؟

ویسے بھی علماء نے لکھا ہے اور حدیثِ پاک سے بھی ثابت ہے کہ جب زکوٰۃ

کی رقم فقیر کے ہاتھ میں دی جاتی ہے تو پہلے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں جاتی ہے، پھر فقیر کے ہاتھ میں آتی ہے۔ گویا آپ کسی فقیر کونہیں دے رہے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کو دے رہے ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ اس فقیر کو دے رہے ہیں۔ قرآنِ کریم میں زکوٰۃ کے مصارف صراحۃً بیان کئے گئے ہیں کہ زکوٰۃ کن کن لوگوں کو دی جائے، اس لیے کہ زکوٰۃ ایک عبادت ہے، اور عبادت اللہ کے واسطے ہی کی جاتی ہے۔

آج کل حال یہ ہوگیا ہے کہ کسی کو زکوٰۃ دی ہو اور وہ کوئی کام بتائے اور لینے والا نہ کرے، تو دینے والا کہنے لگتا ہے کہ: ارے! میں نے تجھے اتنی زکوٰۃ دی تھی اور تو ہمارا ہی کام نہیں کرتا؟ گویا اس کو بھی جتلاتے ہیں، ہاں! اگر ہدیہ دیا ہوتا تو کوئی بات بھی تھی، لیکن زکوٰۃ تو ایک فریضہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کیا گیا ہے، اس میں بھی جتلاتے ہیں!۔ جیسے: گھر میں نوکرانی ہو اور وہ چلی جائے تو اس کو تنخواہ تو دیتے ہی تھے، اس پر مزید دباؤ ڈالنے کے لئے ایک عام رواج ہوگیا ہے کہ اس کو زکوٰۃ بھی دیتے ہیں، اور وقت آنے پر اس کو خوب سنایا بھی جاتا ہے کہ: دیکھ! ہم تجھے یہ بھی دیتے ہیں اور وہ بھی دیتے ہیں۔ اور میں پہلے بھی مسئلہ بتلا چکا ہوں کہ اس طرح کرنا درست نہیں ہے۔ کہنے کا حاصل یہ ہے کہ کسی کو کچھ دے کر پھر جتلانا اور اس کو حقیر سمجھنا اس کی شریعت بالکل اجازت نہیں دیتی۔ کوئی کسی کو حقیر سمجھ کر دے تو یہ تو بہت برا ہے:۔

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موتی اچھی	جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

بلکہ ایمان والوں کی صفت تو یہ بتلائی گئی ہے: ﴿الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللهِ ثُمَّ لاَ يُتْبِعُونَ مَا أَنفَقُوا مَنّاً وَلاَ أَذىً﴾ (البقرۃ:۲۶۲) جو لوگ اپنے مالوں کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرتے ہیں اس کے بعد پھر احسان نہیں جتلاتے اور تکلیف نہیں پہنچاتے،

سامنے والے کو حقیر نہیں سمجھتے۔

اور کمال تو یہ ہے کہ جن مبارک راتوں میں اللہ تعالیٰ کی مغفرت سب لوگوں کے لیے عام ہوتی ہے، جیسے: شبِ براءت اور شبِ قدر وغیرہ؛ ان میں بھی کچھ لوگوں کے گناہوں کو معاف نہیں کیا جاتا، ان میں ایک ﴿اَلْمَنَّان﴾ یعنی احسان کر کے جتلانے والا بھی ہے، اس کے گناہوں کو بھی معاف نہیں کیا جاتا۔

بڑے گھاٹے والے تین لوگ

۱۵۸۸:-وعن أَبِي ذَر رضی اللہ عنہ عن النَّبِيّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: ((ثَلاَثَةٌ لاَيُكَلِّمُهُمُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَلاَ يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ، وَلاَ يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ. قَالَ: فَقَرَأَهَا رَسُولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم ثَلاثَ مِرارٍ: قَالَ أَبُو ذرٍ: خَابُوا وخَسِرُوا. وامَنْ هُمْ يَارسول الله؟ قَالَ: ((الْمُسْبِلُ، وَالْمَنَّانُ، وَالْمُنْفِقُ سِلْعَتَهُ بِالْحَلِفِ الْكَاذِبِ)) (رواہ مسلم)

وفي روايةٍ لَهُ: ((الْمُسْبِلُ إِزَارَهُ)) يَعْنِي: الْمُسْبِلَ إِزَارَهُ وَثَوْبَهُ أَسْفَلَ مِنَ الْكَعْبَيْنِ لِلْخُيَلاَءِ.

ترجمہ:- حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تین آدمی ایسے ہیں جن سے قیامت کے روز اللہ تعالیٰ بات نہیں کریں گے، اور نہ ان کی طرف نظرِ رحمت سے دیکھیں گے، اور نہ ان کو گناہوں سے پاک کریں گے، اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بات تین مرتبہ ارشاد فرمائی، تو میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! ایسے لوگ تو بڑے گھاٹے، خسارے اور نقصان میں ہیں؛ وہ کون ہیں؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک تو وہ جو کپڑے کو ٹخنے سے نیچے لٹکائے۔ دوسرا وہ آدمی جو احسان کر کے جتلائے۔ اور تیسرا وہ جو اپنے سامان کو جھوٹی قسم کے ذریعہ بازار کے اندر چلائے۔

افادات:- ''اسبال'' یعنی کپڑے کو ٹخنوں تک لٹکا دینا۔ ٹخنوں کو کپڑے

سے ڈھانپنے پر کتنی سخت وعید آئی ہے! اب چاہے وہ کپڑا لنگی ہو، پائجامہ ہو، پتلون ہو، یا کرتہ ہو۔ (اس کی تفصیل کتاب اللباس میں گزر چکی ہے)

حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: آدمی کپڑے کو کیچڑ سے بچانے کے لئے اونچا اُٹھا لیتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچانے کے لئے اونچا اُٹھانے کی اس کو توفیق نہیں ہوتی، اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کی لعنت اور غضب میں رہتا ہے۔

﴿وَالْمَنَّانُ﴾ اور وہ آدمی جو احسان کر کے جتلائے۔ اس روایت کو یہاں اسی جملہ کی وجہ سے پیش کیا ہے۔

﴿وَالْمُنْفِقُ سِلْعَتَهُ بِالْحَلِفِ الْكَاذِبِ﴾ جو آدمی اپنے سامان کو جھوٹی قسم کے ذریعہ بازار کے اندر چلاتا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ قسم کھا کھا کر مال بیچتا ہو، جیسا کہ بہت سے لوگ خریدار سے کہہ دیتے ہیں کہ ابھی ایک گاہک سو روپۓ میں لینے کے لئے آیا تھا لیکن میں نے منع کر دیا، حالاں کہ کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ یہ سن کر خریدار سوچتا ہے کہ اس نے سو روپۓ میں دینے سے منع کیا ہے تو سوا سو روپۓ دے دوں۔

بہر حال! کسی بھی طرح اپنے سامان کو فروخت کرنے کے لئے جھوٹی قسم کھانا، اس پر بھی یہی وعید ہے۔

باب النهی عن الافتخار والبغی

فخر وغرور اور سرکشی کی ممانعت

قَالَ اللّٰہ تَعَالَیٰ: فَلاَ تُزَکُّوا أَنْفُسَکُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَیٰ. (النجم: ۳۲)

وقال تَعَالَیٰ: إِنَّمَا السَّبِیلُ عَلَی الَّذِینَ یَظْلِمُونَ النَّاسَ وَیَبْغُونَ فِی الأَرْضِ بِغَیْرِ الحَقِّ أُوْلَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِیمٌ. (الشوریٰ: ۴۲)

دو چیزیں الگ الگ ہیں، ایک ''افتخار'' یعنی غرور اور فخر کرنا۔ اور دوسرا ''بَغْی'' یعنی سرکشی اور حد سے تجاوز کرنا۔

فخر اپنی کسی خوبی پر ہوا کرتا ہے، چاہے وہ اختیاری ہو یا غیر اختیاری؛ مثلاً: ایک آدمی اونچے خاندان سے تعلق رکھتا ہے، تو ظاہر ہے کہ کسی کا اونچے خاندان میں پیدا ہوجانا اختیاری کمال نہیں ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اس خاندان سے جوڑ دیا اور اس میں پیدا ہوا، اس کی وجہ سے فخر وغرور کرے اور اترائے؛ تو یہ بات غلط ہے۔ حالاں کہ جس کمال کو حاصل کرنے میں اپنے اختیار کو دخل ہے، اس کو اپنے اندر لانے کے لیے آدمی نے کچھ محنت اُٹھائی، مشقت سے کام لیا اور مجاہدہ کیا؛ اس پر بھی فخر کرنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی، اللہ تعالیٰ نے اس سے بھی منع فرمایا ہے، جیسے: کوئی آدمی نیکی کی راہ پر چل رہا ہے، گناہوں سے اپنے آپ کو بچاتا ہے، تو کسی کو گناہوں سے بچنے کی جو توفیق مل رہی ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی دی ہوئی ہے، اب اگر کوئی آدمی اس پر اِترائے، اور کسی گنہگار کو دیکھ کر اس کو اپنے سے کمتر سمجھے تو شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔

خود کو اچھا سمجھنا بھی منع ہے

مَیں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ دینی اعتبار سے کوئی آدمی اگر بری حالت میں ہے یا کسی گناہ میں مبتلا ہے۔ یا دنیوی اعتبار سے خستہ حال ہے۔ یا اس کے پاس کوئی عہدہ ومنصب نہ ہونے کی وجہ سے اس کی سماج، سوسائٹی اور معاشرہ میں کوئی حیثیت نہیں؛ تو اسے حقیر سمجھنے کی اجازت نہیں ہے (یہ تو پہلے مستقل عنوان ''باب تحریم احتقار المسلمین'' کے تحت گزر چکا ہے) یہاں تو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دوسرے کو حقیر نہ سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو اچھا سمجھنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

علامہ نوویؒ نے آیت ﴿فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰ﴾ وہاں بھی ذکر کی تھی کہ اپنی صفائی مت بیان کرو، اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کون اللہ سے ڈرتا ہے اور گناہوں سے بچتا ہے۔ اور گناہوں سے بچنا بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر ممکن نہیں ہے، اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت شامل حال نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی بھی کبھی بھی پاکیزہ نہیں بن سکتا تھا، یعنی نیکی کی راہ پر نہیں چل سکتا تھا، اور اپنی دینی حالت کو درست نہیں کر سکتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے گناہوں سے بچاتا ہے اور پاکیزگی عطا فرماتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی نعمت - دنیا کی ہو، یا آخرت کی - اگر کسی کو ملی ہوئی ہے تو وہ صرف اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی توفیق ہی کا نتیجہ ہے:۔

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت	دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندِ قبا دیکھ

آدمی اپنے آپ کو بڑا اور پاک سمجھے کہ میں گناہوں سے بچتا ہوں، اس لئے میں اچھا ہوں اور اس پر فخر کرے؛ تو علامہ نوویؒ یہ باب قائم فرما کر فخر سے منع فرما رہے ہیں۔

اہلِ عرب کا مزاج

زمانۂ جاہلیت کے اندر اہلِ عرب کا خاص مزاج تھا کہ خاندان اور نسب کے اعتبار سے اپنے آپ کو اونچا سمجھتے تھے، اور نسبی اعتبار سے کسی کو اپنا ہمسر قرار نہیں دیتے تھے، اور ایک دوسرے کے مقابلہ میں فخر کرنا؛ یہ چیز ان میں اتنی عام تھی کہ جب کہیں بڑے مجمعے ہوتے، جیسے: حج کا موقعہ ہوتا تو لوگ منیٰ کے اندر جمع ہوتے تو وہاں اپنے بڑوں کی خوبیاں بیان کرنے کے آپس میں باقاعدہ مقابلے ہوتے تھے کہ کون بڑھا ہوا ہے۔ اہلِ عرب کے مزاج میں یہ بات رچی اور بسی ہوئی تھی۔

نبیٔ کریم ﷺ نے جب مکہ مکرمہ فتح کیا تو کعبۃ اللہ کے دروازہ پر کھڑے ہوکر آپ ﷺ نے ایک خطبہ دیا، اس میں ایک جملہ یہ بھی ارشاد فرمایا: اے قریش کی جماعت! اسلام آنے سے پہلے زمانۂ جاہلیت کے اندر اپنے نسب کی وجہ سے تم لوگ جو غرور، نخوت اور تکبر کرتے تھے وہ سب اللہ تعالیٰ نے ختم کر دیا، اور اپنے باپ دادوں کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا سمجھنے کی بھی شریعت اجازت نہیں دیتی، تم سب کے سب ایک ہی باپ کی یعنی حضرت آدم کی اولاد ہو اور حضرت آدم مٹی سے بنائے گئے تھے (گویا مٹی ایسی چیز نہیں ہے جس پر آدمی فخر وغرور کرے) پھر نبیٔ کریم ﷺ نے قرآنِ پاک کی آیت تلاوت فرمائی: اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد وعورت سے پیدا کیا اور تمہارے مختلف خاندان اور قبیلے بنائے (یہ خاندان اور قبیلے اس لئے نہیں بنائے گئے ہیں کہ ایک خاندان والا دوسرے خاندان پر، اور ایک قبیلے والا دوسرے قبیلے والوں پر اپنے خاندان اور قبیلے کی وجہ سے اپنی برتری اور بڑائی جتائے، فخر وغرور کرے) بلکہ یہ تو فقط آپسی پہچان کے لئے ہے (اس لیے کہ ایک آبادی کے رہنے والے ایک ہی نام

کے کئی لوگ ہوتے ہیں تو معلوم ہو جائے کہ یہ کون ہے اور کس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے، فلاں قبیلے، فلاں محلے اور فلاں خاندان سے ہے۔ باقی کسی قبیلے میں پیدا ہو جانے کی وجہ سے اس کو دوسرے پر برتری حاصل نہیں ہے)(۱)۔

اللہ تعالیٰ ہی باخبر ہے

تم میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزت والا وہی ہے جو اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچاتا ہو۔ جو جتنا زیادہ گناہوں سے اپنے آپ کو بچاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری اختیار کرتا ہے، تقویٰ اختیار کئے ہوئے ہے؛ اتنا ہی اللہ تعالیٰ کے یہاں عزت والا ہے۔ اور کس میں تقویٰ زیادہ ہے، کون اپنے آپ کو گناہوں سے بچاتا ہے؟ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی جاننے والا اور باخبر ہے۔ اسی لئے فرمایا: ''هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى'' تم میں تقویٰ والا کون ہے؛ یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔

اور تقویٰ ایک ایسی صفت ہے جس کا تعلق آدمی کے قلب سے ہے، اور کسی کے دل کی کیفیت کوئی بھی نہیں جانتا۔ باپ بھی اپنے بیٹے کے حال سے واقف نہیں ہوسکتا۔ بیٹا اپنے باپ کے حال سے واقف نہیں ہوسکتا۔ دو دوست جو چوبیس گھنٹے ایک ساتھ رہنے والے ہوں، وہ بھی ایک دوسرے کے دل کا حال معلوم نہیں کر سکتے، جب تک کہ وہ خود نہ بتلائے، ہاں! اللہ تعالیٰ اسے بخوبی جانتا ہے۔

دوسری چیز ''والبغی''، یعنی سرکشی کرنا، آدمی کا حد سے آگے نکلنا۔ آدمی جب اپنی

---

(۱) یامعشر القریش! ان اللہ قد اذہب عنکم نخوۃ الجاھلیۃ وتعظمھا بالآباء، کلکم من آدم وآدم من تراب. ثم تلا ھذہ الآیۃ: یاایھا الناس اناخلقنٰکم من ذکر وانثی وجعلنٰکم شعوبا و قبائل لتعارفوا، ان اکرمکم عنداللہ اتقٰکم ان اللہ علیم خبیر

حد سے آگے بڑھ جاتا ہے؛ اسی کو بغاوت، سرکشی اور تمرد وطغیان سے تعبیر کیا جاتا ہے؛ اس سے بھی شریعت نے منع کیا ہے ہر آدمی کو اپنی حد ہی میں رہنا چاہیے، کوئی بھی آدمی جہاں حد سے آگے بڑھے گا تو بڑی بری بات ہو جائے گی۔

جو زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں

﴿إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ گناہ تو ان لوگوں پر ہے جو دوسروں کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں، اور زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں، ایسے لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ معلوم ہوا کہ آدمی کو اپنی حد میں رہنا چاہیے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر کی ہے، اس لیے کہ کوئی آدمی جب سرکشی اور تمرد وطغیان پر آتا ہے تو لوگوں کے ساتھ زیادتی اور ظلم کرتا پھرتا ہے۔

کوئی کسی پر فخر وغرور نہ کرے

۱۵۸۹:-وعن عياضِ بن حمارٍ -رضي الله عنه- قَالَ: قَالَ رسولُ اللهِ ﷺ: ((إِنَّ اللهَ تَعَالَى أَوْحَى إِلَيَّ أَنْ تَوَاضَعُوا حَتَّى لا يَبْغِي أَحَدٌ عَلَى أَحدٍ، وَلاَ يَفْخَرُ أَحَدٌ عَلَى أَحَدٍ)). (رواه مسلم) قَالَ أهلُ اللغةِ: البغيُ: التَّعَدِّي والاستطالَةُ.

ترجمہ:- حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وحی بھیجی کہ انکساری اور تواضع اختیار کرو (یعنی آدمی اپنے آپ کو کمتر سمجھے) یہاں تک کہ کوئی کسی کے اوپر سرکشی نہ کرے، اپنی حد سے آگے نہ بڑھے، اور کوئی کسی پر فخر وغرور نہ کرے بڑائی نہ جتلائے (اپنی برتری ثابت کرنے کی کوشش نہ کرے)۔

افادات:- تواضع کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو کمتر سمجھے، صرف

کہنا کافی نہیں ہے؛ بلکہ اپنے آپ کو کمتر سمجھنا چاہیے۔

وہی سب سے زیادہ ہلاکت میں پڑا ہوا ہے

۱۵۹۰:- وعن أبي هريرة- رضي الله عنه- : أنَّ رسول الله ﷺ قَالَ : ((إِذَا قَالَ الرجُلُ: هَلَكَ النَّاسُ، فَهُوَ أَهْلَكُهُمْ)). (رواه مسلم)

والرواية المشهورة: ((أَهْلَكُهُمْ)) بِرَفعِ الكاف. وروى بنصبها: وذلكَ النهيُ لِمنْ قَالَ ذَلِكَ عُجْباً بِنَفْسِهِ، وتَصَاغُراً لِلنَّاسِ، وارْتِفاعاً عَلَيْهِمْ، فَهَذَا هُوَ الحَرامُ. وَأَمَّا مَنْ قَالَهُ لِما يَرَى فِي النَّاسِ مِنْ نَقْصٍ فِي أمرِ دِينِهم، وقَالَهُ تَحَزُّناً عَلَيْهِمْ وعَلَى الدِّينِ، فَلاَ بَأسَ بِهِ. هكَذَا فَسَّرَهُ العُلَمَاءُ وفَصَّلُوهُ. وَمِمَّنْ قَالَهُ مِنَ الأَئِمَّةِ الأَعْلامِ: مالِكُ بن أنس، وَالخَطَّابِيُّ، والحُمَيدِي، وآخرونَ. وَقَدْ أَوْضَحْتُهُ فِي كتاب: "الأذكار"

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب کوئی آدمی یوں کہتا ہے کہ لوگ ہلاک ہوگئے، تو وہی سب سے زیادہ ہلاکت میں پڑا ہوا ہے۔

افادات:- علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تشریح فرمائی ہے کہ اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہوئے اور اپنی برتری لوگوں کے سامنے جتلاتے ہوئے دوسرے لوگوں کو اپنے سے چھوٹا اور گھٹیا سمجھتے ہوئے اور لوگوں کے سامنے اپنی بڑائی کا اظہار کرتے ہوئے جو آدمی ایسا کہے تو گویا وہ یوں سمجھتا ہے کہ لوگوں میں کوئی کمال اور خوبی نہیں ہے، سارا کمال اور خوبی مجھ ہی میں ہے؛ تو وہ دوسروں کے متعلق کیا رونا رو رہا ہے، درحقیقت وہ خود ہی ہلاکت کے اندر پڑا ہوا ہے۔ اور اس کے لئے ایسا کرنا حرام ہے۔

وہ وعید میں داخل نہیں

باقی اگر دینداری کے اعتبار سے کمی آئی ہے، اور کوئی آدمی دل کے درد

اور دلسوزی سے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے ایسا بولتا ہے۔ جیسے: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دوست احباب کی مجلس میں حالات کا تذکرہ ہو رہا ہے، اور کسی کی تنقیص و تحقیر اور کسی پر تنقید نہ کرتے ہوئے، واقعی حالات کو سامنے رکھتے ہوئے معاشرہ میں دینی اعتبار سے جو کمزوری آئی ہے اس کے پیشِ نظر ایسا کہتا ہے، اور اس طرح کہنے سے کسی پر اپنی بڑائی اور برتری جتلانا، کسی کو گھٹیا بتلانا، کسی کو ذلیل سمجھنا، کسی کو حقیر سمجھنا اور کسی کی توہین مقصود و مطلوب نہیں ہے، گویا پورے انصاف اور اعتدال کے ساتھ جائزہ لینا مقصود ہے، اور عام طور سے جو دینی کمزوری پھیلی ہوئی ہے اس کے پیشِ نظر دل میں کسی کو چھوٹا سمجھتے ہوئے نہیں، بلکہ اپنے آپ کو بھی اسی معاشرہ کا حصہ سمجھتے ہوئے اگر ایسا بولے کہ معاشرہ میں ایسی ایسی خرابیاں پھیلی ہوئی ہیں جس کی وجہ سے ہمارا معاشرہ نچلی سطح پر پہنچ گیا ہے اور ہلاکت کے کنارے پر کھڑا ہے؛ تو وہ اس وعید میں داخل نہیں ہے۔

اسی کو علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ممانعت اس آدمی کے لئے ہے جو اپنے آپ پر اِتراتے ہوئے، اور لوگوں کو گھٹیا اور کم تر سمجھتے ہوئے اور لوگوں کے مقابلہ میں اپنی برتری جتلاتے ہوئے اگر ایسا کہتا ہے تو یہ منع اور حرام ہے اور ایسے جملہ کو اپنی زبان سے نکالنا فخر وغرور میں داخل ہے۔ اور اگر کوئی آدمی یہ بات لوگوں کی دینداری کے اندر کمزوری کے پیشِ نظر اور اظہارِ ہمدردی و بطورِ دلسوزی کہتا ہے کہ کہاں ہمارا یہ زمانہ، اور کہاں ہمارے بزرگوں کا زمانہ! آج سے پچاس، سو سال پہلے ہمارے اسلاف کی جو دینداری تھی، اب وہ باقی نہیں رہی، اور اپنے آپ کو بھی اس میں شامل کر رہا ہے، اپنے آپ کو اس سے الگ ثابت نہیں کرتا؛ تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

باب تحریم الهجران بین المسلمین فوق ثلاثة أیام الا لبدعة فی المهجور أو تظاهر بفسق أو نحو ذٰلك

تین دن سے زیادہ قطع تعلق حرام ہے

مسلمانوں کے درمیان آپس میں تین دن سے زیادہ قطع تعلق حرام ہے، البتہ جس کے ساتھ قطع تعلق کیا گیا ہے وہ شریعت کے خلاف کسی چیز میں مبتلا ہے، مثلاً: کسی بدعت کا مرتکب ہے، یا کھلم کھلا فسق والے کسی فعل کا اظہار کرتا ہے، جیسے: اس کی شراب نوشی بالکل عام ہے، یا اور کوئی کھلے فسق میں مبتلا ہے، یا اور کوئی خلافِ شرع ایسی بات ہے، اس کی تنبیہ کے طور پر قطع تعلق کرتا ہے؛ تو پھر اس میں تین دن کی قید نہیں ہے، بلکہ جب تک کہ وہ اپنی اس برائی سے باز نہ آئے وہاں تک اس سے قطع تعلق کرنے کی شریعت نے اجازت دی ہے۔

ویسے آپس کے معاملات کے نتیجہ میں کبھی دو بھائیوں، دو مسلمانوں، دو دوستوں، دو ملنے والوں، یا برابر کا درجہ رکھنے والوں میں ایک دوسرے کے کسی سلوک سے ناگواری ہو جاتی ہے اور دل کو ٹھیس پہنچتی ہے، تو اس کی جوابی کارروائی کے طور پر اس کے ساتھ تین دن تک تو بولنا بند کر دینے اور قطع تعلق کر لینے کی اجازت ہے، اس سے زیادہ کی نہیں۔

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ﴾ ایمان والے آپس میں بھائی بھائی ہیں، اگر ان میں ناگواری کی کوئی بات پیش آجائے تو اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ اور ان کے تعلقات کو درست کراؤ۔

﴿وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ گناہ اور نافرمانی کے کاموں میں تعاون مت کرو۔

ہم تو ڈوبے ہیں صنم

آج کل تو یہ حال ہوگیا ہے کہ کسی کو کسی کے ساتھ ناگواری پیش آئی تو اتنا ہی نہیں کہ اپنا تعلق ختم کر لیتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی مجبور کرتا ہے کہ تم بھی اس کے ساتھ مت بولو، بلکہ کوئی اگر اس کے ساتھ بولنے اور تعلقات درست کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ اگر اس کے ساتھ تعلق رکھو گے تو میرے ساتھ تعلق باقی نہیں رہے گا۔ ہمارا معاملہ تو عجیب ہوگیا ہے، ایک تو خود اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی میں مبتلا ہیں، پھر دوسروں کو بھی اسی میں مبتلا کرتے ہیں۔ ''ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لئے ڈوبیں گے'' والا معاملہ ہے۔ ماں باپ کو کسی کے ساتھ ناگواری پیش آگئی تو اب وہ بیٹے کو بھی کہتے ہیں کہ تم بھی اس کے ساتھ بات مت کرو۔ حالاں کہ اگر ماں باپ بھی کوئی ایسا حکم دیں جو شریعت کے خلاف ہو تو اس کو ماننے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

قطع تعلق (کٹّی) مت کرو

۱۵۹۱: وعن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((لَا تَقَاطَعُوا، وَلَا تَدَابَرُوا، وَلَا تَبَاغَضُوا، وَلَا تَحَاسَدُوا، وَكُونُوا عِبَادَ اللهِ إِخْوَاناً، وَلَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثٍ)). (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ: - حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: قطع تعلق (کٹّی) مت کرو اور ایک دوسرے کو پیٹھ نہ دکھلاؤ (کہ دونوں جب بھی سامنے آرہے ہیں تو وہ یوں

منھ پھیرے جا رہا ہے اور یہ اُدھر منھ پھیر رہا ہے) ایک دوسرے کے ساتھ بغض اور دشمنی نہ رکھو اور ایک دوسرے کے اوپر حسد مت کرو، اور اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن کر رہو۔ کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کو تین دن سے زیادہ کے لئے چھوڑ دے (یعنی تین دن سے زیادہ قطعِ تعلق حرام ہے)

افادات:- کتابوں میں لکھا ہے کہ یہ حکم برادرانہ اور ہم عصرانہ تعلق کے متعلق ہے۔ باقی اگر باپ اپنے بیٹے کی اصلاح اور اخلاق کو درست کرنے کے لئے، یا استاذ اپنے شاگرد کی تعزیر کے لئے تین دن سے زیادہ بھی قطع تعلق کر لے، تا کہ وہ اس کو محسوس کرتے ہوئے اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہو؛ تو اس کی اجازت ہے۔

شریعت کا کمال

۱۵۹۲:-وعن أَبي أيوبَ - رضی الله عنه- : أنَّ رسول الله ﷺ قَالَ: ((لا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلاَثِ لَيَالٍ: يَلْتَقِيَانِ، فَيُعْرِضُ هَذَا، وَيُعْرِضُ هَذَا، وخَيْرُهُما الَّذِي يَبْدَأُ بِالسَّلاَمِ)). (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ اپنے بھائی کو تین دن سے زیادہ چھوڑے رکھے (کہ دونوں میں آپس میں قطع تعلق ہو) جب آمنے سامنے ہوں تو وہ اِدھر منھ پھیر لے اور یہ اُدھر منھ پھیر لے۔ اور ان دونوں میں بہترین وہ ہے جو سلام سے شروعات کرے (یعنی تعلقات کو درست کرنے میں جو اپنی طرف سے پہل کرے وہ ان دونوں میں افضل ہے)۔

افادات:- دیکھئے! یہ بھی شریعت کا کمال ہے کہ اس نے انسانی جذبات اور مزاج کی رعایت کی۔ اگر کسی کی طرف سے ناگواری کی کوئی بات پیش آجائے تو اس

سے آدمی کو تکلیف پہنچتی ہے اور دل شکنی ہو جاتی ہے، اب اگر شریعت یوں کہتی کہ چاہے کیسی ہی ناگواری کی بات پیش آئے تب بھی ایک منٹ اور ایک دن کے لئے بھی تم کو قطع تعلق کرنے کی اجازت نہیں ہے، تو گویا یہ ایک ایسی چیز آدمی کے مزاج اور طبیعت کے اوپر تھوپی جاتی جس کو وہ برداشت نہ کرسکتا، لہٰذا شریعت نے انسان کے جذبات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور مزاج وطبیعت کی رعایت کرتے ہوئے کہا کہ اگر تمہیں ناگواری کی بات پیش آئی تو ٹھیک ہے، کٹّی کرلو اور اس سے مت بولو، لیکن یہ سلسلہ تین دن سے زیادہ نہیں چلنا چاہئے، تین دن کے اندر کٹّی والا معاملہ ختم ہو جانا چاہیے۔

کتنی بڑی محرومی

۱۵۹۳:-وعن أبي هريرة رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رسول الله -صلى الله عليه وسلم-: ((تُعْرَضُ الأَعْمَالُ فِي كُلِّ اثْنَيْنِ وَخَمِيسٍ، فَيَغْفِرُ اللهُ لِكُلِّ امْرِءٍ لا يُشْرِكُ بِاللهِ شَيْئاً، إلاَّ امْرَءاً كَانَتْ بَيْنَهُ وَبَيْنَ أخِيهِ شَحْنَاءُ، فَيقُولُ: اتْرُكُوا هذَيْنِ حَتَّى يَصْطَلِحَا)).

(رواہ مسلم)

ترجمہ:-حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہر پیر اور جمعرات کو بندوں کے اعمال اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہوتے ہیں، لہٰذا ہر وہ آدمی جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ہو (یعنی ایمان سے متصف ہو) اس کے اعمال جب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کا فیصلہ کردیتے ہیں؛ البتہ اگر کوئی آدمی ایسا ہو کہ اس کے اور اس کے مسلمان بھائی کے درمیان عداوت ودشمنی ہوتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کا معاملہ ابھی چھوڑ دو (پینڈنگ ''Pending'' رکھو) یہاں تک کہ دونوں صلح کرلیں (اور اپنے تعلقات کو ٹھیک کرلیں)۔

افادات:- دیکھئے! تعلقات بگاڑ کر اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مغفرت سے دور کرنا کتنی بڑی محرومی کی بات ہے۔

آپسی جھگڑے، شیطانی اثر

۱۵۹۴:-وعن جابر - رضی اللہ عنہ- قَالَ : سَمِعْتُ رسول الله ﷺ يقولُ: ((إِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ يَئِسَ أَنْ يَعْبُدَهُ الْمُصَلُّونَ فِي جَزِيرَةِ الْعَرَبِ، وَلَكِنْ فِي التَّحْرِيشِ بَيْنَهُمْ)). (رواہ مسلم) ((التَّحْرِيشُ)): الإِفْسَادُ وتَغْيِيرُ قُلُوبِهِمْ وتَقَاطُعُهُم.

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: شیطان اس بات سے مایوس ہو گیا کہ جزیرۃ العرب میں مسلمان اس کی پوجا کریں (یعنی جزیرۃ العرب کے جو حضرات ایمان لے آئے، وہ دوبارہ شرک میں مبتلا ہوں، یا شیطان کی کوئی ایسی بات مان لیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے کا ذریعہ بنتی ہو؛ اس طرف سے تو وہ مایوس ہو گیا) لیکن ان کے آپس میں ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانے کی طرف سے وہ مایوس نہیں ہوا ہے۔

افادات:- یعنی اسے امید ہے کہ اگر میں کوشش کروں گا تو آپس کے جھگڑے ضرور کرادوں گا۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ شیطان کی محنت انسان کے خلاف یہی ہوتی ہے اور وہ پوری کوشش اسی بات کی کرتا ہے کہ آدمی کو ایمان سے ہٹا کر کفر و شرک میں مبتلا کر دے، لیکن جیسے آدمی ہوتے ہیں اس کی محنت کا اثر بھی ویسا ہی ہوتا ہے۔ اگر آپ نے پتھر اٹھا کر مارا تو جس چیز کے اوپر مارا ہے اگر وہ مضبوط ہے تو وہ چیز تو نہیں ٹوٹے گی، تھوڑا سا اثر ضرور ہوگا، ایسا نہیں ہوگا کہ پتھر مارا ہے تو سامنے کچھ بھی نہ ہو، اس کے اندر تھوڑا سا کریک (Crack) ہو جائے گا، اور اگر

وہ چیز کمزور ہوگی تو ٹوٹ ہی جائے گی۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضراتِ صحابہ پر جو محنت کی تھی ان کے متعلق اوراپنے بعد آنے والوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ شیطان اس سے تو مایوس ہوگیا ہےاوراس کواس بات کی تو امید نہیں رہی کہ وہ ان کوشرک میں مبتلا کردے ،ہاں !وہ محنت کر کے آپس کے جھگڑے ضرور کروائے گا۔اس سے یہ معلوم ہوا کہ آپس کے جھگڑے جو ہوتے ہیں وہ بھی شیطان ہی کا اثر ہوتا ہے،اوراسی کی محنت کا نتیجہ ہوتا ہے۔اوروہ مسلمانوں میں جھگڑے اسی لئے تو کرواتا ہے کہ اس کے نتیجے میں قطع تعلق ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا ذریعہ ہے۔پھر وہ ایک دوسرے کو تکلیف پہنچانے میں لگ جائیں گے، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا ذریعہ ہے۔پھر ایک دوسرے کی برائیوں میں،غیبت اور تہمت میں مبتلا ہوں گے،جھوٹے الزامات لگائے جائیں گے۔اس ایک عداوت کے نتیجے میں معلوم نہیں کیا کیا نتائج ظاہر ہوں گے۔

وہ جہنم میں جائے گا

۱۵۹۵:-وعن أَبي هريرة-رضى الله عنه-قَالَ قَالَ رسول الله ﷺ: ((لاَ يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلاَثٍ، فَمَنْ هَجَرَ فَوْقَ ثَلاَثٍ فَمَاتَ، دَخَلَ النَّارَ)) (رواه أبو داود بإسناد عَلَى شرط البخاری ومسلم)

ترجمہ:-حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ اپنے مسلمان بھائی کو تین دن سے زیادہ کے لئے چھوڑ دے،جس نے تین دن سے زیادہ کے لئے تعلق ختم کرلیا اوراس کی موت آگئی تو وہ جہنم میں جائے گا۔

افادات:- دیکھو! کتنی سخت وعید ہے! بعض لوگ دلوں کے اندر عجیب کینہ رکھے ہوئے ہوتے ہیں کہ ساری دنیا ان کو سمجھا کر تعلقات استوار کرنے کی کوشش

کرتی ہے تب بھی وہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے؛ ایسے لوگوں کے لئے اس روایت میں بڑی سخت وعید ہے۔

۱۵۹۶:-وعن أَبِي خِراشٍ حَدْرَدِ بنِ أَبِي حَدْرَدٍ الأسلميّ. ويقالُ: السُّلميّ الصحابي-رضي الله عنه-: أنَّه سمع النبيَّ ﷺ يقولُ: ((مَنْ هَجَرَ أخاهُ سَنَةً فَهُوَ كَسَفْكِ دَمِهِ)) (رواه أبو داود بإسناد صحيح)

ترجمہ:- حضرت حَدْرَدْ بن ابی حَدْرَدْ اسلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جس نے اپنے بھائی کے ساتھ ایک سال تک تعلق قطع کرلیا، گویا اس نے اس کا قتل کیا۔

افادات:- یعنی قتل کرنے کا گناہ جتنا ہوتا ہے، ایک سال تک قطع تعلق کا گناہ بھی اتنا ہی بڑا ہوتا ہے۔

وہ قطع تعلق کے گناہ سے محفوظ ہوجائے گا

۱۵۹۷:-وعن أَبِي هريرة-رضي الله عنه-: أنّ رسول الله-ﷺ- قَالَ: ((لاَ يَحِلُّ لِمُؤْمِنٍ أنْ يَهْجُرَ مُؤْمِناً فَوقَ ثَلاَثٍ، فإنْ مَرَّتْ بِهِ ثَلاَثٌ، فَلْيَلْقَهُ فَلْيُسَلِّمْ عَلَيْهِ، فَإنْ رَدَّ عَلَيْهِ السَّلامَ فَقَدِ اشْتَرَكَا في الأجْرِ، وَإنْ لَمْ يَرُدَّ عَلَيْهِ فَقَدْ بَاءَ بِالإثْمِ، وَخَرَجَ المُسَلِّمُ مِنَ الهِجْرَةِ)). (رواه أبو داود بإسناد حسن.)

قَالَ أَبُو داود: ((إِذَا كَانَتْ الهِجْرَةُ لِلّٰهِ تَعَالَى فَلَيسَ مِنْ هَذَا في شَيءٍ))

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں ہے کہ اپنے مؤمن بھائی کو تین دن سے زیادہ کے لیے چھوڑ دے۔ اگر تین دن گزر گئے تو اس کو چاہیے کہ اس سے ملے اور اس کو سلام کرے۔ اگر سامنے والے نے بھی

اس کے سلام کا جواب دیدیا تو تعلقات کو استوار کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو اجر و ثواب ملے گا اس میں دونوں شریک ہوں گے۔ اور اگر (اِس نے تو سلام کیا، لیکن) سامنے والے نے کوئی جواب اور ''Response'' نہیں دیا؛ تو سارے گناہ کی ذمہ داری سامنے والے پر ہے۔ اور جس نے سلام کیا وہ قطع تعلق کے گناہ سے محفوظ ہو جائے گا۔

افادات: ۔ اس کا مطلب صرف سلام نہیں ہے، اس لیے کہ اصل تو کلام ہے لیکن کلام کی ابتداء عام طور پر سلام ہی سے ہوتی ہے، اس لئے اگر صرف سلام کیا اور ضروری بات نہیں کی، یا صرف سلام کرتا ہے اس کی بات کا جواب نہیں دیتا؛ تو وہ وعید سے نہیں نکلے گا۔ علماء نے یہی تشریح کی ہے۔

النهي عن تناجي اثنين دون الثالث بغير إذنه إِلاَّ لحاجةٍ

وَهُوَ أن يتحدثا سراً بحيث لا يسمعهما وفي معناه مَا إِذَا تحدثا بلسان لا يفهمه

قَالَ اللهُ تَعَالَى: إِنَّمَا النَّجْوَى مِنَ الشَّيْطَانِ. (المجادلة:۱۰)

ایک کو چھوڑ کر سرگوشی کی ممانعت

کسی بھی مؤمن کو تکلیف اور ایذا پہنچنے سے بچانے کے لئے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف ہدایات دی ہیں ان کو مختلف عنوانات کے ماتحت بیان کر رہے تھے۔ انہی میں سے ایک عنوان قائم کیا کہ: دو آدمیوں کا تیسرے ایک آدمی کو چھوڑ کر آپس میں کانا پھوسی اور سرگوشی کرنا، یعنی تین میں سے دو آدمی کان میں منھ ڈال کر چپکے چپکے اس طرح بات چیت کریں جس کو تیسرا نہ سن سکے؛ تو یہ چیز اس تیسرے آدمی کو غم میں ڈالنے والی ہے، اس صورت میں تیسرا آدمی سوچنے لگتا ہے کہ ان کو شاید میرے اوپر اعتماد نہیں ہے یا ایسا طرز اختیار کرنا جو اس تیسرے کو خوف و ہراس میں مبتلا کرنے والا ہو، خاص طور پر جب کہ تنہائی کا سفر ہو، جنگل بیابان ہو اور تین میں سے دو آدمی ایک کو الگ کر کے سرگوشی کرنے لگیں تو اس تیسرے کو یہ شبہ اور اندیشہ ہو سکتا ہے کہ کہیں میرے متعلق تو کوئی اسکیم تیار نہیں کر رہے ہیں؟ اس لئے بعض علماء کرام نے اس ممانعت کو جنگل بیابان

کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔ لیکن جمہور علماء کہتے ہیں کہ یہ حکم ہر حال میں ہے۔ ہاں! اگر چار آدمی ہوں اور ان میں سے دو سرگوشی کریں، اس صورت میں دو الگ رہیں گے تو پھر ممانعت کا حکم باقی نہیں رہے گا۔ اسی بات کو اس عنوان میں کہا گیا ہے کہ دو آدمیوں کو بغیر اجازت کے اس تیسرے کو الگ رکھ کر سرگوشی کرنے کی ممانعت ہے۔ ہاں! اگر اس سے اجازت لے لیں کہ ہم کو ایک خاص بات کرنی ہے، اگر آپ برا نہ مانیں تو ہم آپ کو ہٹا کر کچھ بات چیت کر لیں اور اس تیسرے کو اس پر کوئی اشکال نہ ہو؛ تو پھر دونوں بات کر سکتے ہیں۔

ٹک ٹک دیدم، دَم نہ کشیدم

دوسری شکل یہ ہے کہ دو آدمی زور سے تو بات چیت کر رہے ہیں لیکن ایسی زبان میں کر رہے ہیں جس کو تیسرا نہیں سمجھتا؛ تو یہ بھی اسی حکم میں ہے۔ عام طور پر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی آدمی دوسرے کسی صوبہ کا ہو جو کوئی اور زبان جاننے والا ہوتا ہے، تو دو آدمی گجراتی میں بات چیت شروع کر دیتے ہیں، اب وہ ''ٹک ٹک دیدم، دَم نہ کشیدم'' کا مصداق بن جاتا ہے، وہ بے چارہ دونوں کو دیکھتا رہتا ہے کہ پتہ نہیں یہ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ تو جس طرح کسی تیسرے کو اکیلا چھوڑ کر دو آدمیوں کا آپس میں سرگوشی کرنا ممنوع ہے، اسی طرح تیسرے کو اکیلا چھوڑ کر دو آدمیوں کا کسی ایسی زبان اور لینگویج (Language) میں بات کرنا جس کو وہ تیسرا نہ سمجھتا ہو؛ یہ بھی جائز نہیں ہے۔

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد پر عمل کے اہتمام کا نمونہ

۱۵۹۸:- وعن ابن عمر رضی اللہ عنهما أنَّ رسولَ اللهِ ﷺ قَالَ : إِذَا

كَانُوا ثَلاثَةً، فَلاَ يَتَنَاجى اثْنَانِ دُونَ الثَّالِثِ (متفق عَلَيْهِ)

ورواه أبو داود وزاد: قَالَ أَبُو صالح: قُلْتُ لابنِ عُمَرَ: فَأَرْبَعَةً؟ قَالَ: لايَضُرُّكَ.

ورواه مالك في "الموطأ" عن عبد الله بن دينارٍ، قَالَ: كُنْتُ أنَا وابْنُ عُمَرَ عِنْدَ دَارِ خَالِدِ بنُ عُقْبَةَ الَّتى فى السُّوقِ، فَجَاءَ رَجُلٌ يُرِيدُ أنْ يُنَاجِيَهُ، وَلَيْسَ مَعَ ابْنِ عُمَرَ أَحَدٌ غَيْرِى، فَدَعَا ابْنُ عُمَرَ رَجُلاً آخَرَ حَتَّى كُنَّا أَرْبَعَةً، فَقَالَ لِي وَلِلرَّجُلِ الثَّالِثِ الَّذِى دَعَا: اسْتَأْخِرَا شَيْئاً، فَإنِّي سَمِعْتُ رسولَ الله ﷺ يقُولُ: ((لا يَتَنَاجى اثْنَانِ دُونَ وَاحِدٍ)).

ترجمہ: - حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب کہیں تین آدمی ہوں تو دو آدمی تیسرے کو الگ رکھ کر سرگوشی نہ کریں (یعنی دو آدمیوں کو اگر کوئی بات کرنی ہو تو جب تیسرا وہاں موجود نہ ہو اس وقت کریں، اس کی موجودگی میں یہ نہ کریں)۔

اس کی سند میں ایک راوی ابوصالح ہیں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر سے پوچھا: اگر چار ہوں (اور دو آدمی سرگوشی کریں تو کر سکتے ہیں؟) حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا: اس صورت میں کوئی حرج کی بات نہیں۔

حضرت عبداللہ بن دینارؒ فرماتے ہیں کہ: میں اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ خالد بن عقبہ کے مکان کے پاس تھے جو بازار میں تھا، ایک آدمی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس آیا جو ان سے سرگوشی اور خلوت میں کوئی بات کرنا چاہتا تھا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس اس وقت میرے علاوہ کوئی تیسرا آدمی موجود نہیں تھا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے چوتھے آدمی کو بلایا، اب ہم کل چار آدمی ہو گئے، پھر مجھے اور جس کو بلایا تھا دونوں سے کہا: (یہ مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے) تم دونوں ذرا پیچھے ہٹ جاؤ (اس کے بعد فرمایا: میں نے ایسا اس لیے کیا کہ) نبیٔ کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: ایک کو اکیلا چھوڑ کر دو آدمی سرگوشی کے انداز میں بات نہ کریں۔

افادات: ۔دیکھو! حضراتِ صحابہ کرامؓ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات پر عمل کا کتنا زیادہ اہتمام کرتے تھے! ہم تو یہ پڑھتے پڑھاتے رہتے ہیں پھر بھی وقت پر ایسی چیزیں یاد نہیں رہتی، اور عمل کا اہتمام نہیں ہوتا۔ان حضرات کو ان چیزوں سے اپنے آپ کو بچانے کا اہتمام تھا جن سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ممانعت فرمائی ہے۔

کسی ایک کو اکیلا نہ چھوڑا جائے

۱۵۹۹: ۔وعن ابن مسعود-رضی اللہ عنہ-:أَنَّ رسول اللہ ﷺ قَالَ: ((إِذَا كُنْتُمْ ثَلاَثَةً، فَلاَ يَتَنَاجَى اثْنَانِ دُونَ الآخَرِ حَتَّى تَخْتَلِطُوا بِالنَّاسِ، مِنْ أَجْلِ أَنَّ ذَلِكَ يُحْزِنُهُ)). (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ: ۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تم تین ہو تو دو آدمی تیسرے کو اکیلا چھوڑ کر گفتگو نہ کریں یہاں تک کہ لوگوں کے ساتھ رل مل جائیں (یعنی دوسرے لوگ بھی آجائیں اور تعداد بڑھ جائے) اس لیے کہ یہ طرز اس کو غم میں ڈالنے والا ہے۔

افادات: ۔اور یہ بھی یاد رہے کہ اگر چار آدمی ہوں اور تین آدمی بات کریں اور ایک کو الگ کر دیں؛ تو یہ بھی جائز نہیں۔مطلب یہ ہے کہ کسی ایک کو اکیلا چھوڑ دیا اور باقی تین یا چار الگ بات کرنے لگ جائیں۔یہ اس ایک کو غم میں ڈالنے والی بات ہے، اس لئے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔

النهي عن تعذيب العبد والدابة والمرأة والولد بغير سبب شرعي

غلام، جانور، عورت اور اولاد کو بغیر سبب شرعی کے سزا دینے کی ممانعت

قَالَ اللهُ تَعَالَىٰ: وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ إِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالاً فَخُوراً. (النساء:۳۶)

خلاصۂ باب

اس باب میں یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ شریعت نے جہاں ماتحتوں کو سزا دینے، اور ان کی تعزیر و تادیب کی اجازت دی ہے اور اصلاح کی غرض سے مناسب سزا دینے کو درست قرار دیا ہے، وہیں ان کو بلا وجہ اور بلا سبب شرعی سزا دینے سے منع کیا ہے۔ یا جہاں سببِ شرعی موجود ہو وہاں بھی جتنی مقدار میں سزا دینے کی اجازت دی ہے اس سے زیادہ سزا دینے کو حرام قرار دیا ہے۔ جیسے: بچے کو اس کا باپ تعلیم و تربیت، ادب و اخلاق سکھانے کی غرض سے سزا دے سکتا ہے اور مار بھی سکتا ہے، مثلاً: نماز نہ پڑھنے پر مارنے کا حکم حدیثِ پاک میں موجود ہے کہ بچہ جب دس سال کا ہو جائے اور نماز نہ پڑھے تو

اس کو مارنا چاہئے۔ یا مثلاً: باپ بچہ کو تعلیم دینا چاہتا ہے اور وہ تعلیم کی طرف توجہ نہیں دیتا اور بھاگ جاتا ہے، تو اس صورت میں اس کو مارنے کی اجازت ہے۔ یا اگر استاذ اپنے شاگرد کو تعلیم وتربیت کی غرض سے اور اخلاق سکھانے کے لئے سزا دینا چاہے؛ تو شرعاً اس کی اجازت ہے، لیکن فقہاء نے اس کے لیے حدود بھی مقرر کئے ہیں۔

حدودِ تعزیر وتادیب

ان میں پہلی بات یہ ہے کہ لکڑی کے ذریعہ نہ مارے، ہاتھ سے چپت مار سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ چہرے اور سر پر نہ مارے، بلکہ گردن یا پیٹھ پر مار سکتا ہے۔ اور تیسرے یہ کہ تین سے زیادہ نہ مارے۔ اب بہت سے لوگ کہیں گے کہ اس سے تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ لیکن فقہاء نے صراحۃً لکھا ہے کہ اگر استاذ بچے کو تین سے زیادہ مارے گا تو کل کو قیامت میں اللہ تعالیٰ اس کو بدلہ دلوائیں گے اور اس سے قصاص لیا جائے گا۔ ایک وقت میں اس سے زیادہ کی اجازت نہیں ہے، ہاں! دوسرے دن یا دوسرے موقعہ پر دوسری مناسبت سے پھر تین چپت مارنے کی اجازت ہے۔

بیوی کے لیے بھی یہی حکم ہے

یہی حکم عورتوں کے متعلق بھی ہے۔ ان کو بھی ان کے کسی ایسے قصور پر جن کی تفصیل فقہاء نے لکھی ہے انہیں شرطوں کے ساتھ مار سکتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ سالن میں نمک کم ہوگیا تو پٹائی کر دی۔ کپڑے نہیں دھلے ہیں تو پٹائی کر دی۔ گھر میں جھاڑو نہیں دی گئی ہے تو پٹائی کر دی۔ گاہک پر ناراض ہو کر دکان سے آئے اور اس کا غصہ گھر آکر بیوی پر اتار رہے ہیں؛ ان سب باتوں کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

مواقعِ تعزیر

اب وہ کون سے مواقع ہیں جہاں پر عورت کی پٹائی کی اجازت ہے؟ اس کو بھی فقہاءِ کرام نے کتابوں میں لکھا ہے، جیسے:-

(۱) شوہر اپنے واسطے زینت کرنے کا حکم دیتا ہے لیکن بیوی شریعت کے حدود میں رہ کر شوہر کے لئے جو زینت کرنی چاہئے وہ نہیں کرتی؛ تو اس صورت میں پہلے تنبیہ کرے، اور تنبیہ کرنے کے بعد بھی نہ مانے تو اس کی پٹائی کرنے کی اجازت دی ہے۔

(۲) بیوی غسلِ جنابت نہیں کرتی، ناپاک ہی رہتی ہے؛ تو اس پر بھی پٹائی کرنے کی اجازت دی ہے۔

(۳) شوہر کی اجازت کے بغیر بلا عذر شرعی گھر سے باہر نکلتی ہے؛ تو پٹائی کی اجازت دی ہے۔

(۴) بچے کو رونے پر مارتی ہے؛ تو شوہر پٹائی کرسکتا ہے۔

(۵) کسی نامحرم کے سامنے چہرہ کھولتی ہے اور بے پردگی کرتی ہے۔

(۶) یا شوہر کے ساتھ اتنی زور سے بات کرتی ہے کہ نامحرموں تک آواز جاتی ہے؛ تو اس پر بھی سزا دی جاسکتی ہے۔ لیکن ان سب صورتوں میں مارنے کی حد اور شرط وہی ہے جو اوپر گزری کہ چہرے اور سر پر نہ مارے، لکڑی سے نہ مارے، اور تین سے زیادہ نہ مارے۔ لیکن آج کل ان حدود کی کوئی بھی رعایت نہیں کرتا۔

عورتوں کو مارنے کے سلسلہ میں نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اجازت طلب کی گئی تھی وہ روایت مسلم شریف کے اندر موجود ہے جس کے راوی حضرت جابرؓ ہیں جس میں پٹائی کی اجازت دی گئی ہے، لیکن اس میں ایک جملہ ہے: ''وَاضْرِبُوْهُنَّ ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ''

ان کی سخت پٹائی نہ کرو۔ اور جس پٹائی کے نتیجے میں جسم پر نشان پڑ جائیں، وہ شریعت کی نگاہ میں ''ضربِ مبرّح'' یعنی ''سخت پٹائی'' کہلاتی ہے۔ شریعت نے ایسی پٹائی کی اجازت دی کہ جس کے نتیجہ میں جسم پر نشان نہ پڑیں۔

ترتیبِ قرآنی اور حضور کا عمل

لیکن اس کو بھی نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا۔ قرآنِ کریم میں ہے:

﴿وَاللَّاتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ﴾

اگر تم کو عورتوں کی طرف سے اندیشہ ہو کہ وہ تمہاری نافرمانی کریں گی تو پہلے نمبر پر تو ان کو نصیحت کرو اور سمجھاؤ، ان کی فہمائش سے کام لو، اولِ وہلہ میں ان کو سزا دینے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ بار بار سمجھانے اور فہمائش کرنے کے بعد بھی وہ نافرمانی سے باز نہیں آتی تو نمبر دو پر تدبیر بتلائی کہ اس کا بستر الگ کردو۔ ان سے اپنا بستر الگ کرنا یہ ایک ایسی تدبیر ہے جو بڑی مؤثر اور کارگر ہے۔ ان کی پٹائی سے بھی وہ اثر نہیں ہوگا جو بستر الگ کرنے سے ہوتا ہے، لیکن اس میں خود بھی بہت کچھ بھگتنا پڑتا ہے اس لئے لوگ اس کو اختیار ہی نہیں کرتے۔ پھر تیسرے نمبر پر مارنے کی اجازت دی گئی ہے۔

اور دیکھئے! قرآنِ پاک میں جو بھی احکام دیئے گئے ہیں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے عمل سے امت کو ان کا نمونہ پیش فرمایا۔ عورتوں کے سلسلہ میں قرآنِ پاک کی اس آیت میں جو حکم دیا گیا اس میں پہلے ''فَعِظُوْهُنَّ'' ہے، پھر ''وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ'' ہے کہ پہلے نمبر پر تو ان کو نصیحت کرو، دوسرے نمبر پر ان سے اپنا بستر الگ کردو۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ازواجِ مطہرات کے سلسلہ میں ان دونوں پر عمل کر کے بتلایا لیکن آپ نے کبھی ازواجِ مطہرات کی پٹائی نہیں کی۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی کسی

غلام، باندی، کسی عورت یا بچے کی پٹائی نہیں کی۔ اور حدیثِ پاک میں آتا ہے حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو لوگ اپنی عورتوں کی پٹائی کرتے ہیں وہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔

ایک مرتبہ صحابۂ کرامؓ نے نبیٔ کریم ﷺ سے عورتوں کی نافرمانی کی شکایت کی کہ آپ نے ان کے سلسلہ میں نہ مارنے کی جو تاکید فرمائی اس کی وجہ سے وہ سر چڑھ گئی ہیں، لہٰذا ان کی پٹائی کی اجازت دی جائے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے اجازت دیدی۔ دوسرے روز بہت ساری عورتیں شکایتیں لے کر ازواجِ مطہرات کے گھروں پر جمع ہوگئیں، اس لیے کہ عورتوں کا دستور یہی تھا کہ ان کو اگر نبیٔ کریم ﷺ سے کوئی بات عرض کرنی ہوتی تو ازواجِ مطہرات کے واسطے سے اپنی شکایتیں اور ضرورتیں حضور کی خدمت میں پیش کرتی تھیں۔ دوسرے روز ازواجِ مطہرات کے گھروں پر جب لائن لگ گئی تو حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "أَحسَنُكُمْ أَحسَنُكُمْ لِأَهْلِهِ، وَأَنَا أَحسَنُكُمْ لِأَهْلِي" تم میں سب سے اچھے لوگ وہ ہیں جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آتے ہوں، اور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آتا ہوں۔

دنیا ہی میں بھگتنا پڑتا ہے

بہر حال! ہمارے معاشرے اور سماج میں عورتوں کے معاملہ میں بہت زیادتیاں ہوتی ہیں۔ بعضوں کا تو مزاج ہی بن گیا ہے کہ بلا وجہ اور شریعت نے جن حدود کو مقرر کیا ہے ان کی رعایت کئے بغیر ان پر زیادتیاں کرتے ہیں، ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ ان سب باتوں کا اللہ تعالیٰ کے یہاں جواب دینا ہوگا اور اس کا بدلہ دلوایا جائے گا؛ بلکہ دنیا ہی میں اس کو بھگتنا پڑتا ہے۔

ہمارے یہاں ڈابھیل میں شیخ الحدیث حضرت مولانا ایوب صاحب اعظمیؒ

تھے۔شروع میں لڑکوں کی تربیت کی وجہ سے نظامت کی ذمہ داری جب میرے حوالے تھی، تو کبھی کسی وجہ سے کسی کی پٹائی بھی ہو جاتی تھی۔ایک مرتبہ کوئی معاملہ حضرت کے پاس پہنچ گیا تو حضرت نے مجھے بلا کر سمجھایا کہ: ''مولوی صاحب! بچوں کی پٹائی مت کیا کرو؛ ورنہ اس کو بھگتنا پڑے گا''۔

حالاں کہ پٹائی کرنے والے ہمارے اساتذہ اور بزرگوں کی نیتوں پر ہم کوئی شک وشبہ نہیں کرتے، وہ بے چارے بچے کی خیر خواہی میں اور اخلاص کے ساتھ ہی ان کی پٹائی کرتے ہیں۔اور اگر کوئی آدمی انتقامی جذبہ سے پٹائی کردے تو وہ تو بڑا خطرناک معاملہ ہے، اس کی تو شریعت کسی حال میں بھی اجازت نہیں دیتی، لیکن اگر واقعۃً بچے کی خیر خواہی کی نیت سے پٹائی کی جائے تب بھی مَیں اساتذۂ کرام سے کہا کرتا ہوں کہ: اللہ تعالیٰ دنیا میں ہی بیماریوں کی شکل میں اس کو بھگتواتے ہیں۔ہم نے اساتذہ اور تربیت کرنے والوں میں ایسے حضرات کو اکثر دیکھا کہ جن کا مزاج پٹائی والا تھا کہ وہ اخیر عمر میں زیادہ تر بیماریوں کا شکار رہے۔گویا اللہ تعالیٰ دنیا سے اُٹھانے سے پہلے ہی اس کا کفارہ کروا دیتے ہیں۔اس لیے اس سے اپنے آپ کو بچانے کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔

عنوان اور آیتِ قرآنی

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باب کا عنوان یہی قائم کیا ہے کہ عورت اور بچے کا مسئلہ تو دور کی بات رہی، غلام اور چوپایوں تک کو بلا وجہ مارنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی، ہاں! جہاں ضرورت ہو وہاں مارنے کی اجازت دی ہے، لیکن اس کے لئے بھی حد مقرر کی گئی ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے قرآنِ پاک کی آیت لائے ہیں۔ یہ آیت پہلے بھی گزر چکی ہے:﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً وَبِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ إِنَّ اللهَ لاَ يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالاً فَخُوراً﴾ (النساء:۳۶) والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو اور رشتہ داروں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرو، اور یتیموں، غرباء اور جو قریب کے پڑوسی اور دور کے پڑوسی ہیں اور جو تمہارے پاس بیٹھنے والا ساتھی ہے؛ ان سب کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ، اور مسافر کے ساتھ، اور جن کے تمہارے ہاتھ مالک ہیں (یعنی غلام) ان کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرو۔ اور جو آدمی تکبر کرنے والا، فخر وغرور کرنے والا ہو؛ اس کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے۔ (ایسے ہی لوگ عام طور پر حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں اور حدود کی رعایت نہیں کرتے)۔

دراصل اس آیت کو یہاں ''وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ'' کی وجہ سے لائے ہیں۔ اور چوں کہ عنوان میں غلام کا بھی تذکرہ کیا تھا اور چوپائے کے بھی تم مالک ہو تو ان کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرو، اور چوپایوں کو سزا دینے سے جو منع کیا ہے اس سلسلہ میں آگے روایت پیش کی ہے۔

جہنم میں داخلہ کا سبب

۱۶۰۰:-وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما: أَنَّ رسول الله ﷺ قَالَ: ((عُذِّبَتِ امْرَأَةٌ فِي هِرَّةٍ سَجَنَتْهَا حَتَّى مَاتَتْ، فَدَخَلَتْ فِيهَا النَّارَ، لاَ هِيَ أَطْعَمَتْهَا وَسَقَتْهَا، إِذْ حَبَسَتْهَا، وَلاَ هِيَ تَرَكَتْهَا تَأْكُلُ مِنْ خَشَاشِ الأَرْضِ)). (متفق عَلَيْهِ)

((خَشَاشُ الأَرضِ)) بفتح الخاءِ المعجمة وبالشينِ المعجمة المكررة، وهي: هَوَامُّهَا وَحَشَرَاتُهَا.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک عورت کو ایک بلی کی وجہ سے عذاب دیا گیا کہ اس کو باندھے رکھا یہاں تک کہ وہ مرگئی؛ پس اس کو جہنم میں داخل کیا گیا۔ اس عورت نے اس بلی کو کھانا پینا بھی نہیں دیا اور نہ اس کو چھوڑا کہ وہ ازخود حشرات الارض اور کیڑے مکوڑوں کو کھا کر اپنی روزی حاصل کرلے۔

افادات:- دیکھو! اس عورت نے ایک جانور کے ساتھ زیادتی کی تو اس کی وجہ سے اس کو جہنم میں جانا پڑا۔ جب ایک بلی کے ساتھ زیادتی کرنے پر یہ سزا دی جاسکتی ہے؛ تو پھر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اپنے گھر میں، اپنی بیوی بچوں اور اپنے متعلقین کے ساتھ زیادتی کرنا کتنی خطرناک چیز ہے!

علمی فیض سے محروم ہونے کا سبب

حضرت تھانویؒ کے حالات میں ایک قصہ لکھا ہے۔ حضرت خود فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رشتہ داری میں کہیں شادی تھی، گھر والوں کو وہاں صبح جلدی پہنچنا تھا اور گھر میں مرغیاں پالی ہوئی تھیں، گھر والوں نے مجھ سے کہہ دیا کہ: صبح فجر کے بعد مرغیاں کھول دینا۔ عام طور پر گھر والے مردوں کو ایسا کام سونپ کر جایا کرتے ہیں، عورتیں اپنے شوہروں کو ایسی چیز کہہ دیا کرتی ہیں۔ اب عادت نہ ہونے کی وجہ سے فجر کے بعد حضرت کو یاد ہی نہیں رہا کہ مرغیوں کو ڈربے سے باہر نکالنا ہے۔ پھر جب حضرت اپنے وقت پر اپنی تصنیف وتالیف کا کام کرنے کے لئے بیٹھے تو کوئی مضمون ہی نہیں آرہا ہے، بہت سوچا اور لکھنے کی بہت کوشش کی لیکن کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ آخر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ: اے اللہ! میرے جس قصور وکوتاہی کی وجہ سے میں آج اس علمی فیض سے محروم ہوں، وہ مجھے سمجھا دیا جائے تاکہ میں اس سے توبہ کروں۔ اللہ تعالیٰ نے دل میں

بات ڈالی کہ مرغیاں ڈربے میں بند پڑی ہیں، چناں چہ فوراً جا کر مرغیوں کو کھولا، اور پھر آ کر جب بیٹھے تو فیضان شروع ہوگیا۔ یہ بہت اہم چیز ہے جس کی طرف سے آج کل بڑی غفلت برتی جاتی ہے۔

کسی جاندار کو تکلیف پہنچانے پر لعنت

۱۶۰۱:-وَعَنْهُ: أَنَّهُ مَرَّ بِفِتْيَانٍ مِنْ قُرَيْشٍ قَدْ نَصَبُوا طَيراً وَهُمْ يَرْمُونَهُ، وَقَدْ جَعَلُوا لِصَاحِبِ الطَّيْرِ كُلَّ خَاطِئَةٍ مِنْ نَبْلِهِمْ، فَلَمَّا رَأَوْا ابْنَ عُمَرَ رَ تَفَرَّقُوا، فَقَالَ ابْنُ عُمَرَ رَ: مَنْ فَعَلَ هَذَا؟ لَعَنَ اللهُ مَنْ فَعَلَ هَذَا، إِنَّ رَسولَ اللهِ ﷺ لَعَنَ مَنِ اتَّخَذَ شَيْئاً فِيهِ الرُّوحُ غَرَضاً. (متفق عَلَيْهِ)

((الغَرَضُ)) بفتحِ الغَين المعجمة والراءِ وَهُوَ الهَدَفُ وَالشَّيءُ الَّذِي يُرْمَى إِلَيْهِ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ وہ قریش کے چند جوانوں کے پاس سے گزرے جنہوں نے ایک پرندے کو باندھ رکھا تھا اور اس پر تیراندازی کی مشق کر رہے تھے، اور پرندے کے مالک سے یہ طے کر رکھا تھا کہ ہمارا جو بھی تیر نشانے سے خطا کر جائے وہ تمہارا ہوگا۔ جب ان نوجوانوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو دیکھا تو بھاگ گئے۔ (حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے دیکھا کہ ایک پرندہ وہاں بندھا ہوا ہے اور تیر بھی پڑے ہوئے ہیں تو سمجھ گئے کہ تیراندازی کی مشق کی جارہی تھی) پوچھا: یہ حرکت کس نے کی ہے؟ جو بھی ایسی حرکت کرے اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔ اور نبی کریم ﷺ نے کسی جاندار چیز کو نشانہ بنانے والے پر لعنت فرمائی ہے۔

افادات:- دراصل اپنا نشانہ ٹھیک کرنے کے لئے کوئی غیر ذی روح چیز ہونی چاہیے تھی، جیسے: لکڑی کا تختہ رکھ دیا جاتا، لیکن ان نوجوانوں نے ایک زندہ پرندہ کو

باندھ رکھا تھا اور اس پر اپنے تیروں کے نشانے کی مشق کر رہے تھے اور پرندہ کا مالک بھی اس پر راضی ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ پرندہ زیادہ قیمتی نہ ہو اور اس کے مقابلہ میں اس کے مالک نے ان تیروں کو ترجیح دی ہو۔ اور شریر لڑکوں کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی ایسی ویسی حرکت کر رہے ہوتے ہیں اور کوئی بڑا وہاں سے گزرتا ہے تو سب بھاگ جاتے ہیں۔

اس روایت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کسی جاندار کو تکلیف پہنچانے پر اللہ تعالیٰ اور نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے۔

نشانہ بنانے کے لیے جانوروں کو باندھنے سے منع کیا ہے

۱۶۰۲:-وعن أنس-رضی الله عنه-قَالَ: نهى رسُولُ الله ﷺ أن تُصْبَرَ البَهَائِمُ.(متفق عَلَيْهِ) ومعناه: تُحْبَسُ لِلقَتْلِ.

ترجمہ:-حضرت انس رضی اللہ عنہ نقل فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نشانہ بنانے کے واسطے جانوروں کو باندھنے سے منع فرمایا۔

افادات:-مطلب یہ ہے کہ کسی زندہ جانور کو باندھ کر اس پر نشانہ بازی کی جائے اس سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا۔ اور ایسی حالت میں تیر کے ذریعہ اگر وہ مر بھی گیا تو حلال نہیں ہوگا، اس لئے کہ جو جانور اپنے قابو میں ہو اس کے حلال ہونے کے لئے ذبحِ اختیاری-یعنی باقاعدہ اس کی گردن پر چھری پھیرنا-ضروری ہے، صرف تیر چلانا کافی نہیں ہے۔

انتقامی جذبہ سے ماتحتوں کو سزا دینا

۱۶۰۳:-وعن أَبي عليٍّ سويدِ بن مُقَرِّنٍ- رضی الله عنه- قَالَ: لَقَدْ

رَأَيْتُنِي سَابِعَ سَبْعَةٍ مِنْ بَنِي مُقَرِّنٍ مَا لَنَا خَادِمٌ إِلاَّ وَاحِدَةٌ لَطَمَهَا أَصْغَرُنَا فَأَمَرَنَا رسولُ الله -ﷺ- أَنْ نُعْتِقَهَا. (رواہ مسلم) وفی روایةٍ: ((سَابِعَ إِخْوَةٍ لِي)).

ترجمہ:- حضرت ابوعلی سوید بن مُقَرِّن ؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے آپ کو (مُقَرِّن کے گھرانے میں) اپنے سات بھائیوں میں ساتواں پایا (ان کے والد کا نام مُقَرِّن تھا اور مُقَرِّن کی اولاد میں یہ کل سات بھائی تھے، یہ ان میں ساتویں تھے) ہم سب کی خدمت کے واسطے ایک باندی تھی۔ ایک مرتبہ ہمارے ان بھائیوں میں سے سب سے چھوٹے بھائی نے اس باندی کو طمانچہ مار دیا تو حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: (اللہ تعالیٰ کے یہاں اس طمانچے کی سزا سے اگر اپنے آپ کو بچانا ہو اور اس کا کفارہ دینا ہو؛ تو) اس کو آزاد کردو۔

افادات:- غلام اور باندی کو صرف ایک طمانچہ مارنے پر حضور اکرم ﷺ نے ان کو آزاد کردینے کا حکم دیا، حالاں کہ آقا ان کا مالک ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اپنا انتقامی جذبہ فرو کرنے کے لئے بچوں کو سزا دینے اور مارنے کا کیا حکم ہوگا!۔

جہنم کی آگ تم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی

۱۶۰۴:- وعن أَبي مسعودٍ البدريِّ - رضی اللہ عنہ - قَالَ: كُنْتُ أَضْرِبُ غُلاَماً لِي بالسَّوْطِ، فَسَمِعْتُ صَوْتاً مِنْ خَلْفِي: ((اعْلَمْ أَبَا مَسْعُودٍ)) فَلَمْ أَفْهَمِ الصَّوْتَ مِنَ الغَضَبِ، فَلَمَّا دَنَا مِنِّي إِذَا هُوَ رسولُ الله ﷺ فإذا هُوَ يَقُولُ: ((اعْلَمْ أَبَا مَسْعُودٍ أَنَّ اللهَ أَقْدَرُ عَلَيْكَ مِنْكَ عَلَى هَذَا الغُلاَمِ)). فَقُلْتُ: لا أَضْرِبُ مَمْلُوكاً بَعْدَهُ أَبَداً.

وَفِي روايةٍ: فَسَقَطَ السَّوْطُ مِنْ يَدِي مِنْ هَيْبَتِهِ.

وفی روایۃٍ: فَقُلتُ: یَارسولَ اللہ، ھُوَ حُرٌّ لِوَجہِ اللہِ تَعَالٰی، فَقَالَ: ((أَمَا لَوْلَمْ تَفْعَلْ، لَلَفَحَتْكَ النَّارُ، أَوْلَمَسَّتْكَ النَّارُ)). (رواہ مسلم بھذہ الروایات)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابومسعود بدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اپنے ایک غلام کو کوڑے کے ذریعہ مار رہا تھا، میں نے اپنے پیچھے سے ایک آواز سنی، اے ابومسعود! دھیان دو، چوں کہ میں بہت غصے میں تھا (اور غلام کو مار رہا تھا) اس وجہ سے پیچھے سے آنے والی آواز کو میں سمجھ نہیں سکا (کہ مجھے ہی خطاب کیا جارہا ہے) جب وہ آواز دینے والی شخصیت مجھ سے قریب ہوئی تو اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ وہ تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے ابومسعود! جان لو کہ تم کو اپنے اس غلام پر جتنی قدرت ہے؛ اللہ تعالیٰ تم پر اس بھی سے زیادہ قادر ہے، (یعنی تم اپنے اس غلام کو سزا دینے کی طاقت رکھتے ہو اسی لئے تو اس کو سزا دے رہے ہو، لیکن جاننا چاہیے کہ تم کو اپنے اس غلام کو سزا دینے کی جتنی طاقت ہے، اللہ تعالیٰ کو تم پر اس سے بھی زیادہ طاقت حاصل ہے؛ لہٰذا اگر تم اس غلام کے ساتھ زیادتی کروگے تو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے اپنے آپ کو نہ بچا سکتے) حضرت ابومسعودؓ فرماتے ہیں کہ یہ ارشاد سن کر میں نے کہا: آئندہ کبھی بھی کسی غلام کی پٹائی نہیں کروں گا۔

ایک روایت میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں، حضرت ابومسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہیبت سے کوڑا بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

اور ایک روایت میں ہے، حضرت ابومسعود بدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ مبارک سے میں نے یہ بات سنی تو فوراً عرض کیا: یہ غلام اللہ کے واسطے آزاد ہے۔ جب انہوں نے اپنے اس جرم کی تلافی اور کفارہ کے لئے اس غلام کو آزاد کردیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر تم ایسا نہ کرتے (یعنی غلام کو آزاد نہ کرتے) تو جہنم کی آگ تم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔

بے کئے کی سزا دینے کا کفارہ

۱۶۰۵:-وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما أنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: ((مَنْ ضَرَبَ غُلاَمًا لَهُ حَدًّا لَمْ يَأْتِهِ، أَوْ لَطَمَهُ، فَإِنَّ كَفَّارَتَهُ أَنْ يُعْتِقَهُ)). (رواہ مسلم)

ترجمہ:-حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس آدمی نے اپنے غلام کو کسی ایسے جرم کی سزا دی جو اس نے نہیں کیا ہے۔ یا اپنے غلام کو طمانچہ مارا؛ تو اس کا کفارہ اور تلافی یہی ہے کہ وہ اس کو آزاد کردے۔

افادات:-مثلاً: اس نے شراب نہیں پی، پھر بھی یوں کہہ کر کہ تو شرابی ہے، اس پر شراب والی سزا جاری کردی۔ یا شریعت کی طرف سے مقرر کی ہوئی اور کوئی سزا جو کسی جرم پر دی جاتی ہو، اور وہ جرم اس نے نہیں کیا تھا پھر بھی اس کو وہ سزا دی۔ یا اپنے غلام کو طمانچہ مارا؛ تو اس کا کفارہ اور تلافی یہ ہے کہ اس کو آزاد کردے۔ اگر وہ آزاد نہیں کرے گا تو وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس جرم کی سزا سے بچا نہیں سکے گا۔ جب غلام کے معاملہ میں اتنی سخت تاکید ہے تو اولاد اور بیوی کا معاملہ تو اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کو قیامت کے روز عذاب دیں گے

۱۶۰۶:-وعن هِشَامِ بن حكيمِ بن حِزَامٍ رضی اللہ عنہما: أَنَّهُ مَرَّ بِالشَّامِ عَلَى أُنَاسٍ مِنَ الأَنْبَاطِ، وَقَدْ أُقِيمُوا فِي الشَّمْسِ، وَصُبَّ عَلَى رُؤُوسِهِمُ الزَّيْتُ! فَقَالَ: مَا هَذَا؟ قِيلَ: يُعَذَّبُونَ فِي الخَرَاجِ- وفی روایۃ: حُبِسُوا فِي الجِزْيَةِ - فَقَالَ هِشَامٌ: أشهدُ لَسَمِعْتُ رسولَ اللهِ ﷺ يقولُ: إِنَّ اللهَ يُعَذِّبُ

الَّذِينَ يُعَذِّبُونَ النَّاس فی الدُّنيَا. فَدَخَلَ عَلَى الأَمِيرِ، فَحَدَّثَهُ، فَأَمَرَ بِهِمْ فَخُلُّوا.

((الأنباط)) الفلاحون مِنَ العَجَمِ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ہشام بن حکیم بن حزامؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ملکِ شام میں کچھ کسانوں کے پاس سے میرا گزر ہوا جن کو دھوپ میں کھڑا کیا گیا تھا اور ان کے سر کے اوپر گرم تیل ڈالا گیا تھا۔ میں نے پوچھا: یہ کیا ہو رہا ہے؟ بتایا گیا کہ: ان غلاموں پر خراج مقرر کیا گیا ہے جو ادا نہ کرنے کی وجہ سے ان کو یہ سزا دی جا رہی ہے۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ ان کے اوپر حکومت کی طرف سے جزیہ مقرر تھا وہ انہوں نے ادا نہیں کیا ہے اس وجہ سے ان کو قید کیا گیا ہے۔ یہ سن کر حضرت ہشام بن حکیم بن حزامؓ نے کہا: میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو قیامت کے روز عذاب دیں گے جو دنیا میں لوگوں کو اس طرح کی سزا دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ حاکم اور امیر کے پاس تشریف لے گئے (چوں کہ جزیہ اور خراج نہ دینے پر ان کو یہ سزا حاکمِ وقت کے حکم سے دی جا رہی تھی) اور اس کے سامنے یہ حدیث بیان کی، چناں چہ اس نے فوراً حکم دیا کہ ان لوگوں کو چھوڑ دیا جائے۔

جانوروں کو داغ دینے اور مارنے میں بھی رعایت

۱۶۰۷:- وعن ابن عباس رضی الله عنهما، قَالَ: رأى رسولُ الله ﷺ حِمَاراً مَوْسُومَ الوَجْهِ، فَأَنْكَرَ ذَلِكَ؟ فَقَالَ: ((والله لا أَسِمُهُ إلاَّ أقْصَى شَيْءٍ مِنَ الوَجْهِ)) وأمَرَ بِحِمَارِهِ فَكُوِيَ فی جَاعِرَتَيْهِ، فَهُوَ أوَّلُ مَنْ كَوَى الجَاعِرَتَيْنِ.

((الجَاعِرَتَانِ)): نَاحِيَةُ الوَرِكَيْنِ حَوْلَ الدُّبُرِ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک گدھے کو دیکھا جس کے چہرے پر داغ تھا، تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پر نکیر فرمائی (مسلم شریف

کی دوسری روایت میں بھی یہی قصہ موجود ہے، اس میں ہے کہ) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جب نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد سنا تو فرمایا: اللہ کی قسم! آئندہ میں چہرے پر داغ نہیں دوں گا بلکہ چہرے کے آخری حصے میں دوں گا۔ پھر انہوں نے سرین کے اوپر والے حصے پر داغ دینے کا حکم دیا، چناں چہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے جانور کی سرین پر داغ دیا۔

افادات:- ضرورت کے پیشِ نظر نشان کے لئے جانوروں کو داغ لگایا جاتا ہے، چناں چہ چہرے کو چھوڑ کر جسم کے دوسرے کسی بھی حصے پر داغ دینے کی اجازت ہے۔ اور اس وقت تک عربوں میں چہرے پر ہی داغ دینے کا رواج تھا، اس کو ختم کر کے سرین پر داغ دینے کا سلسلہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے جاری کیا۔

۱۶۰۸:-وعنه: أَنَّ النبيَّ ﷺ مَرَّ عَلَيْهِ حِمَارٌ قَدْ وُسِمَ فِي وَجْهِهِ، فَقَالَ: ((لَعَنَ اللهُ الَّذِي وَسَمَهُ)). (رواه مسلم)

وفي رواية لمسلم أيضاً: نهى رسول الله ﷺ عَنِ الضَّرْبِ فِي الوَجْهِ، وَعَنِ الوَسْمِ فِي الوَجْهِ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گذر ایک گدھے پر سے ہوا جس کے چہرے پر داغ لگایا ہوا تھا، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے اس کے چہرے پر داغ لگایا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔

اور مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے کہ نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چہرے پر مارنے سے منع فرمایا، چاہے وہ جانور ہو یا انسان ہو۔ اور جانور کے چہرے پر داغ دینے سے بھی منع کیا۔

افادات:- پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ بچے یا بیوی وغیرہ کو بطورِ تعزیر کچھ سزا دینی بھی ہو تو اس کے لئے شریعت نے قانون اور حدود مقرر کئے ہیں، انہیں میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ کسی کے بھی چہرے پر نہ مارا جائے۔

باب تحریم التعذیب بالنار في كل حیوان حَتَّى النملة ونحوها

کسی بھی جاندار کو چاہے وہ چیونٹی ہو یا کوئی اور جانور، آگ کے ذریعہ عذاب دینے کی حرمت

۱۶۰۹:- عن أَبی هريرةَ - رضی الله عنه - قَالَ: بعثنا رسولُ الله ﷺ فی بَعْثٍ، فَقَالَ: ((إنْ وَجَدْتُمْ فُلاناً وَفُلاناً)) لِرَجُلَيْنِ مِنْ قُرَيْشٍ سَمَّاهُمَا ((فَأَحْرِقُوهُمَا بالنَّارِ)) ثُمَّ قَالَ رسولُ الله ﷺ حِيْنَ أَرَدْنَا الخُرُوجَ: ((إنِّي كُنْتُ أَمَرْتُكُمْ أنْ تُحَرِّقُوا فُلاناً وفُلاناً وإنَّ النَّارَ لايُعَذِّبُ بِهَا إلاَّ الله، فإنْ وَجَدْتُمُوهُمَا فاقْتُلُوهُمَا)) (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ ؓ نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم کو ایک لشکر کے ساتھ بھیجا اور قریش کے دو آدمیوں کا نام لے کر فرمایا کہ: اگر ان کو پاؤ تو ان کو جلا دینا، پھر جب ہم روانہ ہونے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: میں نے تم لوگوں کو فلاں دو آدمیوں کو جلانے کا حکم دیا تھا، بے شک آگ کا عذاب اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے، اس لیے اگر تم ان کو پاؤ تو قتل کر دینا۔

افادات:- واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ ابوالعاص بن الربیع حضرت خدیجہؓ کے بھانجے تھے، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ام المؤمنین کی درخواست پر اپنی صاحبزادی

حضرت زینبؓ کا عقد ابوالعاص کے ساتھ کر دیا تھا،، بعد ازاں جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے نبوت سے سرفراز فرمایا تو قریش نے آپ پر دباؤ ڈالنے کے لیے آپ کی صاحبزادیوں کو طلاق دیدی۔ ابوالعاص نے قریش کے شدید اصرار پر حضرت زینبؓ سے کنارہ کشی اختیار کرلی، اور سعید بن العاص کی بیٹی سے نکاح کرلیا۔

ابوالعاص جنگ بدر میں گرفتار ہوئے تو حضرت زینبؓ جو ابھی مکہ مکرمہ میں تھیں انہوں نے بطور فدیہ قیدی کی رہائی کے لیے اپنے زیورات بھجوادیئے، انہی میں ایک ہار بھی تھا جو ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ نے اپنی صاحبزادی کو ابوالعاص سے نکاح کے موقع پر دیا تھا، یہ دیکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دل بھر آیا، چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ سے فرمایا: اگر تم چاہو تو اپنے قیدی کو چھوڑ دو اور رہا کردو، اور یہ مال بھی واپس کردو (یہ درخواست تھی، حکم نہیں تھا) صحابہؓ نے عرض کیا: بسروچشم! ہم تو آپ کے غلام ہیں۔ چناں چہ ابوالعاص کو رہا کر دیا گیا اور مال بھی واپس کر دیا گیا- ابوالعاص کو گرفتار کرنے والے اور بلا فدیہ رہا کرنے والے صحابی کا نام حضرت خراش بن الصمّہؓ ہے۔ اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ وہ حضرت عبداللہ بن جبیرؓ تھے- نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ابوالعاص نے یہ یقین دہانی کرائی کہ وہ حضرت زینبؓ کو مدینہ منورہ بھجوادیں گے۔ چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زینب کو بحفاظت لانے کے لیے حضرت زید بن حارثہؓ اور ایک انصاری صحابی کو مکہ کی طرف روانہ فرمایا تھا۔ ابوالعاص نے مکہ پہنچ کر اپنے بھائی کنانہ بن الربیع کے ذریعہ حضرت زینب کو مدینہ پہنچانے کا بندوبست کیا، قریش کو خبر ہوگئی تو انہوں نے پیچھا کیا اور وادیٔ ذی طویٰ میں حضرت زینب کی اونٹنی کو جالیا۔ ہبار بن الاسود اور نافع بن عبد قیس نے ہودج میں بیٹھی حضرت زینب کو خوفزدہ کیا، ہبار نے اپنے نیزے سے ہودج کو ڈھکیلا تو حضرت زینب ایک چٹان پر گر پڑی،

جس سے ان کا حمل ساقط ہوگیا۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو جب اس دردناک واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپ نے ایک لشکر بھیجا جس کا ذکر اس روایت میں آیا ہے۔ اس لشکر کے امیر حضرت حمزہ بن عمرو اسلمیؓ تھے، ہبار بن الاسود اور نافع بن عبد قیس دونوں بچ نکلے، ہبار بن الاسود بعد میں مسلمان ہوگئے تھے، جب وہ مسلمان ہوکر مدینہ منورہ آئے تو بعض صحابہ ان پر طنز کیا کرتے تھے لیکن نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کو اس برتاؤ سے منع فرمادیا۔ حضرت ہبارؓ امیر معاویہؓ کی خلافت کے زمانہ تک زندہ رہے۔

"وإنَّ النَّارَ لا يُعَذِّبُ بِهَا إلاَّ الله" یہ خبر بمعنی النہی کے قبیل سے ہے، یعنی "آگ سے صرف اللہ تعالیٰ ہی عذاب دیتے ہیں" یہ فرما کر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم آگ کے ذریعہ سزا دینے کی ممانعت بتلانا چاہتے ہیں۔ دوسری روایت میں "لَا يَنْبَغِي" کے الفاظ کی تصریح ہے، چناں چہ ابن اسحٰق کی روایت میں ہے: "ثم رأيت انه لا ينبغي أن يعذب بالنار الا الله" اسی طرح سنن ابی داؤد میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی مرفوع روایت میں ہے: "انه لا ينبغي أن يعذب بالنار الا رب النار" یعنی آگ کے ذریعہ عذاب دینا آگ کے پروردگار کے علاوہ کسی کے لیے سزاوار نہیں۔

اس روایت سے علماء نے جو مسائل مستنبط کئے ہیں اس میں یہ بھی ہے کہ پسّو اور دیگر حشرات الارض کو آگ میں جلانا مکروہ ہے، چناں چہ مسند بزار کی روایت میں عثمان بن حبان کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت ام الدرداءؓ کے پاس تھا، ایک پسّو کو پکڑ کر میں نے آگ میں ڈال دیا، اس پر وہ فرمانے لگی کہ میں نے حضرت ابوالدرداءؓ سے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: "لا يعذب بالنار الا رب النار" ابن اَبی شیبہ نے بھی اپنی مصنف میں یہ روایت ذکر کی ہے۔

۱۶۱۰:-وعن ابن مسعودٍ-رضی اللہ عنہ-قَالَ: کُنَّا مَعَ رسول اللہ ﷺ فی سَفَرٍ، فانْطَلَقَ لحَاجَتِهِ، فَرَأَيْنَا حُمَّرَةً مَعَهَا فَرْخَانِ، فَأَخَذْنَا فَرْخَيْهَا، فَجَاءتِ الحُمَّرَةُ فَجَعَلَتْ تَعْرِشُ. فَجَاءَ النَّبِيُّ ﷺ فَقَالَ: ((مَنْ فَجَعَ هذِهِ بِوَلَدِهَا؟، رُدُّوا وَلَدَهَا إِلَيْهَا)) ورأى قَرْيَةَ نَمْلٍ قَدْ حَرَّقْنَاهَا، فَقَالَ: ((مَنْ حَرَّقَ هذِهِ؟)) قُلْنَا: نَحْنُ قَالَ: ((إِنَّهُ لا يَنْبَغِي أَنْ يُعَذِّبَ بِالنَّارِ إِلاَّ رَبُّ النَّارِ)).

(رواه أبو داود بإسناد صحيح)

قَوْله: ((قَرْيَةُ نَمْلٍ)) مَعْنَاهُ: مَوضعُ النَّمْلِ مَعَ النَّمْلِ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ ایک سفر میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے، آپ اپنی کسی حاجت کے لیے تشریف لے گئے، ہم نے ایک چڑیا کو دیکھا اس کے ساتھ اس کے دو بچے تھے، ہم نے اس کے دونوں بچوں کو پکڑ لیا، وہ چڑیا آ کر ہمارے سر پر چکر کاٹنے لگی، اتنے میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے آئے، آپ نے پوچھا: کس نے اس چڑیا کے بچوں کو پکڑ کر اس کو تکلیف پہنچائی؟ اس کے بچے اسے واپس کرو۔ آپ نے چونٹیوں کی رہائش گاہ (بِل) کو دیکھا جس کو ہم نے جلا دیا تھا، آپ نے پوچھا: اس کو کس نے جلایا؟ ہم نے عرض کیا: ہم نے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آگ کا عذاب دینا آگ کے رب (اللہ تعالیٰ) کے علاوہ اور کسی کے لیے مناسب نہیں۔

افادات:- مچھر کو ختم کرنے کے لیے بجلی کا کوآلہ استعمال کیا جاتا ہے جس میں تار ہوتے ہیں اور بجلی کی رَو اس میں دوڑتی رہتی ہے، مچھر جب اس سے ٹکراتا ہے تو جل کر ختم ہو جاتا ہے، اس کا استعمال درست نہیں۔ (شامی مع الدر ۵/ ۵۳۰)

باب تحریم مطل الغنی بحق طلبه صاحبه

کسی آدمی کا مالی حق دوسرے پر ہو تو قدرت کے باوجود ٹال مٹول کرنے کی ممانعت

إِنَّ اللهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا (النساء:۵۸)

فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضاً فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ.(البقرة:۲۸۳)

کسی کا کوئی مالی حق دوسرے پر واجب ہو، اور جس پر واجب ہے وہ اس کی ادائیگی کی طاقت اور قدرت بھی رکھتا ہو، اس کے باوجود ادا نہ کرے اور ٹال مٹول کرتا رہے، تو یہ اس کی طرف سے ایک طرح کا ظلم و زیادتی ہے جس کی وجہ سے وہ گنہگار ہوگا اسی کو اس باب میں بتلا رہے ہیں۔

''مطل'' کا ترجمہ ''تاخیر'' کا بھی کیا گیا ہے، اور ٹال مٹول کا بھی کیا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں قرآنِ پاک کی آیت پیش کی ہے: ﴿إِنَّ اللهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا﴾ بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ تم کو حکم دیتے ہیں کہ امانتیں ان کے حقداروں تک پہنچاؤ (یہ آیت چوتھی جلد میں امانت کے بیان میں گزر چکی ہے، وہاں اس پر تفصیل سے کلام ہے۔ مرتب)

کسی کا مالی حق بھی آپ کے پاس امانت ہی ہے، لہٰذا آپ کی ذمہ داری ہے کہ اس کے مالک تک وہ پہنچائیں اور اس میں تاخیر نہ کریں۔ اور سامنے والے کے مطالبے کے باوجود ادا نہ کرنا، یا ٹال مٹول کرنا اور تاخیر کرنا حرام ہے۔

﴿فَإِنۡ أَمِنَ بَعۡضُكُم بَعۡضاً فَلۡيُؤَدِّ الَّذِي اؤۡتُمِنَ أَمَانَتَهُ﴾ اگر تم میں سے کوئی کسی کے پاس امانت رکھے تو جس کے پاس امانت رکھی گئی وہ امانت رکھنے والے کو امانت ادا کردے۔

تمام ادائیگیاں امانت ہیں

حقوق کی ادائیگی کے سلسلہ میں ایک بات تو یہ ہے کہ کسی کا کسی کے اوپر کوئی مالی حق واجب ہو، مثلاً: بیوی کا نفقہ شوہر کے اوپر، یا ماں باپ کا نفقہ اولاد کے اوپر، یا چھوٹی اولاد کا نفقہ باپ کے اوپر واجب ہوتا ہے، یا کسی نے کسی کے ساتھ اجارہ اور کرایہ داری کا معاملہ کیا، یا کسی مزدور سے کوئی مزدوری کروائی تو کام لینے والے پر اس کی اجرت واجب ہوئی؛ یہ تمام ادائیگیاں امانت ہیں، ان میں ذرا بھی تاخیر اور ٹال مٹول ہوگی تو وہ گناہ شمار ہوگا۔

قرض اور دَین میں فرق

اور قرض کی دو شکلیں ہیں: ایک تو دَین ہوتا ہے۔ یعنی کسی پر کسی کا مالی مطالبہ ہو، جیسے: کسی نے کسی کے ساتھ کوئی سودا کیا، مثلاً: میں نے آپ سے کپڑا خریدا اور طے کیا کہ اس کی قیمت دو مہینے کے بعد ادا کروں گا، آپ نے منظور کیا کہ ٹھیک ہے، دو مہینے کے بعد پیسے ادا کرنا، تو اس صورت میں آپ دو مہینے سے پہلے ان پیسوں کا مطالبہ نہیں کر سکتے، جب تک دو مہینے کی مدت پوری نہ ہو وہاں تک ادائیگی مجھ پر واجب نہیں ہوتی، اس کو فقہاء کے یہاں ''دَین'' کہا جاتا ہے۔ اس حدیث کو سامنے رکھ کر یوں نہیں کہہ سکتے کہ تمہارے پاس پیسے موجود ہیں اور میرے پیسے تم پر نکلتے ہیں تو لاؤ، اور اگر تاخیر

کروگےتو گنہگار قرار دیئے جاؤ گے۔

اور دوسرا قرض ہوتا ہے، یعنی کسی کو نقد رقم قرض کے طور پر دی گئی، اس میں اگر طے بھی کیا گیا کہ ایک سال کے بعد لوٹانا، تو اخلاق اور وعدہ کی پابندی کا تقاضا تو یہی ہے کہ سامنے والا ایک سال سے پہلے اس سے مطالبہ نہ کرے، لیکن اگر آج دینے کے بعد دوسرے دن ہی وہ مطالبہ کرنا چاہےتو مسئلے کی رو سے اس کو ایسا کرنے کا حق ہے اور وہ اپنا دیا ہوا روپیہ واپس لے سکتا ہے۔ دونوں میں یہ فرق ہے۔

یہ ظلم ہے

۱۶۱۱:–وعن أَبي هريرة رضى الله عنه: أَنَّ رسول الله ﷺ قَالَ:((مَطْلُ الغَنِيِّ ظُلْمٌ، وَإِذَا أُتْبِعَ أَحَدُكُمْ عَلَى مَلِيءٍ فَلْيَتْبَع)) (متفق عَلَيْهِ)

معنى ((أُتبع)): أُحِيل.

ترجمہ:–حضرت ابوہریرہ ؓ فرماتے ہیں کہ نبئ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی مالی حق ادا کرنے کی طاقت رکھتا ہو، اور اس پر ادائیگی لازم ہوچکی ہو، اس کے باوجود ادائیگی میں تاخیر اور ٹال مٹول کرے؛ تو یہ ظلم ہے۔ اور جب تم میں سے کسی کو کسی حیثیت والے کا حوالہ دیا جائےتو چاہیے کہ اس کو قبول کرلے۔

افادات:–آج کل ہمارے سماج اور معاشرہ میں لوگوں کا مزاج بنا ہوا ہے کہ قرض لیتے ہیں اور قرض خواہ بے چارہ اس مدت کے بعد– جو آپس میں طے کر رکھی تھی –مطالبہ کرتا ہے اور اس کے پاس پیسے موجود ہوتے ہیں، دوسری چیزوں میں خرچ کرتا رہتا ہے، لیکن قرض خواہ کے مانگنے پر منہ بگاڑتے ہیں۔ حالاں کہ جب تک سامنے والے کا حق ادا نہ کرے اس کے لئے دوسرے مصارف میں خرچ کرنا جائز بھی

نہیں۔ بلکہ ہمارے اکابر تو ایسے آدمی کی دعوت قبول کرنے میں بھی احتیاط کرتے تھے۔

مقروض کی دعوت

ارواحِ ثلاثہ میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ حضرت نواب قطب الدین صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جو مشکوٰۃ شریف کی شرح ''مظاہرِ حق'' کے مصنف، اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سے ہیں، انہوں نے ایک مرتبہ مفتی مظفر حسین صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت کی۔ (حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے تھے اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے انتقال کے بعد ان کے جانشین مقرر کئے گئے تھے) تو مفتی مظفر حسین صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ نواب صاحبؒ نے آ کر شاہ محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے شکایت کی کہ میں نے آپ کو دعوت دی تو آپ نے قبول فرمالی، لیکن مفتی صاحب دعوت قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں؛ کیا ان کو میری کمائی میں کوئی شک وشبہ ہے؟ شاہ محمد اسحاق صاحبؒ نے مفتی صاحبؒ کو بلایا اور پوچھا: کیا تم کو تقویٰ کا ہیضہ ہو گیا ہے؟ تم ان کی دعوت کیوں قبول نہیں کرتے؟ کیا ان کی کمائی میں کوئی شک وشبہ ہے؟ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: حاشا وکلاّ! ان کی کمائی حلال ہے، لیکن حضرت! ایک بات ہے کہ اگر چہ مولویوں کی صحبت میں آنے کی وجہ سے بگڑے ہوئے نواب صاحب ہیں، اور نوابی والی پوری شان تو باقی نہیں رہی لیکن پھر بھی ہیں تو نواب ہی، اس کے کچھ نہ کچھ اثرات تو ہوں گے ہی۔ اور نواب صاحب مقروض ہیں، جب ہماری دعوت کریں گے تو کچھ تکلفات سے بھی کام لیں گے، لہٰذا جو پیسے اس دعوت میں خرچ کر رہے ہیں اتنا پیسہ اگر وہ اپنے قرض کی ادائیگی میں لگا دیں؛ تو یہ ان کی

ذمہ داری ہے۔ جب شاہ محمد اسحاق صاحبؒ نے مفتی صاحب کی یہ بات سنی تو فرمانے لگے: نواب صاحب! اب تو ہم بھی آپ کی دعوت میں نہیں آئیں گے۔

بہر حال! یہ بڑی اہم چیز ہے اور آج کل ہمارے معاشرہ اور سوسائٹی میں دوسروں کے مالی حقوق کی ادائیگی کی طاقت ہونے کے باوجود ٹال مٹول کرنا اور سامنے والے کو تکلیف اور پریشانی میں ڈالنا عام بات ہوتی جارہی ہے، اس سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔

ایک مسئلہ

''وَإِذَا أُتْبِعَ أَحَدُكُمْ عَلَى مَلِيءٍ فَلْيَتْبَع'' اور جب تم میں سے کسی کو کسی حیثیت والے کا حوالہ دیا جائے تو چاہیے کہ اس کو قبول کرلے۔ ہمارے معاشرہ میں ایک لفظ ''حوالہ'' بولا جاتا ہے وہ یہاں مراد نہیں ہے، بلکہ شریعت میں ''حوالہ'' کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی اپنے دَین کی ادائیگی دوسرے کے سپرد کردے، اور دوسرا اس کو منظور بھی کرلے۔ تو جو آدمی اپنا قرض دوسرے کے ذمہ ڈال رہا ہے وہ ''محیل'' کہلاتا ہے، اور جس کے ذمہ ڈالا جارہا ہے وہ ''محتال علیہ'' کہلاتا ہے۔

یہاں ایک مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ مثلاً: زید کے ذمہ آپ کے پانچ ہزار روپے باقی ہیں، زید آپ سے کہتا ہے کہ میں آپ کے پانچ ہزار روپے خالد کے حوالے کرتا ہوں، آپ خالد سے وصول کرلیں۔ اب خالد اگر صاحبِ حیثیت ہے اور آپ کا قرض ادا کرنے کی طاقت رکھتا ہے، اور وہاں آپ کا قرض ضائع ہونے کا کوئی خطرہ بھی نہیں ہے؛ تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ آپ کو بھی چاہیے کہ اس حوالہ کو منظور کرلیں۔ احناف، مالکیہ اور شوافع کے یہاں مسئلہ یہی ہے کہ جب تک قرض خواہ اس معاملہ کو

منظور نہ کرے؛ تب تک یہ معاملہ مکمل نہیں ہوگا۔ اسی لیے کہا گیا کہ قرض خواہ کو چاہیے کہ مقروض جس کے ذمہ اپنا قرض ڈال رہا ہے اور وہ قبول بھی کر رہا ہے، اور اس میں ادائیگی کی طاقت بھی ہے تو پھر قرض خواہ کو چاہیے کہ انکار نہ کرے۔ جب کہ امام احمد بن حنبلؒ اور دوسرے بعض حضرات فرماتے ہیں کہ: قرض خواہ منظور کرے یا نہ کرے، محیل کے کہنے اور محتال علیہ کے ذمہ داری لے لینے سے قرض اس کے ذمہ چلا جائے گا۔ اور حوالہ مقروض کے ساتھ ایک طرح کا حسنِ سلوک ہے۔ احناف کے نزدیک قرض خواہ کے لیے حوالہ کو قبول کرنا واجب اور فرض نہیں ہے، بلکہ مستحب کا درجہ رکھتا ہے۔

كراهة عود الإنسان في هبة لَمْ يُسلِّمها إِلَى الموهوب لَهُ وفي هبة وهبها لولده وسلمها أَوْ لَمْ يسلمها وكراهة شرائه شَيْئاً تصدّق بِهِ من الَّذِي تصدق عَلَيْهِ أَوْ أخرجه عن زكاة أَوْ كفارة ونحوها وَلاَ بأس بشرائه من شخص آخر قَدْ انتقل إِلَيْهِ

اس باب میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ ایک اور مسئلہ چھیڑ رہے ہیں: کوئی آدمی کسی کو کوئی چیز ہدیہ دے، اس کے بعد اس سے واپس لے لے؛ تو کیا حکم ہے؟۔

ایک ذاتی واقعہ

دیکھو! ہدیہ اور بخشش دینے والا جس کو ہدیہ اور بخشش دے رہا ہے اس کو یوں کہے کہ میں نے تم کو یہ چیز ہدیہ کے طور پر دی، اور سامنے والا کہے کہ میں نے اس کو قبول کر لی، اور پھر اس کے اوپر سامنے والے کا قبضہ بھی ہو جائے؛ تب ہی ہدیہ اور بخشش کا معاملہ مکمل ہوگا۔ جب تک اس چیز پر سامنے والے کا قبضہ نہ ہوگا وہاں تک احناف کے یہاں ایسی بخشش تام اور مکمل نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے اگر اس کے قبضہ کرنے سے پہلے

بخشش دینے والے کا انتقال ہو جائے تو اب یہ معاملہ ختم ہو گیا، اور وہ چیز بخشش دینے والے کے ورثاء کی طرف منتقل ہو جائے گی، جس کو بخشش دی گئی تھی وہ نہیں لے سکتا۔ اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

ہمارے ایک عزیز جدہ میں رہتے تھے، انہوں نے اپنی زندگی میں ایک صاحب کو کچھ رقم دی کہ اس سے فلاں چیز خرید کر میرے (حضرت مفتی صاحب کے) حوالے کر دینا۔ وہ خرید کر میرے حوالے کریں اس سے پہلے جدہ والے عزیز کا انتقال ہو گیا۔ بعد میں ان صاحب نے مجھے بتلایا کہ انہوں نے یہ رقم مجھے دی تھی اور یہ کہا تھا کہ فلاں چیز خرید کر تمہیں دیدوں؛ تو لیجئے! میں یہ لے آیا ہوں۔ میں نے کہا: اس رقم سے نہ تو آپ خرید سکتے ہیں، اور نہ مجھے حوالے کر سکتے ہیں، یہ رقم تو ان کے ورثاء کی ہو گئی۔ آپ تو ان کی طرف سے اس چیز کے خریدنے کے وکیل تھے، اور آپ یہ چیز خریدیں اس سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا، اور مسئلہ یہ ہے کہ انتقال ہو جانے سے وکالت ختم ہو جاتی ہے۔ ایسے مسائل میں بہت احتیاط کی ضرورت رہتی ہے۔

ایک طریقہ اور اس کی اصلاح

ہمارے معاشرہ اور سماج میں بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ باپ اپنی زندگی میں بیٹوں سے کہتا ہے کہ یہ تجھے دیا اور وہ فلاں کو دیا، لیکن وہ سب ان کے قبضے میں سونپا نہیں جاتا بلکہ باپ ہی کے قبضے میں رہتا ہے، یہاں تک کہ باپ کا انتقال ہو جاتا ہے، اب مسئلہ مفتیوں کے پاس آتا ہے کہ والد صاحب نے فلاں چیز بخشش کر دی تھی، تو مفتی صاحب مسئلہ بتاتے ہیں کہ جب انہوں نے اپنی زندگی میں اس کا قبضہ نہیں سونپا تھا تو بخشش والا معاملہ مکمل ہی نہیں ہوا تھا اور جب ان کا انتقال ہو گیا تو اب وہ معاملہ ہی

ختم ہوگیا، اس لیے یہ چیز وراثت میں شمار کی جائے گی، اور جن جن ورثاء کے شریعت نے جتنے حصے مقرر کئے ہیں اس کے مطابق ان سب کو دیا جائے گا۔ ہاں! والد صاحب نے جو چیز بطور بخشش جس کو دی ہے اگر اس نے وہ چیز قبول بھی کرلی اور والد صاحب نے اس کے حوالے بھی کردی؛ تو وہ اس کا مالک بن گیا۔

ہدیہ دے کر واپس لینا

ایک مسئلہ یہ ہے کہ کسی کو کوئی چیز بخشش دی، اب اس سے وہ چیز واپس لی جا سکتی ہے یا نہیں؟ یہ مسئلہ ائمہ کے درمیان اختلافی ہے، اسی کو علامہ نوویؒ اس باب میں بیان کرنا چاہتے ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں مسئلہ یہ ہے کہ اگر باپ نے بیٹے کو کوئی چیز بطورِ بخشش دی، اور پھر وہ اس سے واپس لینا چاہے؛ تو لے سکتا ہے، اور اس کے علاوہ کسی اور نے کسی کو بخشش دی ہو اور قبضہ بھی کرادیا ہو؛ تو اس کے پاس سے واپس نہیں لی جاسکتی۔

احناف کے یہاں مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی نے کسی کو بطورِ بخشش کوئی چیز دی اور اس کو قبضہ بھی سونپ دیا، اس کے بعد بھی اگر واپس لینا چاہے تو اس کی رضامندی سے واپس لی جاسکتی ہے۔ یاد رکھیے کہ اس کی رضامندی شرط ہے، یعنی وہ اپنی خوشنودی سے واپس دیدے، یا وہ خوشی سے تو نہیں دیتا مگر ''واہب'' یعنی دینے والے نے یہ معاملہ قاضی کے سامنے پیش کیا، اور قاضی نے اس کو پابند کیا کہ تم اس کو وہ چیز واپس لوٹا دو؛ تو اس صورت میں وہ واپس لے سکتا ہے۔ اگرچہ اس طرح واپس لینا اس کے لئے مکروہِ تحریمی قرار دیا گیا ہے۔

شوافع کی دلیل

اس سلسلہ میں دو روایتیں آئی ہیں، ایک روایت تو وہ ہے جس کو علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس باب میں پیش کریں گے کہ جو آدمی کوئی بخشش دے کر واپس لیتا ہے، وہ ایسا ہے جیسا کہ قے کر کے اس کو چاٹے۔ اور یہ کتوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب وہ خوب کھانا کھا لیتے ہیں تو کسی آڑ اور کونے میں جا کر کچھ حصہ قے کر کے نکال دیتے ہیں پھر دوسرے موقعہ پر جب بھوک لگتی ہے تو وہیں جا کر اس کو چاٹ لیتے ہیں۔ تو یہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس آدمی کو- جو کسی کو کوئی چیز ہدیہ اور بخشش دینے کے بعد اس سے واپس لے- کتے کے ساتھ تشبیہ دے رہے ہیں جو قے کرنے کے بعد اپنا قے کیا ہوا چاٹ لے۔ اسی روایت کی وجہ سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بخشش دینے کے بعد واپس لینا درست نہیں ہے۔

احناف کی دلیل

جب کہ احناف فرماتے ہیں کہ دوسری روایت بھی ہے: ''مَنۡ وَهَبَ هِبَةً فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا مَا لَمۡ يُثَبۡ مِنۡهَا'' کسی آدمی نے کسی کو کوئی چیز ہدیہ دی، اور جس کو دی گئی اس کی طرف سے واہب کو ہدیہ کے بدلہ میں کچھ نہیں ملا، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دینے والے کو اس چیز کا زیادہ حقدار بتلا رہے ہیں۔

مثال کے طور پر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم نے کوئی چیز کسی کو ہدیہ میں دی، تو سامنے والے نے بھی اس کے معاوضہ میں کوئی چیز ہمیں ہدیہ دی، چاہے اس سے چھوٹی اور کم قیمت ہی کیوں نہ ہو، جیسے: آپ نے کسی کو گھڑی دی، اور اس نے آپ کو عطر کی

شیشی دی، اب آپ کی گھڑی تو پانچ ہزار کی ہے، اور اس کی عطر کی شیشی ڈیڑھ سو روپئے کی ہے، لیکن بہرحال اس نے بھی آپ کو ایک چیز دی؛ تو اب آپ اپنا دیا ہوا ہدیہ واپس نہیں لے سکتے؛ اِلّا یہ کہ وہ وہی شیشی واپس کرے اور کہے کہ میری گھڑی لاؤ۔

احناف نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان دونوں پاکیزہ ارشادات کو سامنے رکھتے ہوئے دونوں پر عمل کی شکل یہ نکالی کہ اُس روایت کا مطلب-جس میں واپس لینے کو کتے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے- یہ ہے کہ دیکھو! کتے کے فعل کو گھناؤنا اور ناپسندیدہ تو کہا جاسکتا ہے، لیکن اس پر حرمت کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ اس لیے کہ حلال یا حرام ہونے کا فیصلہ انسانوں کے کاموں پر تو کر سکتے ہیں، جانوروں کے کاموں کی وجہ سے حلال یا حرام ہونے کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ ہاں! جانور کے ساتھ مشابہت ہونے کی وجہ سے گھناؤنا اور قابلِ نفرت کام کہہ سکتے ہیں۔ تو یہاں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتے کے ساتھ جو تشبیہ دی کہ وہ قے کرتا ہے اور پھر چاٹ لیتا ہے، تو احناف کہتے ہیں کہ اس سے حرمت لازم نہیں آتی، ہاں! اس کا ناپسندیدہ ہونا معلوم ہوتا ہے؛ اس لئے ہم کہیں گے کہ دے کر واپس لینا مکروہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود کوئی آدمی واپس لے گا اور سامنے والا اپنی رضامندی سے واپس کرے گا، یا وہ اپنی خوشی سے تو واپس نہیں کر رہا ہے لیکن حاکم اور قاضی اس کو حکم دیتا ہے کہ تم واپس کر دو؛ تو ان دونوں صورتوں میں دینے والے کی ملکیت میں وہ چیز واپس آجائے گی۔ اور اگر اس نے نہ تو اپنی خوشی سے واپس کیا، اور نہ حاکم نے واپس کرنے کا حکم دیا؛ تو اب یہ زبردستی نہیں چھین سکتا۔

جب آپسی محبتیں چلتی ہیں

عام طور پر ہمارے معاشرہ میں ایسا بہت ہوتا ہے کہ جب محبتیں چلتی ہیں تو

خوب چلتی ہیں، اور لین دین بھی برابر ہوتا رہتا ہے، اور جہاں لڑائی ہوئی تو پوری لسٹ نکالی جاتی ہے کہ مَیں نے تجھے آج تک یہ دیا اور وہ دیا؛ سب واپس لا۔ تو اب اگر وہ خوشی سے واپس نہیں کرتا، یا دینے سے منع ہی کر دیتا ہے کہ میں نہیں دوں گا؛ تو اس صورت میں زبردستی اس کے پاس سے واپس لیا نہیں جا سکتا، اس لئے کہ اس کو دیدینے کی وجہ سے وہ اس چیز کا مالک ہو گیا ہے اور وہ چیز اب اس کی ملکیت ہے، تمہاری نہیں۔ ہاں! اگر وہ آپ کے مانگنے کی وجہ سے آپ کی حرکت پر ناراض ہو کر اپنی مرضی سے کہتا ہے کہ جا! میں نے واپس کر دی اور آپ کو سونپ بھی دے، تب تو وہ آپ کی ملکیت میں آ جائے گی۔ لیکن اگر وہ اپنی خوشی اور مرضی سے نہیں سونپتا، آپ چھین کر لیں گے تو آپ اس چیز کے مالک نہیں بنیں گے، بلکہ دوسرے کی چیز چھیننے والے شمار ہوں گے۔

بخشش واپس لینے کے سات شرائط

احناف کے نزدیک دی ہوئی چیز واپس لینے کی جو اجازت دی جا رہی ہے وہ اس وقت ہے جب کہ سات باتوں میں سے کوئی بات پائی نہ گئی ہو۔ ہمارے مدارس میں ایک کتاب ''کنز الدقائق'' پڑھائی جاتی ہے، اس میں ''کتاب الھبۃ'' کے اندران سات اسباب کو- جن کی وجہ سے ہبہ کی ہوئی چیز واپس لینا ممنوع ہے- سات حروف ''دَمْعُ خَزَقَهُ'' میں جمع کیا گیا ہے۔

(۱) ''الدَّالُ : الزِّيَادَةُ الْمُتَّصِلَةُ'' یعنی جو چیز دی گئی ہے اس میں کسی چیز کی زیادتی نہ ہوئی ہو۔ مثلاً: آپ نے کسی کو زمین ہدیہ میں دی، اور اس نے اس زمین میں مکان بنا لیا، اب آپ اس سے مطالبہ کریں کہ میری دی ہوئی زمین مجھے واپس کرو؛ تو آپ نہیں مانگ سکتے؟ اس لیے کہ آپ نے زمین ہدیہ میں دی، اس نے قبول کر لی

اور مکان بھی بنالیا، اب اس زیادتی کے بعد واپسی کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔

(۲) ''وَالْمِیمُ: مَوْتُ أَحَدِ الْمُتَعَاقِدَیْنِ'' دونوں میں سے کسی ایک کا- دینے والے کا یا لینے والے کا- انتقال ہوجائے۔ مثلاً: آپ نے زید کو ایک گھڑی دی پھر زید کا انتقال ہوگیا، اب آپ زید کے بیٹوں اور وارثوں سے کہیں کہ میں نے آپ کے ابا کو ایک گھڑی دی تھی وہ مجھے واپس دو۔ جب اس کا انتقال ہوگیا تو اب واپس نہیں لی جاسکتی۔ یا آپ کا انتقال ہوجائے اس کے بعد آپ کے بیٹے اور ورثاء زید سے وہ گھڑی واپس مانگیں؛ تو وہ بھی نہیں مانگ سکتے۔

(۳) ''وَالْعَیْنُ: الْعِوَضُ'' آپ نے کسی کو کوئی چیز ہدیہ میں دی اور اس نے بھی اس کے بدلے میں کوئی چیز آپ کو ہدیہ دیدی، اور آپ نے وہ قبول کرلی؛ تو اب آپ اپنی دی ہوئی چیز واپس نہیں لے سکتے۔ میں نے اوپر مثال دی تھی کہ آپ نے گھڑی دی اور اس نے آپ کو بدلے میں عطر کی شیشی دی۔ ہاں! آپ عطر کی وہی شیشی اس کو واپس لوٹائیں تو اپنی چیز مانگ سکتے ہیں۔

(۴) ''وَالْخَاءُ: خُرُوجُ الْهِبَةِ عَنْ مِلْكِ الْمَوْهُوبِ لَهُ'' جس کو کوئی چیز ہدیہ میں دی گئی ہے اس نے وہ چیز اپنی ملکیت سے نکال دی ہو، مثلاً: آپ نے اس کو ہدیہ میں گھڑی دی، اور اس نے وہ بیچ دی، یا اس نے کسی اور کو ہدیہ دیدی، اب آپ اس سے مطالبہ کریں کہ میری گھڑی واپس لاؤ؛ تو یہ مطالبہ نہیں کیا جاسکتا۔

(۵) ''وَالزَّائُ: الزَّوْجِیَّةُ'' اسی طرح دینے والے اور لینے والے کے درمیان میاں بیوی کا رشتہ ہو۔ تو اب وہ واپس نہیں لی جاسکتی۔ ہمارے معاشرہ میں یہ بھی ہوتا ہے کہ جب نکاح کا معاملہ ہوتا ہے تو بیوی نے شوہر کو اور شوہر نے بیوی کو کوئی

چیز ہدیہ میں دی، بعد میں جب طلاق کی نوبت آتی ہے تو شوہر کی طرف سے پوری لسٹ وہاں بھیجی جاتی ہے کہ ہماری طرف سے یہ یہ چیزیں تم کو ہدیہ میں دی گئی ہیں؛ وہ سب واپس لاؤ۔ لہٰذا جو چیز ہدیہ میں دی گئی وہ واپس نہیں لی جا سکتی۔ ہاں! جو چیز استعمال کے لئے دی جاتی ہے وہ تو واپس لی جا سکتی ہے۔

(۶) ''وَالْقَافُ : اَلْقَرَابَۃُ'' قرابت یعنی دونوں میں ذی رحم محرم کا رشتہ ہو، جیسے: دونوں سگے بھائی ہیں یا آپس میں بھائی بہن ہیں، باپ بیٹے کا رشتہ ہے؛ تو اس صورت میں اگر ایک نے دوسرے کو کوئی چیز ہدیہ میں دی ہے تو وہ واپس نہیں لی جا سکتی۔

(۷) ''وَالْھَاءُ: اَلْھَلَاکُ'' یعنی وہ چیز جو ہدیہ میں دی گئی ہے وہ ہلاک ہوگئی ہو؛ تب بھی واپسی کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔

بہرحال! ان سات اسباب میں سے کسی بھی ایک صورت میں دی ہوئی چیز واپس نہیں مانگی جا سکتی۔

لیکن ہمارے معاشرے میں یہ بھی ایک بہت بری چیز ہے کہ جب تک آپس میں تعلقات اور محبتیں رہتی ہیں وہاں تک تو اس طرح ہدیوں اور بخششوں کا لین دین بھی رہتا ہے، لیکن جہاں کچھ جھگڑا ہو گیا تو (بہت سے ایسے واقعات ہمارے سننے میں آتے ہیں کہ) باقاعدہ پوری فہرست بھیجتے ہیں کہ میں نے فلاں فلاں وقت پر تم کو یہ چیزیں دی تھیں، وہ سب واپس لاؤ۔ اب وہ چیز ہلاک ہوگئی، اس کے پاس باقی ہی نہیں رہی، پھر بھی اس کے پیسے مانگے جاتے ہیں؛ یہ درست نہیں۔ جیسا کہ میں نے ابھی بتلایا پیسے لینے کا کسی صورت میں بھی حق نہیں پہنچتا۔

بہرحال! ایسی جو باتیں ہوتی ہیں ان کے بارے میں جب تک شرعی حکم معلوم

نہ کرلیا جائے وہاں تک کوئی اقدام درست نہیں ہے۔اس باب میں علامہ نوویؒ نے ایک بات تو یہ بتلائی۔

صدقہ واپس لینا

دوسری بات یہ بتلاتے ہیں:-آپ نے کوئی چیز کسی کو بطورِ ہدیہ نہیں، بلکہ بطورِ صدقہ یا زکوٰۃ کے اللہ واسطے دی، یا کفارہ میں کوئی چیز دی، مثلاً: آپ نے کوئی پلاٹ یا مکان زکوٰۃ کے طور پر دیا، یا کوئی گھڑی زکوٰۃ کے طور پر دی؛ بعد میں وہی گھڑی یا پلاٹ اور گھر اس سے واپس خرید رہے ہیں؛ تو یہ بھی پسندیدہ نہیں ہے۔ ہاں! آپ نے جس کو گھڑی یا پلاٹ یا مکان دیا تھا اس نے وہ چیز کسی تیسرے کو بیچ دی، اب آپ اس تیسرے آدمی سے خرید رہے ہیں؛ تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

یہاں یہ بات سمجھنی چاہیے کہ آپ نے جس کو زکوٰۃ یا صدقہ کے طور پر وہ چیز دی ہو اس سے براہِ راست لینا منع کیوں ہے؟ تو علماء نے لکھا ہے کہ جب آپ نے صدقہ کے طور پر وہ چیز اس کو دی، تو چوں کہ آپ کی طرف سے یہ چیز اس کے پاس مفت میں اور بطورِ صدقہ (یعنی اللہ کی نسبت سے) گئی ہے، اب ظاہر ہے کہ جب آپ ہی براہِ راست اس سے وہ چیز لیں گے تو یقیناً وہ قیمت کے معاملہ میں آپ کے ساتھ رعایت برتے گا۔ مثلاً: یہی گھڑی آپ کے علاوہ کسی دوسرے کو بیچتا تو پانچ سو (۵۰۰) سے کم میں نہ بیچتا، لیکن جب آپ نے مانگی تو وہ بھی سوچے گا کہ اسی نے تو مجھے دی تھی، چلو! ساڑھے چار سو (۴۵۰) میں دیدو۔ تو یوں سمجھو کہ اس نے پچاس روپے کی جو کمی کی وہ گویا آپ نے اپنے صدقہ میں سے واپس لے لیا، تو جیسے صدقہ میں دی ہوئی چیز واپس لیتے ایسے ہی اس تعلق اور نسبت کی وجہ سے جتنی قیمت کی کمی ہوئی وہ بھی اسی میں شمار ہوتی

ہے؛ اس لئے اس سے منع کیا ہے۔

ہدیہ اور صدقہ میں فرق

ہدیہ اور صدقہ میں فرق یہ ہے کہ صدقہ تو اللہ کی نسبت پر اور ثواب حاصل کرنے کی غرض سے دیا جاتا ہے، اور ہدیہ جس کو دیا جاتا ہے اسی کو خوش کرنے اور تعلقات کو مزید مضبوط کرنے کی نیت سے اور محبت بڑھانے کے لئے دیا جاتا ہے۔ اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تَهَادَوْا تَحَابُّوْا'' آپس میں ہدیہ کا لین دین کرو اس کی وجہ سے آپس میں محبت بڑھے گی۔ تو ہدیہ میں ثواب کا حصول مقصود نہیں ہوتا، اگرچہ اس میں بھی ثواب ملتا ہے، لیکن پیشِ نظر ثواب حاصل کرنا نہیں ہوتا، جبکہ صدقہ میں جس کو صدقہ دیا جارہا ہے اس کی ذات نگاہوں کے سامنے نہیں ہوتی، بلکہ وہاں تو نگاہوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کی ذات ہوتی ہے کہ وہ کوئی بھی ہو، مَیں اس کو اللہ کے لئے دے رہا ہوں۔

باب کی روایتیں

۱۶۱۲:-وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما: أَنَّ رسول اللہ ﷺ قَالَ: ((الَّذِی یَعُودُ فی هِبَتِهِ کَالْکَلْبِ یَرْجِعُ فی قَیْئِهِ)). (متفق عَلَیْهِ)

وفی روایة: ((مَثَلُ الَّذِی یَرْجِعُ فی صَدَقَتِهِ، کَمَثَلِ الْکَلْبِ یَقِیءُ، ثُمَّ یَعُودُ فی قَیْئِهِ فَیَأْکُلُهُ)). وفی روایةٍ: ((العائِدُ فی هِبَتِهِ کالعائِدِ فی قَیْئِهِ))

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اپنی بخشش کی ہوئی چیز کو واپس لیتا ہے وہ کتے کی طرح ہے جو اپنی کی ہوئی قے چاٹتا ہے۔

دوسری روایت میں ہے: جو آدمی اپنا دیا ہوا صدقہ واپس لے لیتا ہے، وہ کتے کی طرح ہے جو قے کرتا ہے، پھر اسی قے کو دوبارہ چاٹ کر کھالیتا ہے۔

ایک اور روایت میں ہے: اپنا دیا ہوا ہدیہ واپس لینے والا ایسا ہے جیسا کہ اپنی قے چاٹنے والا۔

۱۶۱۳: -وعن عمر بن الخطاب- رضی اللہ عنہ- قَالَ: حَمَلْتُ عَلَى فَرَسٍ فِي سَبِيلِ اللهِ فَأَضَاعَهُ الَّذِي كَانَ عِنْدَهُ، فَأَرَدْتُ أَنْ أَشْتَرِيَهُ، وَظَنَنْتُ أَنَّهُ يَبِيعُهُ بِرُخْصٍ، فَسَأَلْتُ النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ: ((لَا تَشْتَرِهِ وَلَا تَعُدْ فِي صَدَقَتِكَ وَإِنْ أَعْطَاكَهُ بِدِرْهَمٍ؛ فَإِنَّ العَائِدَ فِي صَدَقَتِهِ كَالعَائِدِ فِي قَيْئِهِ)). (متفق عَلَيْهِ)

قَوْله: ((حَمَلْتُ عَلَى فَرَسٍ فِي سَبِيلِ الله)) مَعنَاهُ: تَصَدَّقْتُ بِهِ عَلَى بَعْضِ الْمُجَاهِدِينَ.

ترجمہ: -حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک آدمی کو اللہ کے راستے میں جہاد کرنے کے واسطے ایک گھوڑا بطورِ صدقہ دیا لیکن اس نے اس کو ضائع کر دیا (ضائع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی جیسی خدمت کرنی تھی، اور جیسا کھلانا پلانا چاہئے تھا وہ کھلا پلا نہیں سکا، جس کی وجہ سے وہ گھوڑا کمزور ہو گیا) تو میں نے سوچا کہ اس سے خرید لوں اور میں نے یہ بھی سوچا کہ جب میں خود ہی واپس خریدوں گا تو وہ مجھے کچھ سستے میں ہی بیچے گا۔ چناں چہ اس سلسلہ میں مَیں نے حضورِ اکرم ﷺ سے پوچھا: (حضراتِ صحابہؓ کی یہ ایک خصوصیت تھی کہ کوئی بھی کام ہو پہلے حضور ﷺ سے پوچھ لیتے تھے اس کے بعد کرتے تھے۔ ہمارا حال تو یہ ہے کہ بڑوں سے پوچھتے ہی نہیں، یا پہلے کر ڈالیں گے، بعد میں پوچھیں گے۔ اصل تو یہ ہے کہ پہلے پوچھو، اس کے بعد کرو۔) حضور ﷺ نے فرمایا: اپنا صدقہ کیا ہوا مال اس سے واپس مت

خریدو، چاہے وہ تم کو ایک روپے میں ہی بیچتا ہو، اس لئے کہ جو آدمی اپنی صدقہ دی ہوئی چیز واپس لیتا ہے وہ ایسا ہے جیسے کتا اپنی قے کی ہوئی کو واپس چاٹتا ہے۔

افادات:۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی چیز صدقہ یا زکوٰۃ کے طور پر کسی کو دی گئی ہو یا کسی بھی طرح کے کفارہ کے طور پر دی گئی ہو، تو وہ چیز دینے والا خود براہِ راست اس سے نہ خریدے۔ اس لیے کہ اس میں وہی خطرہ رہتا ہے کہ اس کو رعایتی دام میں دے گا تو گویا اللہ کے راستہ میں دی ہوئی اتنی مقدار واپس لینا لازم آئے گا، ہاں! اس نے اگر کسی تیسرے کو بیچ دی ہو اس سے آپ خریدنا چاہیں تو اس کی البتہ اجازت ہے

تاکید تحریم مال الیتیم

یتیم کے مال کی حرمت کی تاکید

قَالَ اللہ تَعَالَی: إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَى ظُلْماً إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَاراً وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيراً. (النساء:۱۰)

وقال تَعَالَی: وَلاَ تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلاَّ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ. (الأنعام:۱۵۲)

وقال تَعَالَی: وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَى قُلْ إِصْلاَحٌ لَهُمْ خَيْرٌ وَإِنْ تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ واللهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ. (البقرة:۲۲۰)

وہ نابالغ لڑکا یا لڑکی جس کے باپ کا انتقال ہو گیا ہو، جب تک وہ نابالغ ہے وہاں تک اس کو ''یتیم'' کہا جائے گا، اس کے بالغ ہوتے ہی شرعی اعتبار سے اس کی یتیمی باقی نہیں رہتی۔ اور جس کے باپ کا انتقال ہو گیا ہو وہی یتیم کہلاتا ہے، ماں کا انتقال ہو گیا ہو اور باپ موجود ہو؛ وہ یتیم نہیں ہے۔

جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں

یتیم کے مال کی حرمت بہت زیادہ سخت ہے اور اس سلسلے میں قرآنِ پاک اور احادیث میں بڑی تاکید آئی ہے۔ چناں چہ قرآن پاک کی ایک آیت پیش کی ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَى ظُلْماً إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَاراً وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيراً (النساء:۱۰)﴾ جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ کے اندر آگ ڈال رہے ہیں اور عنقریب وہ لوگ جہنم میں جائیں گے۔

یتیم کے مال کے سلسلہ میں زمانۂ جاہلیت میں بڑی بے احتیاطیاں ہوتی تھیں، جب کسی کا انتقال ہوجاتا اور اس کی نابالغ اولاد ہوتی تو عام طور پر مرنے والے کے بھائی، یا اس کی بیوی، یا نابالغ اولاد کے بڑے بھائی بہن، ان کے مالوں پر اپنا قبضہ جمالیا کرتے تھے، اور اس مال میں اس بچے کا جو شرعی حق ہے وہ ادا کرنے کے بجائے اس کے ساتھ زیادتی کرتے تھے۔ اس لئے اس سلسلہ میں قرآن اور حدیث میں بڑی تاکید آئی، اور اس سے بہت ڈرایا گیا کہ جو لوگ یتیم کا مال کھاتے ہیں وہ یوں سمجھیں کہ گویا اپنے پیٹ میں آگ ڈال رہے ہیں۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس آیت میں تشبیہ کے طور پر آگ کہا گیا ہے، لیکن اکثر حضراتِ محققین فرماتے ہیں کہ ایسے آدمی حقیقت میں آگ کھا رہے ہیں، گویا یہ مال ان کے پیٹ میں آگ بن کر ہی جا رہا ہے۔ جیسے: کسی کے ہاتھ میں دیا سلائی ہو تو ہم اس کو کہیں گے کہ تمہارے ہاتھ میں تو بارود ہے۔ اور بارود خانہ بھی بظاہر جلتا ہوا نظر نہیں آتا لیکن لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو بارود کا گولہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ ابھی ہم کو بظاہر آگ نظر نہیں آتی لیکن جب وقت آئے گا تو وہ آگ کی شکل اختیار کرلے گا۔ جیسے: کسی کے پاس سنکھیا ہو تو کہا جاتا ہے کہ یہ تو قاتل ہے۔ اب ہاتھ میں لے کر یوں کہے کہ اس نے مجھے کہاں مار ڈالا۔ تو کہیں گے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اس کو منھ میں رکھیں گے اور پیٹ میں جائے گا تو قاتل ہونے والا اپنا اثر دکھائے گا۔

ناحق کھانے کا مطلب یہ ہے کہ ناحق طریقے سے اس کو اپنے تصرف اور استعمال میں لائے گا، چاہے وہ کھا کر ہو، چاہے پہن کر ہو، چاہے کسی اور طریقے سے استعمال کرکے ہو۔ ''کسی کا مال کھانا'' بول کر ناحق طریقے سے کسی بھی طرح اپنے

استعمال میں لانا مراد ہوتا ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ اس کے ساتھ خرید و فروخت ہوئی، شرعی طریقے سے کچھ بیچا اور کسی نے وہ خریدا، اور اس کے معاوضے میں اس کی قیمت چکائی، تو اب وہ مال یتیم کا نہیں رہا، جس نے خریدا وہ اس کی ملک ہو گیا۔

لیکن اس آیت میں تو یتیم کا مال ناحق طریقے سے استعمال کرنے کی تعبیر اختیار کی گئی۔ معلوم ہوا کہ اس بارے میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لینے کی تاکید کی جارہی ہے۔

یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ

دوسری آیت لائے ہیں: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ (الأنعام: ۱۵۲) یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ؛ مگر اس طریقے سے جو بہتر ہو۔ یعنی اس کے مال کو ٹھیک کرنے کے لئے، اس کی بھلائی اور خیر خواہی کے لئے اگر آپ اس میں کوئی تصرف کرتے ہیں اور اس کا آپ کو شریعت کی طرف سے اختیار بھی دیا گیا ہے؛ تب تو ٹھیک ہے۔ ورنہ اس میں آپ کو ہاتھ ڈالنے کی اجازت نہیں، اس کے قریب بھی جانے سے منع کیا گیا ہے۔ یہ بہت زیادہ احتیاط کی چیز ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے اکابر بہت زیادہ احتیاط فرماتے تھے۔

ایک واقعہ

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے معارف القرآن میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ: ایک آدمی بیمار تھا، ایک بزرگ اس کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، وہ اس کے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے اسی دوران اس کا انتقال ہو گیا، رات کا وقت تھا اور چراغ جل رہا تھا، انہوں نے فوراً وہ چراغ بجھا دیا، اور اپنے پاس سے پیسے دے کر تیل

منگوایا اور دوسرا چراغ حاصل کر کے اس کو جلوایا، اور کہا: جب تک یہ آدمی زندہ تھا، وہاں تک یہ چراغ اور اس میں جلنے والا تیل اس کی ملکیت تھا، جیسے ہی اس کی موت واقع ہوگئی تو اب اس کی ملکیت نہیں رہی، بلکہ اس کے ورثاء کی ملکیت میں آ گیا۔ اور یہاں اس کے سب ورثاء موجود نہیں ہیں، اور ان کی اجازت کے بغیر اس کو استعمال کرنا درست نہیں ہے۔

یتیم کے مال میں کسی کو ناحق تصرف کا حق نہیں

بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ مثلاً: ایک آدمی کا انتقال ہو گیا اور اس کی اولاد میں ایک دو لڑکے لڑکیاں بالغ ہیں، اور دوسری اولاد نابالغ ہے، تو اب ان بالغ اولاد کی بہت بڑی ذمہ داری ہو جاتی ہے۔ بہت سی مرتبہ ماں اس زعم اور خوش فہمی میں کہ میں تو ماں ہوں، جو چاہوں کر سکتی ہوں، یتیم بچوں کے مال کے اندر تصرف کرتی ہے، اور وہ بھی اس وعید کی حقدار بن جاتی ہے۔ اس لیے معلوم ہونا چاہیے کہ شریعت کا اصول اپنی جگہ پر ہے، چاہے ماں ہو یا اور کوئی ہو، کسی کو بھی یتیم کے مال کو ناحق طریقے سے استعمال کرنے کی شریعت کسی بھی حال میں اجازت نہیں دیتی۔

بہت سی جگہوں پر ایسا ہوتا ہے کہ جس مال میں یتیم کا حق ہو اس کو تقسیم کئے بغیر استعمال میں لایا جاتا ہے، اس صورت میں یتیم بچے کا جتنا حق ہوتا ہے خود اس کے استعمال میں تو اس میں سے بہت کم آتا ہے، اور اس کے بڑے بھائی، یا اس کی ماں اور چچا وغیرہ اپنے حق سے زیادہ استعمال کر لیتے ہیں، حالاں کہ اس میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس لئے علماء نے سخت تاکید فرمائی ہے کہ یتیم کے مال کو تقسیم کر کے الگ کر دیا جائے اور اس کی ضرورتوں کے علاوہ اس کو استعمال نہ کیا جائے۔

یتیم کے مال کے متعلق قرآنی مشورہ

﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ قُلْ إِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ وَإِن تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ (البقرۃ:۲۲۰)﴾ اے نبی! یہ لوگ آپ سے یتیموں کے تعلق سے پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ اگر ان کے مال اور جائیداد کی درستگی مقصود ہے تب تو بہتر ہے۔ اور اگر کھانے پینے میں ان کو اپنے ساتھ کر لیتے ہو تو یہ بھی تمہارے دینی بھائی ہیں۔ اور تم میں کون درستگی کا خیال رکھنے والا ہے اور کون بگاڑنے والا ہے دونوں کو اللہ تعالیٰ بخوبی جانتے ہیں۔

دراصل یتیموں کے مال کے سلسلے میں جب قرآن پاک میں اتنی سخت وعیدیں آئیں اور نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی تاکید فرمائی تو حضراتِ صحابہ ڈر گئے، اور یتیم کا سارا مال الگ کر دیا، اور ان کے لئے کھانا انہیں کے مال میں سے الگ پکوایا جانے لگا۔ اب ظاہر ہے کہ ایک بچہ کے مال میں سے جب اسی کے لیے الگ کھانا پکایا جائے گا تو جتنا پکایا گیا ہے وہ پورا تو نہیں کھا پائے گا، اور اس کے لئے مستقل پکانے میں خرچ بھی زیادہ ہوتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ وہ پورا نہیں کر پائے تو بگڑ جاتا ہے۔ اور اپنے ساتھ اپنے کھانے میں اس کو ملانے کی صورت میں ڈر لگتا تھا کہ کہیں ان کا مال کھانا لازم نہ آجائے جب یہ صورتیں پیش آئیں تو اس سلسلہ میں باری تعالیٰ نے یہ آسانی پیدا فرمائی کہ تم اپنے کھانے پینے میں ان کو شریک کر لو، اور حساب میں اپنی طرف زیادہ رکھ لو، اُس کی طرف کم رکھ لو؛ تاکہ معاملہ آسان ہو جائے، اور تمہاری نیت یہ ہو کہ اس کو اپنے ساتھ ملا کر کھلانے میں اس کا خرچ کم ہو جائے گا اور اس کے مال کی بھی حفاظت ہو جائے گی، اگر تمہاری نیت یہ ہے اور واقعۃً تم اپنی اس نیت کے مطابق شرعی طریقہ سے اس کے مال کی حفاظت

کا اہتمام کروگے، تو اللہ تعالیٰ دلوں کے حال سے بخوبی واقف ہے کہ کون درستگی کرنے والا ہے، اور کون بگاڑنے والا ہے؛ تو اس صورت میں ان شاء اللہ گرفت نہیں ہوگی۔

یہ سب ناجائز ہے

اور بہت سی جگہوں پر عام رواج ہوتا ہے کہ جب کسی کا انتقال جاتا ہے تو ورثاء کے علاوہ اس کے گھر کے دوسرے بڑے لوگ، جیسے: مرنے والے کے بڑے بھائی وغیرہ تو میت کی اولاد اور بیوی کے ہونے کی وجہ سے وارث نہیں ہوتے، لیکن عام طور سے اس وقت سارا تصرف اور کاروبار گھر کے بڑے لوگ ہی اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں، اس کے جو حقیقی وارث ہیں ان سے تو کوئی پوچھتا ہی نہیں، اور کہہ دیتے ہیں کہ اتنا اناج فقیروں کو دیدو، اور اس کے کپڑے بھی غریبوں میں تقسیم کردو۔ یہ سب ناجائز ہے، ہمارے معاشرہ کے عام دستور اور رسم ورواج کے تابع ہوکر لوگ ایسی چیزیں کر ڈالتے کہ اس کے لئے صدقہ کردو۔ اس صورت میں اس کو ثواب تو کیا ملتا، اُلٹا ان کی گرفت ہوتی ہے۔ اور اگر اس پر ثواب کی نیت کرلیں گے تو اس پر علماء نے بڑا سخت حکم لکھا ہے، اس لئے یہ ساری چیزیں بڑی احتیاط کی ہیں۔

علماء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ پہلے ہر ایک وارث کے حصے تقسیم کردیئے جائیں، اور ہر ایک کے پاس جب اس کا حصہ آجائے پھر جو اپنی طرف سے جتنا چاہے مرحوم کے لیے صدقہ کرے۔ سب کے سامنے ہر ایک وارث سے اجازت لینے کی صورت میں ہوسکتا ہے کہ کوئی وارث دل سے تو دینا نہیں چاہتا، لیکن وہ اس بات سے ڈرتا ہے کہ اگر میں منع کروں گا تو لوگ کہیں گے کہ ابا کے لئے دینے کا پوچھا گیا، اس میں بھی اس نے منع کردیا؛ تو مارے شرم کے وہ اجازت دیدیتا ہے۔ اور حدیث پاک

میں آتا ہے کہ کسی بھی مسلمان کا مال اس کی دلی خوشنودی کے بغیر لینا حلال نہیں ہے۔ اس لئے صدقہ کا بھی بہتر طریقہ یہی ہے کہ پہلے ہر ایک کو اس کا حصہ دیدیا جائے۔ اس سلسلہ میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔

ہلاک کرنے والی سات چیزوں سے بچو

۱۶۱۴:- وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ عن النبيِّ ﷺ قَالَ: ((اجْتَنِبُوا السَّبْعَ المُوبِقَاتِ!)) قالُوا: يَارَسُولَ اللهِ، وَمَا هُنَّ؟ قَالَ: الشِّرْكُ باللهِ، والسِّحْرُ، وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتي حَرَّمَ اللهُ إِلاَّ بالحَقِّ، وأكلُ الرِّبَا، وأَكْلُ مَالِ اليَتِيمِ، والتَّوَلِّي يَوْمَ الزَّحْفِ، وقَذْفُ المُحْصَنَاتِ المُؤْمِنَاتِ الغَافِلاَتِ. (متفق عَلَيْهِ)

((المُوبِقَاتِ)): المُهْلِكات.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہلاک کرنے والی سات چیزوں سے بچو۔ صحابۂ کرامؓ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! وہ سات چیزیں کون کون سی ہیں؟ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: (۱) اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا (۲) جادو کرنا کرانا (۳) ناحق کسی کو قتل کرنا (۴) سود کھانا (۵) یتیم کا مال کھانا (۶) (اللہ کے راستے میں) لڑائی کے دن مقابلہ سے میدان چھوڑ کر بھاگ جانا (۷) پاک دامن ایمان والی بھولی بھالی عورتوں پر زنا کی تہمت لگانا۔

افادات:- جادو بہت بڑا گناہ ہے، جو آدمی جادو کرکے لوگوں کو تکلیف اور نقصان پہنچاتا ہے شریعت نے اس کی سزا قتل تک کی مقرر کی ہے۔

اور یتیم کا مال کھانا ایسا کبیرہ گناہ ہے جس کو ہلاک کرنے والی چیزوں میں شمار کرایا گیا ہے۔ اس روایت کو یہاں اسی مناسبت سے لائے ہیں۔

باب تغلیظ تحریم الربوا

سود کی سخت حرمت کا بیان

قَالَ اللّٰهُ تَعَالَیٰ: اَلَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ، ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا، وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا، فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَانْتَهَىٰ فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللّٰهِ وَمَنْ عَادَ فَأُولٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ. يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ -إِلَىٰ قَوْلِهِ تَعَالَیٰ-: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا. (البقرۃ:۲۷۵تا۲۷۸)

تمہارا جو سود باقی ہے وہ بھی چھوڑ دو

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: جو لوگ سود کھاتے ہیں قیامت کے روز اپنی قبروں سے نہیں اٹھیں گے مگر اس آدمی کی طرح جس کو جن نے لپٹ کر مخبوط الحواس بنا دیا ہو۔ اور یہ سزا ان کو اس لئے دی جائے گی کہ وہ کہتے تھے کہ تجارت بھی تو سود ہی کی طرح ہے، حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام ٹھہرایا ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ نصیحت پہنچی اس کو سن کر وہ اپنی سود کھانے والی حرکت سے باز آ گیا تو پہلے جو کچھ ہو چکا ہو وہ اس کی ملکیت ہے۔ (یعنی سود کے حرام ہونے کا حکم نازل ہونے سے پہلے جو آدمی سود لے چکا تو اس کو لوٹانے کی ضرورت نہیں ہے۔) اور اس کی توبہ سچے دل سے ہے یا کیسی ہے، اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اور جو

دوبارہ ایسی حرکت کرے ایسے لوگ جہنمی ہیں، اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں اور صدقات کو بڑھاتے ہیں۔

جس وقت سود کی حرمت کا حکم نازل ہوا تو بہت سوں نے سودی معاملے کر رکھے تھے اور لوگوں کے سود دوسروں کے اوپر حساب میں باقی تھے، ان کے لیے باری تعالیٰ نے فرمایا: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور تمہارا جو سود باقی ہے وہ چھوڑ دو۔

سود لینے دینے والے پر لعنت

۱۶۱۵: -وعن ابن مسعود -رضی اللہ عنہ- قَالَ: لَعَنَ رسول اللہ -ﷺ- آكِلَ الرِّبَا وَمُوكِلَهُ. (رواہُ مسلم) زاد الترمذی وغیرہ: **وَشَاهِدَيْهِ وَكَاتِبَهُ.**

ترجمہ: -حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے سود دینے والے پر اور سود لینے والے پر لعنت فرمائی ہے۔

ترمذی شریف کی روایت میں ہے: سود کے معاملہ پر جو دو گواہ بنتے ہیں اور جو سود کی تحریر لکھتے ہیں؛ ان پر بھی لعنت فرمائی ہے۔

افادات: -حالاں کہ یہ تو نہ سود لے رہے ہیں اور نہ دے رہے ہیں، لیکن گواہ تو بن رہے ہیں، اس لیے ان پر بھی لعنت فرمائی۔ اس سے سود کی قباحت و برائی معلوم ہوتی ہے۔ آج کل ہمارے سماج میں سود کا معاملہ بہت زیادہ بڑھتا جا رہا ہے، لوگ اس کی حقیقت سے بھی واقف نہیں۔ اس سلسلہ میں بے شمار روایتیں ہیں۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ پاک کی سات آیتیں اور چالیس سے زیادہ حدیثیں سود کے سلسلے میں آئی ہیں۔ کسی بھی حرام چیز کے سلسلے میں اتنی سخت تاکید قرآن و حدیث میں نہیں ہوگی جتنی سود کے سلسلے میں ہے؛ اس کے باوجود جتنی

زیادہ بے احتیاطی سود کے معاملہ میں ہمارے یہاں کی جاتی ہے کسی اور چیز کے معاملہ میں نہیں کی جاتی۔

اُحسن الفتاویٰ کا ایک مضمون

اس سلسلہ میں اُحسن الفتاویٰ (جلد:۷،ص:۱۳۱) میں حضرت مفتی رشید احمد صاحب لدھیانویؒ کا ایک مضمون (''بشارۃ اللّٰظی لأکل الرّبوٰا'' کے نام سے) ہے اس کا کچھ حصہ آپ حضرات کو سناتا ہوں، حضرت تحریر فرماتے ہیں:۔

جو لوگ سود کھاتے ہیں، نہیں کھڑے ہوں گے مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے ایسا شخص جس کو شیطان (جن) خبطی بنادے لپٹ کر۔ یہ سزا اس لئے ہوگی کہ ان لوگوں نے کہا تھا کہ بیع (تجارت) بھی تو مثل سود کے ہے، حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے بیع (تجارت) کو حلال فرمایا ہے اور سود کو حرام کردیا ہے، پھر جس شخص کو اس کے پروردگار کی طرف سے نصیحت پہنچی اور وہ باز آگیا تو جو کچھ پہلے ہو چکا ہے وہ اسی کا رہا، اور معاملہ اس کا اللہ کے حوالے رہا۔ اور جو شخص پھر عود کرے تو یہ لوگ دوزخ میں جائیں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

اس آیت میں سود خوروں کا عبرت انگیز انجام بیان کیا گیا ہے کہ وہ محشر میں اس طرح کھڑے ہوں گے جیسے آسیب زدہ خبطی انسان کھڑا ہوتا ہے، چوں کہ یہ لوگ دنیا میں حبِ مال کے مرض میں جنون کی حد تک گرفتار تھے۔ ایسا جنون (پاگل پن) جس نے بیع (تجارت) اور ربا (سود) کا فرق بھی ان پر اوجھل کردیا، اس لئے قیامت میں بھی اللہ تعالیٰ انہیں اسی کیفیت میں اٹھائیں گے کہ یہ خبط وجنون سارے لوگوں کے سامنے عیاں ہوگا۔ جیسے مومنینِ متقین محشر میں روشن جبین، روشن اعضاء کے ساتھ

پہچانے جائیں گے، یونہی یہ سودخور اپنے دیوانہ پن اور غیر انسانی حرکات کے ساتھ پوری انسانیت کے روبرو ذلیل وخوار ہوں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ناقابل معافی گناہوں سے بچو، منجملہ ان کے مالِ غنیمت کی چوری ہے، جو شخص غنیمت کی کوئی چیز چرائے گا، قیامت کے دن اسے لے کر حاضر ہوگا۔ اور سود خوری ہے۔ جس نے سود کھایا وہ قیامت کے دن خبطی اور مجنون بنا کر اٹھایا جائے گا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دلیل میں یہی آیت تلاوت فرمائی۔

(روح المعانی، ص: ۴۲ / ج: ۳۔ مجمع الزوائد، ص: ۱۱۹ / ج: ۴)

سودخوروں کی اس سزا کا سبب ان کا یہ قول ''إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا'' ہے، ایک تو ان لوگوں نے ایک قطعی حرام کا ارتکاب کر کے قانونِ الٰہی کی صریح خلاف ورزی کی۔ یہی جرم کچھ کم سنگین نہ تھا کہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر قانون کو چیلنج کر دیا کہ ''بیع بھی تو مثل سود کے ہے'' اس جرم بغاوت کی پاداش میں ہمیشہ کے لئے جہنم کا ایندھن قرار پائے۔

دوسری آیت ہے: اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں اور صدقات کو بڑھاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے کسی کفر کرنے والے کو، کسی گناہ کرنے والے کو۔ سودی مال جتنا بھی بڑھ جائے، انجام کار اللہ تعالیٰ اسے مٹا کر نیست ونابود کر دیتے ہیں، ایسا مال نہ دنیا میں پھلتا ہے، نہ آخرت میں بارآور ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سود کا مال اگرچہ بڑھ جائے مگر اس کا انجام ہمیشہ بے برکتی اور کمی کی طرف لوٹ آتا ہے۔

(مسند احمد، ص: ۶۹/۵۔ ابن ماجہ، ص: ۱۶۵۔ حاکم، ص: ۳/۷ / ج: ۲)

دیکھو مجھے

اس مالِ خبیث کا کثرت سے قلت کی طرف آنا کوئی نظریاتی مسئلہ نہیں، بلکہ کھلی آنکھوں مشاہد ہے کہ سود خور کا مال بڑھ جاتا ہے اور بڑھتے بڑھتے طومار لگ جاتا ہے، حتیٰ کہ بہت سے دیکھنے والوں کی رالیں ٹپکنے لگتی ہیں۔ یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ۔

مگر جوں جوں اس پر مصیبت آتی ہے کہ یک بیک کروڑوں سے لڑھک کر لاکھوں میں، پھر لاکھوں سے ہزاروں اور سینکڑوں میں آجاتا ہے، بالآخر کوڑی کوڑی کا محتاج ہو کر زبانِ حال سے پکار اٹھتا ہے:۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اس قسم کے اموال کی نکاسی کسی جائز اور معقول مصرف میں نہیں ہوتی، یہ عموماً چوروں ڈاکوؤں کے پیٹ میں اتر جاتا ہے، یا پولس اور اہل کاروں کا لقمۂ تر بن جاتا ہے، یا پھر ناگہانی آفات وحوادث کی نذر ہو جاتا ہے۔ نیز الیکشن (جس میں چار پانچ ملین کا خرچہ تو معمولی سی بات ہے) کا بھوت بھی ایسے ہی لوگوں کے سر پر سوار ہوتا ہے، اور کون نہیں جانتا کہ قحبہ خانوں، قمار خانوں اور شراب خانوں کی رونق بھی انہیں لوگوں کے دم قدم سے رہتی ہے۔ غرض حرام کا پیسہ ”مالِ حرام بود، بجائے حرام رفت“ کے مصداق اپنی نکاسی کی راہیں خود ہی تلاش کر لیتا ہے۔

اگر شاذ ونادر سود کسی کے پاس محفوظ رہ جائے تب بھی سود خور کی طبیعت میں سنگ دلی، تنگ دلی، بزدلی، جنون کی حد تک حرص وہوس اور خست اور دناءت کے دوسرے مظاہر کی صورت میں اس کے نتائج ظاہر ہو کر رہتے ہیں۔

یہ اس کا دنیوی انجام تھا، آخرت میں سود کا مال بے سود وبے بہبود ہونا بالکل

عیاں ہے، ایسا مال کمانے والے کے گلے کا طوق اور سر کا وبال ہے۔ اس مال سے کیا گیا صدقہ وخیرات، حج اور جہاد اور صلہ رحمی غارت اور اکارت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے لوگو! سن لو کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاکیزہ ذات ہے، اس کی بارگاہ میں صرف پاک مال ہی شرفِ قبول پاتا ہے۔ (صحیح مسلم، ص:۳۲۶/ ج:۱)

صدقہ کو اللہ تعالیٰ بڑھاتے ہیں

سود کے برعکس صدقہ کے مال کو اللہ تعالیٰ بڑھاتے ہیں، دنیا میں بھی؛ آخرت میں بھی۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہر صبح دو فرشتے آسمان سے اترتے ہیں، ایک کہتا ہے: اے اللہ! خرچ کرنے والے کو بدلہ عطا فرما۔ دوسرا کہتا ہے: اے اللہ! مال روک کر رکھنے والے کو بربادی دے۔ (صحیح بخاری، ص: ۱۹۴/ ج:۱۔ صحیح مسلم، ص: ۳۲۵/ ج:۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے پاکیزہ کمائی سے کھجور کے دانے برابر بھی صدقہ کیا- اور اللہ تعالیٰ پاکیزہ مال ہی قبول کرتے ہیں- تو اللہ تعالیٰ داہنے ہاتھ میں لے کر اسے قبول کرتے ہیں، پھر صدقے والے کے لئے اسے بڑھاتے رہتے ہیں جیسا کہ تم میں ایک آدمی اپنے بچھڑے کو پال پوس کر بڑھاتا ہے حتیٰ کہ وہ صدقہ بڑھ کر پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔

جیسے حرام مال کی تباہی کی قدرے تفصیل بتائی گئی، اسی طرح پاکیزہ مال میں اللہ کی طرف سے برکت اور زیادتی بھی ایک مشاہد حقیقت ہے۔ ایک تو ایسا مال کسی غلط جگہ ضائع نہیں جاتا۔ دوسرے عام لوگ جس مقصد کے لئے بڑی محنت و دولت صرف کرتے ہیں، صالح اور دیندار مسلمان کا وہ مقصد تھوڑے سے مال میں گھر بیٹھے نکل آتا ہے۔

درسِ عبرت

زکوٰۃ وصدقات کی برکت سے مال کا بڑھنا، ان کے روکنے کی نحوست سے مال کا گھٹنا؛ ایک ایسی روشن حقیقت ہے، جس سے کسی منصف مزاج کافر کو بھی مجالِ انکار نہیں، مگر افسوس! رنگ و بو کی ظلمت نے آج کے مسلمان کی نظر سے اس چمکتی اور روشن حقیقت کو بھی اوجھل کر دیا۔ اس مسلمان معاشرے میں کتنے مسلمان ہیں جو زکوٰۃ کے فریضے کو چھوڑتے ہیں، انہیں اپنے مال کا چالیسواں حصہ نکالنا گوارا نہیں، مگر دوسری طرف یہ گوارا ہے کہ اچانک بیماری، آفتیں، حوادث، ناجائز مصارف میں ان سے بھی دس گنا زائد مال نکل جائے۔ ؏

خو سمجھ میں نہیں آتی ترے دیوانوں کی

کوٹھی نہیں جلی

ذیل میں ایک دشمنِ اسلام انگریز کا واقعہ درج کیا جا رہا ہے شاید کسی غافل مسلمان کی چشمِ عبرت کھل جائے۔

حضرت اقدس مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ:

میں نے اپنے بچپن میں اپنے والد صاحب سے اور دوسرے کئی لوگوں سے بھی یہ قصہ سنا کہ ضلع سہارنپور میں قصبہ بہٹ سے آگے انگریزوں کی کچھ کوٹھیاں تھیں، منجملہ ان کے پہلو میں- جہاں اعلیٰ حضرت رائپوری نور اللہ مرقدہٗ کا وصال ہوا- اور اس کے قرب وجوار میں بہت سی کوٹھیاں کاروباری تھیں جن میں ان انگریزوں کے کاروبار ہوتے تھے، اور ان میں مسلمان ملازم کام کیا کرتے تھے، اور وہ انگریز دلی، کلکتہ وغیرہ

بڑے شہروں میں رہتے تھے۔کبھی کبھی معاینہ کے طور پر آ کر اپنے کاروبار کو دیکھ جاتے تھے، ایک مرتبہ اس جنگل میں آگ لگی جو کبھی کبھی مختلف وجہوں سے لگتی رہتی تھی اور وہاں کے باغات اور جنگلات کو جلا دیتی تھی۔ایک دفعہ اس جنگل میں آگ لگی اور قریب قریب ساری کوٹھیاں جل گئیں۔ایک کوٹھی کا ملازم اپنے انگریز آقا کے پاس دلی بھاگا ہوا گیا اور جا کر واقعہ سنایا کہ حضور! سب کی کوٹھیاں جل گئیں اور آپ کی بھی جل گئی۔وہ انگریز کچھ لکھ رہا تھا، نہایت اطمینان سے لکھتا رہا، اس نے دھیان بھی نہیں دیا۔ملازم نے دوبارہ زور سے کہا: حضور! سب جل گیا۔اس نے دوسری مرتبہ بھی لاپرواہی سے جواب دے دیا کہ میری کوٹھی نہیں جلی، اور بے فکری سے لکھتا رہا۔ملازم نے جب تیسری مرتبہ کہا تو اس نے کہا کہ: میں مسلمانوں کے طریقے پر زکوٰۃ ادا کرتا ہوں، اس لئے میرے مال کو نقصان نہیں پہنچ سکتا۔وہ ملازم تو جواب دہی کے خوف سے بھاگا ہوا گیا تھا کہ صاحب کہیں گے کہ ہمیں خبر بھی نہیں کی، وہ انگریز کی اس لاپرواہی سے جواب کو سن کر واپس آ گیا اور دیکھا تو واقعتاً سب کوٹھیاں جل چکی تھیں، مگر اس انگریز کی کوٹھی باقی تھی۔

اللہ کی شان! کہ اسلامی احکام پر عمل کر کے غیر مسلم تو فائدہ اٹھاویں اور ہم لوگ زکوٰۃ ادا نہ کر کے اپنے مالوں کو نقصان پہنچاویں۔کہیں چوری ہو جاوے، کہیں ڈاکہ پڑ جاوے، کہیں کوئی اور آفت مسلط ہو جائے۔(آپ بیتی، ص:۸۸/ ج:۶)

اعلانِ جنگ

ایک اور آیت ہے:۔

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اسے چھوڑ دو، اگر ایمان والے ہو۔پھر اگر نہ کرو گے تو اشتہار سن لو جنگ کا اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی

طرف سے۔ اور اگر تم توبہ کرلو گے تو تمھیں تمہارے اصل اموال مل جائیں گے، نہ تم کسی پر ظلم کرنے پاؤ گے، نہ تم پر کوئی ظلم کرنے پائے گا۔

حضراتِ مفسرینؒ نے ان دونوں آیتوں کا شانِ نزول یہ لکھا ہے کہ ثقیف کے خاندان عمرو بن عمیر کے مخزومی خاندان بنو مغیرہ کے ذمے سودی قرض چلے آرہے تھے، انھوں نے سود کی حرمت کے بعد جب قرض کا سود کے ساتھ مطالبہ کیا تو بنو مغیرہ نے جواب دیا کہ اب مسلمان ہونے کے بعد ہم اپنے زمانۂ اسلام کی کمائی میں سے سود ادا نہیں کریں گے۔ دونوں خاندانوں کا معاملہ مکہ مکرمہ کے گورنر حضرت عتاب بن اسیدؓ کی عدالت میں آیا تو انھوں نے یہ قضیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں لکھ بھیجا۔ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں جنھیں لکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت عتابؓ کے پاس روانہ کردیا۔ قرآن مجید کی یہ دوٹوک تنبیہ سن کر بنو ثقیف کے لوگ کہنے لگے: ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرتے ہیں اور بچا ہوا سود چھوڑ دیتے ہیں، پس اس میں سے کچھ وصول نہ کیا۔

(ابن کثیر، ص: ۳۳۰ / ج: ۱)

ان دونوں آیتوں میں سود خوری پر دو سخت وعیدیں سنائی گئیں۔ ایک تو سود نہ چھوڑنے پر زمرۂ مومنین سے خارج ہونے کی وعید ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: ﴿وَأَطِيعُوا اللهَ وَرَسُولَهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ اس وعید کا خلاصہ یہ ہے کہ: اگر تم مؤمن ہو تو ایمان کا تقاضا پورا کرو اور اس جرم سے باز آجاؤ، ورنہ تمہارے دعوئ ایمان کا کوئی اعتبار نہیں۔ دوسری وعید سود نہ چھوڑنے کی صورت میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اعلانِ جنگ ہے۔ یہ سود خوری کے لئے سب سے بڑی اور آخری تنبیہ ہے کہ اس جرم سے باز آجاؤ؛ ورنہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف سے اعلانِ جنگ سن لو۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: قیامت کے روز سود خور سے کہا جائے گا کہ: ہتھیار بند ہو کر جنگ اور لڑائی کے لئے آمادہ ہو جا، پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ (ابن کثیر، ص: ۳۳۰/ ج:۱)

اور آپ ہی سے منقول ہے کہ: جو شخص سود خوری سے باز نہ آئے، تو حاکمِ مسلم پر فرض ہے کہ اول اسے توبہ کی تلقین کرے، اگر باز آجائے تو ٹھیک؛ ورنہ اس کی گردن اڑا دے۔ (حوالہ بالا)

سود خوروں پر اللہ کا غضب اور عذاب اتنا شدید ہے کہ قرآنِ کریم میں شرک کے بعد سود خوری کے سوا کسی بڑے سے بڑے گناہ پر اعلانِ جنگ نہیں فرمایا۔ اگر کسی سود خور کے دل میں ذرّہ برابر بھی آخرت کی فکر ہو؛ تو اسے جھنجھوڑنے کے لئے یہ وعید کافی ہے۔ احادیثِ مبارکہ میں کبائر کی ایک لمبی فہرست ملتی ہے، مگر کسی کبیرہ سے کبیرہ جرم پر بھی یہ وعید نہیں سنائی گئی۔

شرعی، معاشی، تمدنی، اخلاقی، انسانی نقطۂ نظر سے سنگین جرم

سود صرف شرعی نقطۂ نظر سے نہیں؛ بلکہ معاشی، تمدنی، اخلاقی، انسانی پہلو سے بھی ایک سنگین بدترین اور مہلک ترین جرم ہے۔ سود خور درحقیقت آدم خور درندہ ہے، بلکہ درندہ سے بھی مہلک تر۔ درندہ بھی اپنے ہم جنس درندے پر بہت کم ہاتھ ڈالتا ہے، مگر انسانی روپ میں یہ درندہ اپنی ہی برادری کا خون چوس چوس کر پلتا ہے۔

امام ابوعبداللہ قرطبیؒ نے ﴿فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ کے ذیل میں نقل کیا ہے کہ ایک شخص امام مالک بن انسؒ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا: میں نے شراب کا ایک ایسا رسیا اور نشے میں چور آدمی دیکھا جو چاند کو پکڑنے کی کوشش

کرر ہا تھا، اس پر میں نے کہا: اگر انسان کے پیٹ میں شراب سے بھی بدتر کوئی چیز اترنے والی ہوتو میری بیوی کو طلاق۔ آپ نے فرمایا: ابھی لوٹ جاؤ کہ میں تمہارے مسئلے میں غور کرلوں۔ وہ دوسرے دن آیا تو بھی فرمایا: ابھی لوٹ جاؤ، میں تمہارے مسئلے میں غور کرلوں۔ وہ تیسرے دن آیا تو فرمایا: تمہاری بیوی کو طلاق پڑ گئی۔ اس لئے کہ میں نے کتاب اللہ اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں انتہائی غور و تدبر کیا، مگر سود سے بدتر کوئی چیز نظر نہ آئی، اس لئے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن ۳/ ۳۶۴)

''يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبٰوا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ، وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ'' اے ایمان والو! سود مت کھاؤ کئی حصے زائد، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو؛ امید ہے کہ تم کامیاب ہو۔ اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

پہلی آیت میں تقویٰ کی تلقین کی گئی کہ اللہ کا خوف کھا کر سود سے باز آجاؤ۔ زمانۂ جاہلیت میں عام دستور تھا کہ مہاجن ایک متعین میعاد باندھ کر سود پر قرض دیتے تھے، میعاد گزرنے پر جب قرضدار قرض ادا کرنے کی سکت نہ پاتا تو مہاجن سود کی مقدار بڑھا کر آگے کے لئے مزید مہلت دے دیتا (جس کو ''چکرورتی سود'' کہتے ہیں) دوسری میعاد آنے پر بھی جب قرضدار ادا نہ کر پاتا تو سود اور بڑھا دیا جاتا، اس طرح وقت گزرنے کے ساتھ یہ سود دو چند در دو چند ہوتا جاتا۔ آیتِ بالا میں مسلمانوں کو ڈرایا گیا کہ اس انسانیت کش حرکت سے دور رہیں۔

''أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً'' کا یہ مطلب نہیں کہ سود صرف اسی صورت میں حرام ہے جب وہ دو چند در دو چند ہو۔ یہ قید احترازی نہیں، بلکہ واقعی ہے، یعنی زمانۂ جاہلیت

میں سود لینے دینے کا جو غیر انسانی طریقہ جاری تھا اس کی مذمت ہے، ورنہ سود کی تمام صورتوں کا حرام ہونا اوپر کی آیات میں گزر چکا۔

احادیث در بابِ سود

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: سات مہلک گناہوں سے بچو۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! وہ کون سے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات میں کسی کو شریک ٹھہرانا۔ جادو کرنا۔ ایسی جان کو ناحق قتل کرنا جس کا قتل اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا، مگر جائز طور پر بحکمِ شریعت۔ سود کھانا۔ یتیم کا مال کھانا۔ اللہ کے دشمنوں سے گھمسان کی جنگ میں پیٹھ پھیر کر بھاگنا۔ اور پاک دامن بے خبر مؤمنہ بیبیوں پر تہمت لگانا۔ (متفق علیہ)

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: رات میں نے خواب دیکھا کہ دو آدمی میرے پاس آئے اور مجھے ایک پاکیزہ سرزمین کی طرف لے گئے، ہم چلتے رہے یہاں تک خون کی ایک نہر پر پہنچے جس میں ایک آدمی کھڑا تھا اور نہر کے کنارے ایک اور آدمی کھڑا تھا جس کے سامنے پتھر پڑے تھے۔ جو آدمی نہر کے اندر تھا اس نے چلنا شروع کیا اور جب اس نے نہر سے نکلنا چاہا تو کنارے پر کھڑے شخص نے پتھر مار کر اسے اس کی پہلی جگہ کی طرف لوٹا دیا۔ اسی طرح وہ جب بھی نکلنے کی کوشش کرتا یہ اس کے منہ پر پتھر مار کر اس کی پہلی جگہ کی طرف لوٹا دیتا۔ میں نے پوچھا: یہ کون ہے؟ اس نے کہا: نہر کے اندر کا شخص۔ جس پر پتھر مارے جا رہے ہیں۔ سود خور ہے۔ (بخاری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے، سود کی تحریر لکھنے والے اور سود پر گواہ بننے والے پر لعنت بھیجی۔ اور فرمایا: یہ سب گناہ میں برابر کے

شریک ہیں۔ (سنن ابی داود، ترمذی)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: چار شخصوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لیا ہے کہ انہیں جنت میں داخل نہ کریں گے، نہ اس کی نعمتیں چکھائیں گے۔ (۱) شراب کا رسیا (۲) سود کھانے والا (۳) ناحق یتیم کا مال اُڑانے والا (۴) والدین کا نافرمان۔ (مستدرک، ص: ۳۷/ ج: ۲)

نبیٔ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: سود میں تہتر گناہ ہیں، جن میں ادنیٰ ترین گناہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص اپنی ماں سے بدکاری کرے، اور بدترین سود کسی مسلمان کی آبروریزی ہے۔ (حوالہ بالا)

حضرت عبداللہ بن سلام ؓ نے فرمایا: سود میں بہتّر گناہ ہیں جن میں سے ادنیٰ گناہ یہ ہے کہ کوئی آدمی حالتِ اسلام میں اپنی ماں سے بدکاری کرے۔ اور سود کا ایک درہم تینتیس (۳۳) بار زنا کرنے سے زیادہ برا ہے۔ مزید رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ہر نیک اور بد کو سیدھے طور کھڑا ہونے کا حکم فرمائیں گے سوائے سود خور کے؛ کہ وہ کھڑا نہیں ہو سکے گا مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے ایسا شخص جس کو شیطان خبطی بنا دے لپیٹ کر۔ (مصنف عبدالرزاق ۱۰/ ۴۶۱۔ شعب الایمان ۴/ ۳۹۲۔ الدرالمنثور ا/ ۳۶۴)

رسولِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے ناجائز طور پر کسی ظالم کی مدد کی تاکہ وہ کسی کا حق دبالے؛ تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی ذمہ داری سے نکل گیا یعنی دونوں اس سے بیزار اور بری ہیں۔ اور جس نے سود کا ایک درہم کھایا تو یہ تینتیس (۳۳) بار زنا کرنے کے برابر ہے، اور جس کا گوشت اور پوست حرام مال سے پیدا ہوا وہ جہنم میں جانے کا زیادہ حقدار ہے۔

(المعجم الصغیر للطبرانی ا/ ۱۴۷۔ والاوسط، شعب الایمان، ۴/ ۳۹۳۔ مجمع الزوائد ۴/ ۱۱۷)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سود کا ایک درہم جسے کوئی جانتے ہوئے استعمال کرے؛ چھتیس (۳۶) زنا سے بدتر ہے۔ (مسند احمد ۱۵/ ۶۹۔ مجمع الزوائد ۴/ ۱۱۷)

رسولِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس قوم میں زنا اور سود کا ظہور ہوا، اس قوم نے یقیناً اللہ تعالیٰ کا عذاب اپنی جانوں پر اُتار لیا۔ (مسند ابی یعلی ۵/ ۱۳۔ مجمع الزوائد ۴/ ۱۱۸)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: شبِ معراج میں جب ہم ساتویں آسمان پر پہنچے، تو میں نے اوپر کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو اچانک گرج، بجلی اور کڑک محسوس کی، آپ ﷺ نے فرمایا: ایک ایسی قوم پر میرا گزر ہوا جن کے پیٹ ایسے تھے جیسے بڑے بڑے کمرے اور مکان، جن میں سانپ بھرے ہوئے تھے جو پیٹوں کے باہر سے نظر آرہے تھے۔ میں نے پوچھا: جبرئیل! یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے بتایا: یہ سود خور ہیں۔ (مسند احمد ۲/ ۲۵۶۔ سنن ابن ماجہ، ص: ۱۶۴۔ مجمع الزوائد ۴/ ۱۱۷۔ تفسیر ابن کثیر ۱/ ۳۲۶)

آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے طویل خطبہ میں ارشاد فرمایا: سن لو! زمانۂ جاہلیت کی تمام رسمیں میرے قدموں تلے روند دی گئیں، اور زمانۂ جاہلیت کے خون (یعنی ان کے قصاص و دیت) ختم کردیئے گئے، سب سے پہلا قتل جسے میں معاف کرتا ہوں اپنے خاندان میں سے ربیعہ بن حارث کا قتل ہے جو قبیلۂ بنو سعد میں شیر خوار تھے اور انہیں قبیلۂ ہذیل نے قتل کردیا تھا۔ اور زمانۂ جاہلیت کے تمام سود بھی (پاؤں تلے) روند دیے گئے، اور سب سے پہلا سود جو میں چھوڑتا ہوں وہ (میرے چچا) حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کا سود ہے، وہ سب کا سب چھوڑ دیا گیا۔ (صحیح مسلم ۱/ ۳۹۷۔ مسند احمد ۲۱/ ۲۸۰)

رسول اللہ ﷺ نے اہلِ نجران کے لئے یہ تحریر لکھوائی:۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم! یہ وہ عہد نامہ ہے جو محمد رسول اللہ (ﷺ) نے اہلِ نجران

کے لئے لکھوایا۔ (الیٰ قولہٖ) نجران اور ان کے ملحقات کے لئے اللہ کی پناہ اور محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف سے حفاظت کی ذمہ داری ہے، ان جانوں کے لئے، ان کے مذہب کے لئے، ان کی اراضی و اموال اور ان کے غائب و حاضر کے لئے، اور ان کی برادری اور ان کی عبادت گاہوں کے لئے، اور اس بات کی ذمہ داری ہے کہ ان کے دین و مذہب اور حقوق میں سے کسی چیز میں تبدیلی نہ لائی جائے گی، اور ان اہلِ ذمہ میں سے جو آدمی سود کھائے گا تو اس سے (مذکورہ بالا تمام امور میں) مَیں بری الذمہ ہوں۔

قابلِ توجہ بات

ایک بات یاد رہے کہ اسلامی حکومت میں جو غیر مسلم رہ رہیں ہوں ان کو اپنے لیے شراب کا کاروبار کرنے کی اجازت ہے، خنزیر کھا سکتے ہیں، اس پر کوئی پابندی نہیں، لیکن سودی کاروباری کرنے کی ان کو بھی اجازت نہیں، اگر کوئی کرے گا تو اسلامی قانون کے مطابق معاف نہیں کیا جائے گا۔

معاشی نقصانات

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وعیدوں کے بعد سود خوری کی روحانی، اخلاقی اور معاشی تباہ کاریوں پر بھی مختصر سی نظر ڈالی جائے۔ جن اندھوں کو سود کی ظاہری چمک دمک نے خیرہ کر رکھا ہے، شاید ان سطور کو دیکھ کر ان میں سے کسی کی چشمِ بصیرت کھلے اور اسے نظر آجائے کہ یہ منقش سانپ اندر سے کس قدر زہریلا اور تباہ کن ہے۔

(۱) اس حقیقت سے کسی کو اختلاف نہیں کہ سود کی بنیاد خود غرضی، مفاد پرستی اور زر طلبی پر ہے، اس میں چند گنتی کے مہاجن، ساہوکار، بینک کار، بنی نوعِ آدم کا خون چوس

چوس کر پلتے ہیں۔ کوئی بتائے کہ جس نظام کا منتہائے مقصود چند افراد کا مفاد ہو، مفاد بھی ایسا جو پوری ملت کی معاشی موت سے وابستہ ہو، اس نظام میں انسانیت کی فلاح و بہبود کہاں سے آئے گی؟۔ اگر اس نظام سے وابستہ افراد میں ایثار وسخاوت، شرافت وانسانیت کا جوہر مٹ کر بالکل نابود ہوجائے، بلکہ اس نظام کے تحت پروان چڑھنے والا پورا معاشرہ ہی خود غرضی، دنیا طلبی اور آخرت سے بیزاری کا مخالف معاشرہ ہو؛ تو یہ تعجب کی بات نہیں۔

(۲) انسانی فطرت اور معاشی اصول کا تقاضا یہ ہے کہ کاروبارِ معاش میں شریک تمام افراد اس کے نفع ونقصان میں بھی یکساں شریک رہیں، اگر منافع ہوتو سب کے لئے، اور نقصان ہوتو سب کے سر پر۔ مگر سودخوروں کا قانون اس فطری اصول سے الگ تھلگ سب سے نرالا ہے کہ سرمایہ قرض دے کر اندیشۂ سود وزیاں سے بے نیاز ہوکر گھر میں بیٹھ جاتے ہیں، اب کاروبار میں نقصان ہوتو یہ پورا نقصان فقط ان کام کرنے والوں کے کھاتے میں آئے گا جو اپنے جسم وجان کی تمام صلاحیتیں اس پر کھپاتے رہے، اور نفع ہوتو اس میں اولین حصہ سودخوروں کا ہوگا۔

غرض کاروبار میں بچت ہو یا سراسر خسارہ؛ بلکہ اصل سرمایہ ہی ڈوب جائے اور بے چارے قرض داروں کی کری کرائی سب خاک میں مل جائے، مگر ان کے ساہوکاروں کو ان باتوں کا کوئی خرخشہ نہیں، انہیں بہر قیمت سود کی لگی بندھی رقم گھر بیٹھے ملتی رہنی چاہئے۔ کیا کہنے اس قساوت وشقاوت کے!۔

(۳) طمع ولالچ اور خود غرضی چوں کہ سودخوروں کے رگ وریشے میں رچ بس جاتی ہے، اس لئے وہ سرمایہ صرف انہی لوگوں کو دینا پسند کرتے ہیں جن سے سود زیادہ سے زیادہ ملنے کی امید ہو۔ کسی مسکین اور مفلوک الحال انسان کو قرضِ حسن تو کجا، کم شرح سود

پر قرض دینا بھی گوارا نہیں کرتے، خواہ وہ افلاس کے مارے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر ہی جائے۔

اسی طرح مصالحِ عامہ کے کاموں میں امداد یا قرض (گوکم شرح سود پر ہی ہو) دینا بھی ان کے اصولِ زر پرستی کے خلاف ہے۔ اس سنگدلانہ ذہنیت کے نتیجے میں سرمائے کا ایک بڑا حصہ صحیح مصارف میں لگنے کی بجائے غیر اہم اور غیر ضروری کاموں میں لگ جاتا ہے، جس سے ایک طرف تو معاشی توازن بگڑنے لگتا ہے، دوسری طرف زیادہ سے زیادہ شرح سود پر قرض لینے والے افراد کو یہ لعنت مجبور کرتی ہے کہ جائز اور ناجائز میں تمیز رَوا رکھے بغیر ہر طریقے سے اس سرمایہ کو استعمال کر کے شرح سود بھی بچالیں، اور مزید منافع بھی۔ اگر یہ معاملہ ملکی سطح پر ہو تو سود کی خباثت اور شر انگریزی پوری طرح عیاں ہو کر سامنے آتی ہے۔ کوئی مسکین ملک کسی سنگین بحران اور مالی مشکلات سے مجبور ہو کر ہی دوسرے ملک سے سودی قرض لیتا ہے، اس کی مالی حالات اس قابل بھی نہیں ہوتے کہ وہ اصل قرض کی قسط ادا کر سکے، مگر اس کے ساتھ سال بہ سال بھاری بھر کم سود بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔

مرے کو مارے شاہ مدار

اسے اس مصیبتِ عظمیٰ سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں دکھتی سوائے اس کے کہ وہ اپنے عوام پر طرح طرح کے ٹیکس لگائے، مہنگائی میں کمر توڑ اضافہ کرے، کرائے بڑھائے اور ہر حربہ بروئے کار لا کر اربوں کھربوں کی یہ رقم عوام کی جیب سے نکالے۔

غرض سود ایک ایسی لعنت ہے جو افراد و اقوام کی معیشت کے لیے غارتگر اور انسانی اقدار کے لیے سمِ قاتل ہے۔

(۴) بینکوں اور دوسرے مالی اداروں تک کسی مسکین و نادار بلکہ متوسط طبقہ

کے آدمی کی بھی رسائی ممکن نہیں، سرمایہ دار اور بڑے تاجروں سے قرض لےکر کاروبار چلاتے ہیں، انہیں اپنی حیثیت سے دس گنا قرض بھی بآسانی مل جاتا ہے، مگر کسی مسکین اور کم سرمایہ دار کے لیے قرض کی راہیں مسدود ہیں، یہ چند بڑی مچھلیاں قوم کی پوری معیشت پر چھائی رہتی ہے۔

اشیاءِ صَرف کے نرخ انہی کے رحم وکرم پر رہتے ہیں، جب ان کی مرضی میں آئے اشیاء کے نرخ بڑھاکر آسمان پر پہنچادیں اور جب چاہیں گراکر تحت الثریٰ تک لے آئیں اور عوام بے چارے تکتے رہیں، مارکٹوں میں آئے دن اس کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، ملکی معیشت پر اس کا جو اثر پڑتا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

(۵) جب دولت ہر طرف سے سمٹ کر چند ہاتھوں میں آجاتی ہے تو یہ مغرور لوگ اپنی دولت کے بل پر پسماندہ طبقہ کے جسم وجان، عزت وآبرو اور مال ومتاع غرض ہر چیز پر تسلط جمالیتے ہیں، انہیں غلام بناکر ان کی عزتوں تک سے کھیلتے ہیں ان کی پونجی لوٹ کر انہیں بے آبرو اور بھوکا ننگا کرکے چھوڑنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ جس ہلکان کاشتکار (کمزور کسان) نیم جان (بےبس) مزدور اور ٹٹ پونجیے[1] سوداگر (معمولی پونجی والے تاجر) کو یقین ہو کہ میری دن بھر کی محنت ومشقت کا ثمرہ (نفع) سموچا (سب کا سب) ساہوکار (سودخور) لے اُڑے گا اور میرے پاس بجز حسرت ویاس کچھ باقی نہ رہے گا، تو کیا یہ سوچنے میں وہ حق بجانب نہیں کہ دن بھر کی جانکاہی (جان کھپانے) سے کیا فائدہ؟ اگر یہ سوختہ نصیب جی ہار کر بیٹھ جائے، یا زندگی سے تنگ آکر خودکشی کرلے، یا ''تنگ آمد جنگ آمد'' کے مصداق چور، ڈاکو، اُچکا اور اُٹھائی گیرا بن جائے؛ تو یہ بات کچھ انہونی نہیں، بلکہ

(۱) جس کی پونجی ٹاٹ ہو۔

قرینِ قیاس ہے۔

اب سوچا جائے کہ مسکین اور متوسط طبقہ جو معاشی ڈھانچے کا اصل قِوام اور معاشرہ کا اکثریتی عنصر ہے، اس کا جذبۂ عمل سرد پڑ جانے سے قومی معیشت کس بری طرح متأثر ہوگی؟ لاکھوں افراد کے افلاس، بے روزگاری، ملکی صنعت، تجارت، زراعت ودیگر کاروبارِ زندگی کو کس حد تک مفلوج کردے گی؟ یہ حقیقت محتاجِ بیان نہیں۔

غرض! اس غیر فطری نظام میں اگر فائدہ ہے تو صرف چند ساہوکار سودخوروں کا، انہی کو یہ پالتا پوستا اور آگے بڑھاتا ہے، باقی تمام عاملین معاش کے لیے پیغامِ مرگ ہے۔ ان کی معیشت واقتصاد، عزت وناموس اور اخلاق وروحانیت غرض ہر چیز کا جنازہ نکال دیتا ہے۔

(٦) سودی کاروبار میں لوگوں کا اپنا سرمایہ نہیں ہوتا، یا نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے، جب اس مال پر من جانب اللہ محق کی افتاد پڑتی ہے اور سودخور پورے سرمایہ سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے تو وہ کبھی سنبھلنے کے قابل نہیں رہتا، ایک بار گرتا ہے تو گرتا ہی چلا جاتا ہے، نتیجہ یہ کہ اس کا اصل سرمایہ اگر کچھ تھا تو صرف وہی گیا اور بنک کا دیا ہوا پورا قرض ڈوب گیا، گویا سودخور کو جب تک نفع ملتا رہا تو وہ اپنی جیب بھرتا رہا، جب خسارہ ہوا تو وہ کُل کا کُل، یا اس کا اکثر حصہ قوم کے سَر آرہا۔ ’’تلك اذاً قسمة ضيزىٰ‘‘۔

یہ سود کے نقصانات اور تباہ کاریوں کا ایک سرسری جائزہ تھا۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں، ان معاشی اور اخلاقی نقصانات کو مدنظر رکھتے ہوئے قرآن وحدیث کی وعیدوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات کچھ محلِ تعجب نہیں رہتی کہ تمام کبیرہ گناہوں کی بنسبت اسی ایک گناہ پر اتنی سخت وعیدیں کیوں سنائی گئیں؟۔

منھ بولتی شہادتیں

یہ مضمون نامکمل رہے گا اگر سودخوروں کے عبرت آموز انجام کے چند واقعات درج کرکے ارشادِ الٰہی ''یَمْحَقُ اللہُ الرِّبٰوا'' (اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں) کی صداقت پر منھ بولتی شہادتیں نہ پیش کی جائیں۔ درجِ ذیل دو واقعے ایک ثقہ راوی نے بندے سے بیان کئے، دونوں واقعے اس کے سامنے گزرے ہیں:۔

(۱) فلاں شہر کا مشہور ترین زرگر جس کی اَن گنت دولت اور وسیع شہرت کے ناتے پورے شہر پر دھاک بیٹھی ہوئی تھی، بچے بچے کی زبان پر اس کا نام تھا، اس نے شہر کے ہندو زرگروں سے سودی لین دین شروع کیا تو یکلخت اس کی دولت وشہرت کو بھی گہن لگنا شروع ہوگیا، اس کی نرینہ اولاد نہ تھی، صرف دو لڑکیاں تھیں، دونوں کی شادیاں کیں، بڑا داماد بے دین، جواری اور اَوباش قسم کا لڑکا نکلا، جوئے، تاش اور شراب وشباب میں اس کی دولت لٹاتا رہا۔ آخر ایک روز نشے میں دھت ریل کے نیچے آکر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ کچھ دولت دوسرے داماد کے ہاتھ لگ گئی۔ سیٹھ صاحب جب تہی دست ہوگئے تو دونوں مکان بیچ کر شہر سے سینکڑوں میل دور ایک جگہ جا پڑے، اور وہیں حسرت کی موت مر گئے۔ ایک وقت تھا کہ پورے شہر میں ان کا طوطی بولتا تھا، مگر اب نام ونشان مٹ چکا۔

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں

(۲) اسی پیشے سے منسلک ایک بہت بڑا سیٹھ جو کروڑوں میں کھیلتا تھا، کام کی اتنی بہتات کہ ایک بار مَیں کسی کام سے اس کی دکان پر گیا تو تل دھرنے کی جگہ نہ تھی، کم وبیش بائیس تئیس کاریگر بیٹھے مصروفِ کار تھے، طویل رات جاگنے کے سبب سب کی

آنکھیں سرخ ہورہی تھیں، اسے بھی سودی کاروبار کی لت پڑی، جس کی نحوست سے ساری دولت گنوا کر کوڑی کوڑی کا محتاج ہوگیا۔ پوری جائیداد اسی لعنت کی نذر ہوگئی، ساٹھ پینسٹھ لاکھ کی کوٹھی قرض خواہوں کے دباؤ میں آکر اُونے پونے داموں میں بیچ دی۔ اسی طرح لاکھوں روپئے کی قیمتی زمینیں اور دکان بھی نیلام پر چڑھ گئیں۔ جب پوری جائیداد سے بھی قرض پورا نہ ہوا تو تنگ آکر خودکشی کی ٹھان لی۔ جب بار بار کی یہ کوشش بھی ناکام گئی تو قرض خواہوں کے خوف سے روپوش ہوگیا، اور اس خوف کے مارے بچیوں کی شادی تک میں شرکت نہ کی۔ اب بیرونِ ملک کسی جگہ سیاسی پناہ لے کر زندگی کے ایام پورے کررہا ہے۔ اس کا بھی کسی وقت پورے شہر میں ڈنکا تھا مگر اب:

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں

ایک درد بھری کہانی

ایک دوست نے بندہ کو اپنی درد بھری کہانی سنائی:

فلاں بیوپاری نے علاقے میں آکر اُدھار مال خریدا، میں نے قدیم تعلق اور اس کی دیانت داری کی شہرت کے سبب ضمانت اُٹھالی، قرض کی مدت گزرگئی، مگر وہ نہ آیا۔ طویل انتظار کے بعد اس کے گھر لاہور پہنچا، پتہ چلا کہ وہ دیوالیہ ہوچکا، اس لئے قرض خواہوں سے چھپ کر کراچی چلا گیا اور کسی جگہ محنت مزدوری کررہا ہے۔ میں وہاں پہنچا تو مجھ سے مزید مہلت طلب کی، اور طفل تسلیاں دے کر مجھے رخصت کردیا، آخر انتظار کرکر کے جب دوبارہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ لاہور چلا گیا ہے، میں وہاں پہنچا تو وہاں سے بھی غائب۔ قصہ کوتاہ کہ ایک لاکھ سے کچھ زائد قرض خواہوں کی رقم میرے سر آپڑی جو میں نے چاروناچار اپنی طرف سے ادا کردی۔

اس وقت بھی جب یہ سطور زیرِ تحریر ہیں وہ اس کے تعاقب میں کراچی گیا ہوا ہے۔ یہ کہانی سن کر بندہ کا دل بھر آیا اور اسے سمجھایا کہ اللہ کے بندہ! مالی معاملات میں بہت سوچ بچار سے کام لیا جاتا ہے۔ تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ اس زمانے میں کسی کی ذمہ داری اُٹھانا آپ اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے کی حماقت ہے۔ وہ بولا: اس سے میری بیس سال پرانی پہچان ہے، پہلے بھی میں اس کی ضمانت دیتا رہا، مگر آج تک اس نے وعدہ خلافی نہ کی تھی، بندہ نے بھی اس بیوپاری کی شہرت سن رکھی تھی، یہ باتیں سن کر مزید حیرت ہوئی کہ اتنے عرصے کے بعد اس پر کیسی اُفتاد پڑی۔ آخر ایک دوسری ملاقات کے دوران اس دوست نے بتلادیا کہ اس کے گھر جا کر حالات کے تتبع وتلاش سے معلوم ہوا کہ ظالم نے اس بار سود پر رقم لے کر کاروبار شروع کیا تھا۔

سودخور کی بہیمیت کے واقعات

سودخور مال وزر کی محبت میں ایسا مخبوط اور باؤلا ہوجاتا ہے کہ اسے کسی انسان کی جان ومال یا عزتِ نفس کا پاس ولحاظ نہیں رہتا، اسے کوئی چیز عزیز ہے تو اپنی غرض اور اپنا مفاد ہے خواہ کسی قیمت پر ہی حاصل ہو۔ سودخور کی بہیمیت کا اندازہ درجِ ذیل واقعات سے لگایا جاسکتا ہے۔

(۱) ایک مسکین شخص نے ساہوکار سے پانچ ہزار روپئے لئے، مگر افلاس وغریبی کے سبب ادائیگی نہ کرسکا۔ ساہوکار نے ایک تو سود پر سود لگانا شروع کردیا، دوسرے اسے بیوی بچوں سمیت غلام بنا کر بیگار لینا شروع کردی، ''بیک کرشمہ دوکار''۔ آخر ایک مدت کے بعد ساٹھ ہزار روپے دے کر اس کے پنجۂ ستم سے رہائی پائی۔

(۲) ایک مسکین نے ساہوکار سے کسی وقتی ضرورت کے تحت چند روپے لئے

جو بڑھتے چڑھتے کئی ہزار بن گئے، اس نے بھی مسکین کو چنگل میں پھنسا کر پورے گھرانے سمیت غلام بنالیا، دن بھر بیگار لینے کے بعد رات کو مردوں کو بیڑیاں لگادیتا، آخر آزادی کی صورت یہ نکلی کہ ساہوکار نے ایک قرض خواہ کے ہاتھ اسے پانچ ہزار میں فروخت کردیا، اس نے یہ قرض وصول کر کے اسے آزادی دی۔

(۳) ایک آدمی نے پانچ ہزار قرض لئے، اور چودہ ہزار دے کر خلاصی پائی۔

یہ تینوں واقعات ایک بزرگ عالمِ دین نے بندہ کو بتائے اور فرمایا:۔

سود کی لعنت اور وبال سے تباہ ہونے والے یہ لوگ ابھی زندہ ہیں، ان کے نام اور پتے بھی دیئے۔

علامہ کشمیریؒ کے خطبۂ صدارت کے اقتباسات

امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ نے ۱۹۲۷ء میں جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاس منعقدہ پشاور کی صدارت فرمائی، اور اس کے لئے ایک معرکۃ الآراء تاریخی خطبہ تحریر فرمایا۔ اس خطبۂ صدارت میں ۲۸؍عنوانات کے تحت ہندی مسلمانوں کو درپیش مسائل کا تذکرہ اور ہر مسئلے کا شریعت کی روشنی میں بہترین حل پیش کیا گیا ہے۔ اس خطبہ کے چند اقتباسات حضرت کے سوانح نگار اور فرزندِ ارجمند مولانا انظر شاہ صاحبؒ نے حضرت کی سوانح ''نقشِ دوام'' میں پیش کئے ہیں۔ ایک جگہ مولانا لکھتے ہیں:۔

''صاحبِ خطبہ نے ان مہلک رسوم پر طویل تحریر لکھی، اس کے بعد سودی کاروبار پر خاص توجہ فرمائی جس سے مسلمانوں کی اقتصادی حالت تباہ و برباد ہو کر رہ گئی ہے جیسا کہ سطورِ بالا میں گزرا، یہ سودی قرضے عام طور پر شادی بیاہ اور موت و پیدائش

کی غلط رسوم کی ادائیگی کے لیے لئے جاتے، اور اس طرح عمر بھر کے لیے ایک بے درمان مصیبت کو خرید لیا جاتا، اسلام میں چند گناہوں کو کبائر میں شمار کیا ہے اور جن کی سزا دخولِ جہنم کے سوا اور کچھ نہیں؛ ان میں ایک سودی کاروبار ہے۔

بہر حال! حضرت شاہ صاحبؒ نے صورتِ حال کی تباہی و بربادی پر توجہ دلاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

سود کی مثال جذام کے مرض جیسی ہے جو بڑھتا ہی جاتا ہے اور کم نہیں ہونے پاتا۔ حسبِ قواعدِ شرعیۂ محمدیہ ﷺ سود ایک لعنت ہے جو دینے والے، لینے والے، کھانے والے، کھلانے والے، اس پر گواہ بننے والے اور اس کی تحریر لکھنے والے پر مساوی تقسیم ہوتی ہے۔ یہ دنیا میں روحانی، اخلاقی جذام ہے، اور آخرت میں جہنم کا موجب ہے۔ بلکہ صاحبِ خطبہ نے بعض اسلامی ریاستوں کی تباہی کا سبب نصاریٰ سے بھاری بھاری رقمیں بطور سود لینا اور عدم ادائیگی کے نتیجہ میں ریاستوں کا ہاتھ سے نکل جانا قرار دیا ہے۔ مگر افسوس کہ امتِ محمدیہ ہی کے معاند طبقہ نے اپنے پیغمبرِ جلیل کی حکم عدولی کو اس شعبہ میں بھی ترک نہیں کیا۔

ہماری گردنوں کو پل نہ بنائیے

جس زمانہ میں سود کے جواز و عدم جواز کی بحث زور و شور پر تھی، حضرت شاہ صاحب کو پنجاب کے سفر میں لاہور قیام کرنا ہوا۔ لاہور کے علماء اور بڑے ذمہ دار لوگ بھی آپ کی آرام گاہ پر جمع تھے، جن میں اخبار ''زمیندار'' والا بھی تھا اور وہ سود کو مسلمانوں کے لیے فائدہ مند سمجھتا تھا۔ اس نے اس نیت سے شاہ صاحب سے ایک سوال کیا کہ جواز کی کوئی شکل بتائی جائے، حضرت شاہ صاحب نے ڈیڑھ دو گھنٹے سود کی

حرمت، اس کی ہلاکت و بلاانگیزیوں پر سیر حاصل گفتگو کی جو سائل کے بالکل خلاف پڑی۔ اس نے اُسلوب بدل کر پھر وہی سوال دُہرایا تو شاہ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں ارشاد فرمایا:- ''بھائی! ہم نے مسئلہ صاف کر دیا ہے، اب جس کو جہنم میں جانا ہو، چلا جائے لیکن ہماری گردنوں کو پل نہ بنائے۔''

عبرت انگیز واقعہ

علامہ رشید رضا نے ''المنار'' میں ایک عبرت انگیز واقعہ سود کے متعلق آیات کے تحت اپنے مشہور وطن ''مصر'' کا چشم دید لکھا ہے:-

ایک زاہد اور پاکباز مصری مالدار اپنی دولت سے غریبوں کی بھرپور مدد کرتے، کوئی قرض لیتا تو بے تکلف رقم دیتے، جس کی نہ کوئی تحریر ہوتی، نہ کتابت۔ مقروض خود ہی توجہ دلاتا کہ اطمینان کے لئے کچھ لکھ لیجئے، اس پر ان کا یہ جواب ہوتا کہ: بھائی! لوٹا کر دے دو گے تو تمہارا احسان۔ نہیں دو گے تو خدائے تعالیٰ احسن الجزاء عنایت فرمائیں گے۔ بہرحال میں تو نفع میں ہوں، پھر تحریر لکھ کر اپنے ثواب واجر کو کیوں کم کروں۔ حالات و مزاج نے رخ پلٹا تو یہی صاحب بدقسمتی سے سود لینے لگے، اور پھر وہ وقت آیا کہ اپنے بیٹے کو بھی رقم دی تو سود ہی پر دی۔

چند واقعات

ہمارے اس ہندوستان میں مہاجنی استبداد اور سودی کاروبار نے لاکھوں انسانوں کو تباہ کیا، اس کی ایک مختصر سی تفصیل یہ ہے کہ:

یوپی کے مشہور شہر ''گورکھپور'' میں ایک صاحب نے مہاجن سے دس ہزار

روپے سود پر لئے۔ چار سال کے عرصہ میں پچاس ہزار سود کے نام سے ادا کرنے کے باوجود اصلی رقم کی ادائیگی بدستور قائم رہی۔

شہر ''گیا'' میں ایک اسکول کے ٹیچر نے پندرہ برس پہلے پانچ سو روپئے سود پر لئے، ماہانہ مسلسل ادائیگی کے باوجود جب کہ وہ اصل رقم سے بہتّر گنی یعنی ۳۶/ ہزار روپے دے چکا ہے، لیکن پھر بھی اصل رقم کی ادائیگی ابھی باقی ہے۔

کانپور اور صنعتی شہروں میں فیکٹری کے ملازم جو مہاجنوں کی گرفت میں مبتلا ہیں، ان کا تناسب ستّر فیصدی ہے۔ ان کی تنخواہیں مہاجن وصول کرتے ہیں اور ان غریب مزدوروں کو ایک کوڑی بھی مشاہرہ سے نہیں ملتی۔

جو بربریت، درندگی اور بہیمیت سود خور میں پیدا ہوتی ہے اس کا تازہ المیہ ''جاسنالہ'' میں اس طور پر پیش آیا کہ حال ہی میں اس شہر کی کوئلہ کی کان میں سینکڑوں مزدور پانی بھر جانے کی وجہ سے غرق ہو گئے۔ حکومت نے بطور امداد رقم دی جسے اوپر ہی اوپر مہاجنوں نے وصول کر لی، اور پسماندگان کو انسانوں کی موت کے ساتھ اس امداد کو بھی بطورِ حسرت دیکھنا پڑا جو حکومت نے پیش کی تھی۔

ان چند واقعات سے معلوم ہوگا کہ اسلام کی نظر اِس مہاجنی نظام کی ہلاکت انگیزیوں پر کس قدر دقیق اور دُور رَس تھی کہ اس نے اسلامی معاشرہ میں سود کے لئے کوئی خفی جلی گنجائش باقی نہیں چھوڑی۔

مظلوم طبقے کی آہ و بکا پر حکومتیں متوجہ ہوئیں تو زیادہ سے زیادہ شرح سود کم کرنے کی طرف رخ کیا، لیکن سرے سے اس کی ممانعت یا اس ملعون پیشے پر مکمل پابندی بجز اسلام کے اور کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ متعصب دنیا اسلامی قوانین کی خوبیوں اور فلاحی اسکیموں سے فائدہ اٹھانے کے لئے تیار نہیں۔

باب تحریم الریاء

قَالَ اللہ تَعَالَی: وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِیَعْبُدُوا اللہَ مُخْلِصِینَ لَہُ الدِّینَ حُنَفَاءَ.
(البینۃ:۵)

وقال تَعَالَی: لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَی کَالَّذِی یُنْفِقُ مَالَہُ رِئَاءَ النَّاسِ (البقرۃ:۲۶۴)

وقال تَعَالَی: یُرَاءُونَ النَّاسَ وَلَا یَذْکُرُونَ اللہَ إِلَّا قَلِیلاً (النساء:۱۴۲)

باب کا عنوان

نیا عنوان قائم کیا ہے: دکھلاوا اور شہرت کے واسطے کسی عمل کا حرام ہونا۔

اعمالِ خیر، عبادات اور نیکی کے کام جو اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی اور قرب حاصل کرنے کے لیے کرنے چاہئیں، ان کو انجام دے کر کوئی آدمی لوگوں کے دلوں میں اپنی عزت اور قدر ومنزلت پیدا کرنا چاہے، اور یوں سوچے کہ جب لوگ مجھے اس طرح کرتا ہوا دیکھیں گے تو ان کے دل میں میرے واسطے عزت پیدا ہوگی، میری قدرو منزلت اور میری عظمت کا خیال قائم ہوگا، اور اس کے ذریعہ میں ان سے مالی یا جاہی فائدہ حاصل کرسکوں گا؛ یہی ریاء کہلاتا ہے، جیسے: نماز اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے پڑھنی چاہیے، مال خرچ کرنا اور صدقہ دینا اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے واسطے ہونا چاہیے، حج کی ادائیگی اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لیے ہونی چاہیے، علمِ دین حاصل کرنا اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لیے ہونا چاہیے۔ اگر کوئی آدمی نماز اس لیے پڑھتا ہے کہ مجھے نماز پڑھتا ہوا دیکھ کر لوگ سمجھیں گے کہ بڑا عبادت گزار ہے، اور ان کے دلوں میں میرے

واسطے مقام پیدا ہوگا، ان کے نزدیک میری قدرومنزلت بڑھ جائے گی، اور میری عزت کریں گے، مجھے ان سے اعزاز وتکریم کا فائدہ پہنچے گا۔

باریک فرق

اور اگر وہ کام عبادات اور اعمالِ خیر کے قبیل سے نہیں ہے اور اس میں کسی نے ایسی کوئی نیت کرلی، مثلاً: کوئی آدمی دنیوی علوم (انجینئرنگ، ڈاکٹری، وکالت وغیرہ) اس لیے پڑھتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ مال حاصل کرے، اور لوگ اس کو بڑا ڈاکٹر، بڑا انجینئر سمجھنے لگیں۔ ڈاکٹر اور انجینئر بننے کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں مقام ومرتبہ پیدا ہو؛ تو اس کو ریاء نہیں کہیں گے۔

لہٰذا یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ ریاء کا تعلق انہیں اعمال کے ساتھ ہے جو خالص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے کیے جانے چاہئیں اور ان میں اس کے بجائے دوسری نیتیں کرلی جائیں تو اس صورت میں ریاء کا تحقق ہوتا ہے۔

پہلی آیت

پہلی آیت کا تعلق عبادات ہی سے ہے اس لیے یہاں پیش کی ہے:

﴿وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَآءَ (البينة:۵)﴾ جو آدمی سب سے کٹ کر صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف متوجہ ہوجائے؛ ایسے آدمی کو حنیف کہتے ہیں۔ یہ آیت شروع کتاب میں اخلاص کے بیان میں گزرچکی ہے، اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب کو سب سے کٹ کر خالص اپنی خوشنودی کی نیت کرتے ہوئے اپنی ہی طرف متوجہ ہوکر عبادت کرنے کا حکم دیا تھا۔ یعنی آدمی پورے طور پر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف

متوجہ ہو، اوراسی کی خوشنودی وقرب حاصل کرنے اور صرف اسی کو راضی کرنے کے لیے عبادت کرے اور دل میں دور دور تک کسی دوسرے کا خیال نہ ہو۔ اس آیت میں ''حُنَفَآءَ'' کا لفظ اسی لیے لائے ہیں کہ کسی کی طرف کوئی توجہ باقی نہیں رہنی چاہیے۔

اپنے صدقات کوضائع وباطل مت کرو

﴿لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَى كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ﴾ اپنے صدقات اور اللہ کے راستہ میں جو مال خرچ کیا جاتا ہے اس کو احسان جتلا کر اور جس کو صدقہ دیا ہے اس کو ایذاء پہنچا کر (یا کوئی اور طریقہ اختیار کر کے) ضائع اور برباد مت کردو، اور جو آدمی لوگوں کو دکھانے کے لیے مال خرچ کرتا ہے وہ بھی اپنے صدقہ کو ضائع اور باطل ہی کرتا ہے۔ معلوم ہوا کہ جو بھی نیک کام لوگوں کو دکھانے کے لیے کیا جائے گا وہ بے کار اور باطل ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر کوئی اجر وثواب نہیں ملے گا۔

منافقین کا حال

﴿يُرَآءُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللهَ إِلَّا قَلِيلًا﴾ منافقین کا حال بیان کیا گیا ہے کہ جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو کاہلی اور سستی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔ یہاں اعتقادی کاہلی مراد ہے، یعنی نماز کی ادائیگی کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ پر جو اعتقاد ہونا چاہیے وہ ان کے اندر نہیں پایا جاتا، اعتقاد کی اسی کمزوری کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس عبادت کی ادائیگی کے لیے جو مستعدی پائی جانی چاہیے وہ ان میں نہیں پائی جاتی۔ کسی بھی عمل پر ملنے والے اجر وثواب اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے یہاں حاصل ہونے والے قرب ودرجات پر آدمی کو جب مکمل اعتقاد نہیں ہوتا تو اس عمل

کے لئے آدمی کے اندر جو جذبہ بیدار ہونا چاہیے، اور اس عمل کو انجام دینے کے لیے جو نشاط پیدا ہونا چاہیے اور اس کام میں جو قوت آنی چاہیے؛ وہ نہیں آتی۔ اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ آدمی اگر کہیں سفر کر کے آیا ہو اور تھکن کی وجہ سے بدن میں کچھ کاہلی اور سستی محسوس ہو وہ اس میں داخل نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہاں عقیدے میں تو پختگی پائی جاتی ہے، مگر جسمانی کمزوری اور تھکاوٹ کی وجہ سے فطری کاہلی و سستی پائی جارہی ہے۔

باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ منافقین کا حال یہ ہے کہ چاہے وہ سفر کر کے آئے ہوں یا نہ آئے ہوں، ان کا جسم تعب و تھکن میں مبتلا ہو یا نہ ہو؛ جب بھی وہ عبادت کے لیے اٹھیں گے تو سستی و کمزوری کے ساتھ ہی اس میں مشغول ہوں گے، اس لیے کہ ان کے دلوں میں اعتقاد کی جو پختگی ہونی چاہیے وہ پائی ہی نہیں جاتی۔ اور پھر کمال تو یہ ہے کہ جب وہ ایسی عبادت بھی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں کرتے بلکہ تو لوگوں کو دکھانے کے لیے کرتے ہیں۔ اب جس کی عبادت کا حال ایسا ہو تو پھر اس میں جتنا ذکر اللہ ہونا چاہیے وہ بھی نہیں ہوتا، بلکہ دکھانے کے واسطے برائے نام ہی ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو کام لوگوں کی نگاہوں میں آتا ہے اس کو تو کرتے ہیں، اور جو نگاہوں میں نہیں آتا اس کو انجام نہیں دیتے۔ بہر حال! یہاں تو ریاء اور دکھلاوے کے لیے کوئی کام کیا جائے اس کا حرام ہونا بتلانا چاہتے ہیں۔

تمام شریکوں میں سب سے زیادہ مستغنی

۱۶۱۶:-وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال: سَمِعْتُ رسولَ الله ﷺ يقولُ: ((قَالَ الله تَعَالَى: أَنَا أَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ، مَنْ عَمِلَ عَمَلاً أَشْرَكَ فِيهِ مَعِي غَيْرِي تَرَكْتُهُ وَشِرْكَهُ)). (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ باری تعالیٰ نے فرمایا: مَیں تمام شریکوں میں شرکت سے سب سے زیادہ مستغنی ہوں۔ جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس میں میرے ساتھ دوسرے کسی کو بھی شریک کرلیا؛ تو میں اس کو اور اس کے شریک کو چھوڑ دیتا ہوں۔

افادات:- جب کوئی کام شراکت (پارٹنرشپ) میں کیا جاتا ہے تو ہر شریک اپنا حصہ پورا پورا وصول کرنے کا اہتمام کرتا ہے، لیکن باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھے تو پارٹنرشپ منظور ہی نہیں، اگر کوئی آدمی کسی عمل میں میرے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کرلیتا ہے، حالاں کہ وہ صرف میرے لیے ہی کیا جانا چاہیے، تو میں کہہ دیتا ہوں کہ ایسا عمل مجھے نہیں چاہیے جس کو شریک کیا ہے اسی کو دے دو۔ میں تو صرف اسی عمل کو قبول کرتا ہوں جو خالص میرے لیے کیا جائے اور اس میں کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ دنیا والوں کا حال تو یہ ہے کہ پارٹنرشپ میں کیے جانے والے کام کو بھی گوارا کرلیتے ہیں اور اس میں سے اپنا حصہ وصول کرلیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھے پارٹنرشپ گوارا ہی نہیں، میں تو تمام شریکوں میں سب سے زیادہ مستغنی ہوں، اسی لیے شرکت والا عمل میرے یہاں قبول ہی نہیں ہوتا، ایسا عمل تو میں اسی کو دے دیتا ہوں۔

اس روایت میں ریاء کا تذکرہ نہیں ہے، لیکن اس روایت کو یہاں لاکر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ ریاء بھی شرک کی ہی ایک قسم ہے۔ اسی لیے لکھا ہے کہ ایک تو شرک جلی ہوتا ہے کہ کوئی عبادت باقاعدہ اس انداز سے کی جائے کہ عبادت ہی میں اللہ کے ساتھ دوسرے کو شریک ٹھہرایا جائے؛ اس سے تو آدمی اسلام اور ایمان سے ہی نکل جاتا ہے۔ لیکن اگر کسی کے عقیدے میں تو ایسا نہیں ہے، البتہ عمل کرتے ہوئے دوسرے آدمی کو خوش کرنا پیشِ نظر ہوتا ہے، یا دوسرے آدمی کی نگاہوں میں اپنی بڑائی یا عظمت ثابت

کرنا مقصود ہوتا ہے؛ تو اسے ریاء اور دکھلاوا کہتے ہیں، یہ بھی پوشیدہ اور خفی قسم کا شرک ہی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کسی بھی ایسے عمل کو جس میں ریاء کاری ہو قبول ہی نہیں کرتے۔

بعد میں ریاء شامل ہوگئی تو

ایک بات یہ بھی ہے کہ کسی نے کوئی عمل خالص ریاء اور دکھلاوے کے لیے ہی کیا ہے، تب تو ظاہر ہے کہ وہ عمل قبول نہیں کیا جائے گا، لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جب عمل کیا تب تو اللہ تعالیٰ کے واسطے ہی تھا، بعد میں اس میں ریاء شامل ہوگئی؛ تو کیا ایسا عمل قبول ہوگا یا نہیں؟

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس صورت میں بھی قبول نہیں ہوگا۔ اور بعض فرماتے ہیں کہ دیکھا جائے گا کہ دونوں پہلو برابر ہیں یا نہیں، اگر اللہ تعالیٰ کے لیے کیے جانے کی نیت غالب ہے تو قبول ہے، اور دوسرا پہلو غالب ہے تو قبول نہیں۔ مثلاً: بعضوں کا حال ایسا ہوتا ہے کہ اگر کوئی دیکھ رہا ہو تب تو نماز پڑھیں گے، اور اگر کوئی نہیں دیکھتا تو نہیں پڑھیں گے؛ تو یہ عمل ایسا ہوا جس میں ریاکاری ہی ہوئی، یہاں نفسِ عمل ہی دکھانے کے واسطے کیا گیا۔

اور بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ کوئی دیکھے یا نہ دیکھے، نماز تو پڑھیں گے، ہاں! اتنا ہے کہ اگر کوئی دیکھ رہا ہو تو ذرا خشوع وخضوع کا اظہار کریں گے اور رکوع وسجود بھی لمبا کریں گے، اور کسی کے نہ دیکھنے کی صورت میں جلد بازی میں بغیر کسی اہتمام کے پڑھیں گے۔ لہٰذا جو آدمی ایسا ہے کہ نماز تو نہیں چھوڑتا، لیکن کسی کے دیکھنے کی وجہ سے خشوع وخضوع اور دوسری صفات میں خوبی پیدا کرنے کا اہتمام کرتا ہے؛ تو یہ بھی ریا ہی میں داخل ہے، لیکن اس کے نفسِ عمل کا اجر ضائع اور برباد نہیں ہوگا، البتہ ان کیفیات پر

جو ثواب مرتب ہونا چاہیے اس میں کمی آجائے گی۔

لینے کے دینے پڑ گئے

۱۶۱۷:-وعنه قَالَ: سَمِعْتُ رسول الله ﷺ يقول: ((إِنَّ أَوَّلَ النَّاسِ يُقْضَى يَومَ القِيَامَةِ عَلَيْهِ رَجُلٌ اسْتُشْهِدَ، فَأُتِيَ بِهِ، فَعَرَّفَهُ نِعْمَتَهُ، فَعَرَفَهَا، قَالَ: فَمَا عَمِلْتَ فِيهَا؟ قَالَ: قَاتَلْتُ فِيكَ حَتَّى اسْتُشْهِدْتُ. قَالَ: كَذَبْتَ، وَلَكِنَّكَ قَاتَلْتَ لأَنْ يُقَالَ: جَرِيءٌ! فَقَدْ قِيلَ، ثُمَّ أُمِرَ بِهِ فَسُحِبَ عَلَى وَجْهِهِ حَتَّى أُلْقِيَ في النَّارِ.

وَرَجُلٌ تَعَلَّمَ العِلْمَ وَعَلَّمَهُ، وَقَرَأَ القُرآنَ، فَأُتِيَ بِهِ فَعَرَّفَهُ نِعَمَهُ فَعَرَفَهَا. قَالَ: فَمَا عَمِلْتَ فِيهَا؟ قَالَ: تَعَلَّمْتُ العِلْمَ وَعَلَّمْتُهُ، وَقَرَأْتُ فِيكَ القُرآنَ، قَالَ: كَذَبْتَ، ولكِنَّكَ تَعَلَّمْتَ لِيُقَالَ: عَالِمٌ! وَقَرَأْتَ القُرْآنَ لِيُقَالَ: هُوَ قَارِئٌ، فَقَدْ قِيلَ، ثُمَّ أُمِرَ بِهِ، فَسُحِبَ عَلَى وَجْهِهِ حَتَّى أُلْقِيَ في النَّارِ.

وَرَجُلٌ وَسَّعَ اللهُ عَلَيْهِ، وَأَعْطَاهُ مِنْ أَصْنَافِ المَالِ، فَأُتِيَ بِهِ فَعَرَّفَهُ نِعَمَهُ، فَعَرَفَهَا. قَالَ: فَمَا عَمِلْتَ فِيهَا؟ قَالَ: مَا تَرَكْتُ مِنْ سَبيلٍ تُحِبُّ أَنْ يُنْفَقَ فِيهَا إِلاَّ أَنْفَقْتُ فِيهَا لَكَ. قَالَ: كَذَبْتَ، ولكِنَّكَ فَعَلْتَ لِيُقَالَ: جَوَادٌ! فَقَدْ قِيلَ، ثُمَّ أُمِرَ بِهِ فَسُحِبَ عَلَى وَجْهِهِ حَتَّى أُلْقِيَ في النَّارِ)). (رواه مسلم)

((جَرِيءٌ)) بفتح الجيم و كسر الراء والمد: أيْ شُجَاعٌ حَاذِقٌ.

ترجمہ مع تشریح: -یہ روایت مسلم شریف اور دوسری کتبِ حدیث میں بھی موجود ہے کہ ایک تابعی حضرت ابو ہریرہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت وہ درس دے رہے تھے، جب وہ فارغ ہوئے اور سب لوگ چلے گئے تو انہوں نے حضرت

ابوہریرہؓ سے پوچھا: آپ نے کوئی حدیث جو نبیٔ کریم ﷺ سے سنی اور سمجھی ہو اور آپ کو خوب یاد بھی ہو؛ وہ بیان کیجیے۔ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا: میں نے نبیٔ کریم ﷺ سے جو روایت سنی ہے، سیکھی ہے، اور خوب سمجھی ہے، وہی میں تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں، یہ کہہ کر ان پر غشی طاری ہوگئی اور وہ بے ہوش ہو گئے، جب ہوش میں آئے تو پھر دوبارہ یہی جملہ کہا، پھر بے ہوش ہو گئے، کچھ دیر تک بے ہوش رہے، پھر ہوش میں آئے اور یہی جملہ کہا پھر بے ہوش ہو گئے، اور دیر تک بے ہوش رہے، ہم نے ان کو سہارا دے کر اُٹھایا اور ہوش میں آئے تو دیر تک روتے رہے، پھر یہ روایت بیان کی کہ:

میں نے نبیٔ کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: قیامت کے روز تمام لوگوں میں سب سے پہلے جس کا فیصلہ کیا جائے گا اور جس کو اللہ تعالیٰ کے حضور میں فیصلہ کے لیے لایا جائے گا وہ آدمی ہوگا جو اللہ کے راستہ میں شہید کیا گیا تھا، پھر اس کو جو نعمتیں اور صلاحتیں عطا فرمائی تھیں، اللہ تعالیٰ وہ سب اس کے سامنے گنوائیں گے (کہ میں نے تجھے یہ یہ نعمتیں دی تھیں، تجھے یاد ہے؟) وہ اقرار کرے گا (کہ ہاں! باری تعالیٰ! آپ نے مجھے یہ نعمتیں عطا فرمائی تھیں) باری تعالیٰ کی طرف سے پھر سوال ہوگا: میری ان نعمتوں میں تو نے کیا عمل کیا، اور اس کا کیا حق ادا کیا؟ وہ عرض کرے گا: باری تعالیٰ! میں نے آپ کے راستہ میں قتال کیا، یہاں تک کہ میں شہید کر دیا گیا۔ باری تعالیٰ کی طرف سے جواب میں کہا جائے گا: تو نے غلط بات کہی، بلکہ تو نے قتال اس لیے کیا تھا تا کہ لوگ کہیں کہ بڑا بہادر ہے اور تیری تمنا پوری ہوگئی (تیرے مرنے اور شہید ہونے کے بعد لوگوں نے تیری بہادری کی بڑی تعریفیں کیں) پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا جائے گا اور اس کو چہرے کے بل کھینچ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

دوسرا آدمی وہ ہوگا جس نے علمِ دین سیکھا اور لوگوں کو سکھلایا، اس کو باری تعالیٰ کے حضور

پیش کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ اس کو بھی اپنی نعمتیں یاد دلائیں گے (کہ تجھے یاد ہے میں نے تجھے علمِ دین عطا کیا تھا، تونے پڑھا پڑھایا) اس کو یاد آجائے گا وہ اس کا اقرار کرے گا۔ باری تعالیٰ کی طرف سے پوچھا جائے گا کہ تونے اس میں کیا عمل کیا اور میری ان نعمتوں کا کیا حق ادا کیا؟ وہ عرض کرے گا: باری تعالیٰ! میں نے علمِ دین سیکھا پھر لوگوں کو خوب سکھایا، اور میں نے تیرے لیے قرآن سیکھا اور سکھایا۔ باری تعالیٰ کی طرف سے جواب میں کہا جائے گا: تو جھوٹ بولتا ہے، تو نے علم اس لیے سیکھا تھا تاکہ لوگ کہیں کہ بہت بڑا عالم ہے (بڑے مولوی صاحب ہیں، بڑے اچھے مقرر ہیں، اپنے فن کے بڑے ماہر ہیں، لوگوں سے واہ واہ حاصل کرنے کے لیے تونے یہ سارا کارنامہ انجام دیا تھا) اور قرآنِ پاک اس لیے پڑھا تھا تاکہ لوگوں میں کہا جائے کہ بڑا اچھا قاری ہے، تونے جس مقصد کے لیے یہ کام کیا تھا وہ مقصد حاصل ہو چکا (لوگوں میں تیرے علم کا اور تیرے قاری ہونے کا چرچا ہو گیا) پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے متعلق بھی حکم کیا جائے گا اور وہ اوندھے منھ کھینچ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

تیسرے آدمی کو لایا جائے گا جس کو اللہ تعالیٰ نے مالی اعتبار سے خوب وسعت عطا فرمائی تھی اور ہر قسم کا مال اس کو دے رکھا تھا، اللہ تعالیٰ اس کو اپنی نعمتیں یاد دلائیں گے کہ میں نے تجھے یہ یہ نعمتیں دی تھیں، وہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کو پہچان لے گا اور اقرار کرے گا۔ باری تعالیٰ کی طرف سے پوچھا جائے گا: تونے اس میں کیا عمل کیا اور اس کا کیا حق ادا کیا؟ وہ عرض کرے گا: باری تعالیٰ! تیرے راستہ میں خرچ کرنے کی جو شکل بھی تجھے پسندیدہ تھی وہ میں نے نہیں چھوڑی (یعنی ہر جگہ خرچ کیا) اور یہ سب تیرے واسطے کیا (مسجد اور مدرسہ میں دیا، مسافر خانہ بنوایا، اور فلاں فلاں جگہ خوب خرچ کیا) باری تعالیٰ کی طرف سے کہا جائے گا: تو غلط بولتا ہے، یہ سب تونے اس لیے کیا تھا تاکہ لوگ کہیں کہ بڑا سخی ہے (نام آوری، شہرت اور دکھلاوے کے لیے کیا تھا) سو

کہا جا چکا (لوگوں نے تیری واہ واہ کرلی) پھر اس کے متعلق بھی حکم ہوگا اور اس کو بھی منہ کے بل کھینچ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

افادات:- اللہ کے راستہ میں جہاد اور قتال میں اپنی جان دے دینا، قرآن کریم کا پڑھنا پڑھانا، سیکھنا سکھانا، نیکی کے کاموں میں مال خرچ کرنا؛ یہ سارے بڑے بڑے اعمال ہیں، لیکن دکھلاوے اور شہرت کے لیے کیے گئے تھے، اس لیے اتنا ہی نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ اعمال ضائع ہو گئے اور ان پر کوئی اجر نہیں ملا، بلکہ وہی اعمال جہنم میں جانے کا ذریعہ بنے۔ اگر صرف ضائع ہو جاتے تب بھی سودا سستا تھا لیکن انہیں اعمال کے نتیجہ میں جہنم میں جانے کی نوبت آ گئی، گویا لینے کے دینے پڑ گئے۔

ظاہر میں کچھ، باطن میں کچھ

۱۶۱۸:- وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما: أن ناساً قالوا له: إنا ندخل على سلاطيننا فنقول لهم بخلاف ما نتكلم إذا خرجنا من عندهم؟ قال ابن عمر رضی اللہ عنہما: كنا نعد هذا نفاقاً على عهد رسول الله ﷺ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے منقول ہے کہ کچھ لوگوں نے ان سے کہا: ہم لوگ جب اپنے حکمرانوں کے پاس جاتے ہیں تو (ان کو خوش کرنے کے لیے) ان کے سامنے کچھ باتیں کرتے ہیں اور جب ان کے پاس سے باہر آتے ہیں تو اس کے خلاف باتیں کرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جواب میں فرمایا: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں ہم لوگ اس طریقۂ کار کو نفاق قرار دیتے تھے (کہ ظاہر میں کچھ ہو اور باطن میں کچھ اور ہو)۔

جیسی کرنی ویسی بھرنی

۱۶۱۹:- وعن جندب بن عبد الله بن سفيان - رضي الله عنه - قال:

قَالَ النبیُّ ﷺ: ((مَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللهُ بِهِ، وَمَنْ يُرائِي يُرائِي اللهُ بِهِ)).

(متفق عَلَيْهِ. ورواه مسلم أيضاً من رواية ابن عباس رضي الله عنهما)

((سَمَّعَ)) بتشديد الميم، ومعناه: أظهر عمله للناس رِياءً. ((سَمَّعَ اللهُ بِهِ)) أيْ: فَضَحَهُ يَومَ القِيَامَةِ. ومعنى: ((مَنْ رَاءى)) أيْ: مَنْ أظْهَرَ لِلنَّاسِ العَمَلَ الصَّالِحَ لِيَعْظُمَ عِنْدَهُمْ. ((رَاءى اللهُ بِهِ)) أيْ: أظْهَرَ سَرِيرَتَهُ عَلَى رُؤُوسِ الخَلائِقِ.

ترجمہ:- حضرت جندب بن عبد اللہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی شہرت کے لیے کرے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو شہرت دیں گے، اور جو دکھلاوے کے لیے کرے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو دکھلائیں گے۔

افادات:- ’’سَمَّعَ‘‘ اور ’’يُرَائِي‘‘ کا مطلب کیا ہے؟ تو علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جو آدمی اپنے اعمال کو دکھلاوے اور شہرت کے واسطے لوگوں کے سامنے ظاہر کرے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو مشہور کریں گے، یعنی قیامت کے دن رسوا کریں گے کہ لوگوں کے سامنے اعلان کیا جائے گا کہ اس نے فلاں عمل شہرت اور نام آوری کے لیے کیا تھا۔ گویا اس دن سب کے سامنے رسوائی ہوگی۔

اور جس نے اپنے نیک عمل کو لوگوں کے سامنے اس لیے ظاہر کیا کہ لوگوں کی نگاہوں میں عزت ملے اور مرتبہ بڑھے؛ تو قیامت کے روز تمام لوگوں کے سامنے اس کی اس بد نیتی کو ظاہر کریں گے، اور دنیا میں دکھلاوے کے لیے جو عمل کیا تھا، اس کا اعلان قیامت کے روز سب کے درمیان میں کریں گے۔

جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا

۱۶۲۰:- وعن أبي هريرة -رضي الله عنه- قَالَ: قَالَ رسول الله ﷺ: ((مَنْ تَعَلَّمَ

عِلْماً مِمَّا يُبْتَغَى بِهِ وَجْهُ اللهِ- عزوجل- لَا يَتَعَلَّمُهُ إِلَّا لِيُصِيبَ بِهِ عَرَضاً مِنَ الدُّنْيَا ،لَمْ يَجِدْ عَرْفَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) يَعْنِي : رِيحَهَا. (رواہ أبو داود بإسنادٍ صحیحٍ)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے ایسا علم حاصل کیا جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کی جاتی ہے، لیکن اس کو دنیا کا سامان حاصل کرنے کے لیے سیکھا؛ تو ایسا آدمی قیامت کے روز جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا۔

افادات:- دنیا کے علوم جو علومِ معاش ہیں، ان کو اگر اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لیے حاصل نہیں کیا، بلکہ دنیا حاصل کرنے اور دولت سمیٹنے کے لیے حاصل کیا جاتا ہے، تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ جیسے: کوئی آدمی ڈاکٹر یا انجینئر اس لیے بنتا ہے کہ میں پیسے حاصل کروں اور مالدار بن جاؤں تو ڈاکٹری اور انجینئرنگ کا علم اس مقصد کے لیے پڑھنا گناہ کا کام نہیں ہے۔ لیکن دین کا علم اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ہے اور علمِ دین کا حاصل کرنا عبادت ہے۔ اور میں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ جو اعمال اللہ تعالیٰ کے لیے کیے جانے چاہئیں ان کو کسی دوسرے مقصد (یعنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور قرب حاصل کرنے کے بجائے دنیا کا سامان حاصل کرنے اور مال و دولت سمیٹنے کے لیے اور لوگوں کی نگاہوں میں عزت پیدا کرنے کے لیے) حاصل کرے؛ تو جنت میں داخل ہونا تو دور کی بات رہی، جنت کی خوشبو بھی اس کو محسوس نہیں ہوگی۔ حالاں کہ دوسری روایتوں میں آتا ہے کہ جنت کی خوشبو پانچ سو سال کی مسافت سے محسوس کی جاتی ہے۔ اس سے ریاء و دکھلاوے کی شناعت و برائی معلوم ہوتی ہے۔

(اس کتاب کا پہلا باب اخلاص کے سلسلہ میں تھا وہاں اس پر تفصیل سے کلام کیا جا چکا ہے۔)

باب ما یتوهم أنه رياء وليس هو رياء

کسی عمل میں ریا کا شائبہ، حالاں کہ وہ ریا نہیں ہے

بعض مرتبہ ایسی صورت پیش آجاتی ہے کہ آدمی یوں سمجھتا ہے کہ وہ ریا ہے حالاں کہ وہ ریا نہیں ہوتا؛ اسی کو اس باب میں بتلاتے ہیں۔

مؤمن کو دی جانے والی نقد بشارت

۱۶۲۱:-وعن أَبي ذرٍ- رضی الله عنه- قَالَ: قِيلَ لِرسولِ الله ﷺ: أَرَأَيتَ الرَّجُلَ الَّذِي يَعْمَلُ العَمَلَ مِنَ الخَيْرِ، وَيَحْمَدُهُ النَّاسُ عَلَيْهِ؟ قَالَ: ((تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى المُؤْمِنِ.)) (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ سے پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول! ذرا یہ بتلایئے کہ ایک آدمی نیکی کا کوئی کام کرتا ہے اور لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں؟ (کیا یہ بھی ریا ہے؟) حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: (نہیں! بلکہ) یہ تو مؤمن کو دی جانے والی نقد بشارت ہے۔

افادات:- ایک آدمی نے نیکی کا کوئی کام خالص اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے، اس کی رضا جوئی اور اسی سے اجر و ثواب حاصل کرنے کے لیے کیا، اور اس عمل کو انجام دیتے ہوئے اس کے دل میں دور دور تک لوگوں سے اپنی عزت کروانے، لوگوں کے دلوں میں اپنے لیے مقام پیدا کرنے اور اپنی شہرت و نیک نامی حاصل کرنے کا شائبہ نہیں تھا، لیکن قدرت کا بھی اصول ہے کہ کوئی آدمی جب کوئی عمل محض اللہ تعالیٰ ہی کے

لیے کرتا ہے تو اس کے نتیجہ میں وہ اللہ تعالیٰ کا مقرب بن جاتا ہے، اللہ تعالیٰ خود اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرماتے ہیں کہ میں اپنے فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں تم بھی اس سے محبت کرو، تو حضرت جبرئیل علیہ السلام بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، اس کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام آسمانوں میں اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فلاں بندے سے محبت کرتے ہیں؛ اے فرشتو! تم سب بھی اس سے محبت کرو، چناں چہ آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے روئے زمین میں اس کے لیے مقبولیت رکھ دی جاتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام لوگوں کے دلوں میں اس کے واسطے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔

اہل اللہ کی محبوبیت کا راز یہی ہے۔ حالاں کہ جو لوگ ان سے محبت کرتے ہیں انہوں نے کبھی ان اللہ والوں کو عبادت کرتے ہوئے نہیں دیکھا، ان کے عبادت کے احوال سے بھی وہ لوگ واقف نہیں ہوتے۔ ایسا بھی نہیں ہوتا کہ ان اللہ والوں کو انہوں نے تہجد پڑھتے ہوئے دیکھ لیا تھا، ان کو صدقہ وخیرات کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا، ان کو اللہ کے راستہ میں مجاہدہ اور ریاضت کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ جو لوگ دور دراز رہتے ہیں جنہوں نے کبھی ان کا چہرہ بھی نہیں دیکھا ہوتا وہ بھی ان اللہ والوں سے محبت کرنے لگتے ہیں؛ دراصل یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی اسی محبوبیت کا نتیجہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں رکھ دی جاتی ہے۔

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اور لوگ ان کے اعمال اور خوبیوں کی تعریف کرتے ہیں تو اس کی وجہ سے ان کے دل میں عجب اور خود پسندی کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی، بلکہ اس کو سن کر وہ اللہ تعالیٰ کا

شکرادا کرتے ہیں اوراس بات سے ڈرتے رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں سے کہیں محروم نہ ہوجاؤں۔ ویسے تو جنت میں فرشتوں کی طرف سے ان کو اعمال کے قبول ہونے کی بشارتیں دی جائیں گی، لیکن دنیا کے اندر بھی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دلوں میں ان کی محبت ڈال کر بشارتیں سنواتے ہیں، گویا یہ فوری فائدہ ہوتا ہے جو ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطورِ انعام دیا جاتا ہے، اوران اعمال کا اصل اجروثواب اور اللہ تعالیٰ کی رضاوخوشنودی تو آخرت میں حاصل ہوگی۔

گویا اس کو ریاء سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن اس کی علامت یہ ہوتی ہے کہ جب وہ آدمی لوگوں کی زبانی اپنی تعریفیں سنتا ہے تو اس کے دل میں خود پسندی اور عجب کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی، اوروہ اپنے آپ کو بڑا نہیں سمجھتا، اوراس کو اپنا کارنامہ نہیں سمجھتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سمجھتا ہے کہ اسی نے طاقت عطا فرمائی تبھی یہ عمل وجود میں آیا، اوراللہ تعالیٰ کا شکرادا کرتا ہے کہ اے اللہ! تو نے مجھے عمل کی توفیق عطا فرمائی، اوراس بات سے ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں اجروثواب ضائع نہ ہوجائے۔